نام کتاب ———— شعلۂ مستور

مصنف ———— علامہ غلام احمد پرویزؒ

ناشر ———— طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)

۲۵- بی، گلبرگ ۲ لاہور (۵۷۱۲۴۰)

طابع ———— دوست ایسوسی ایٹس

مطبع ———— ایچ۔ وائی پرنٹرز، لاہور

ایڈیشن ———— پنجم (بلا ترمیم) ۱۹۹۴ء

ملنے کا پتہ

• طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) ۲۵/بی، گلبرگ ۲، لاہور

دوست ایسوسی ایٹس

بیسمنٹ الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مشمولات

مستور شعائر

طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صرف ہوتی ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

پیش لفظ

پرویزؒ صاحب کی زندگی کا مشن، خدا کی کتابِ عظیم کا سمجھنا اور دوسروں کو سمجھانا ہے۔ اس کے سمجھنے کا سلسلہ تو ان کے اوائل عمر ہی سے شروع ہو گیا تھا لیکن اس کے حقائق و معارف کو قوم کے سامنے پیش کرنے کے مربوط سلسلہ کا آغاز ۱۹۴۱ء سے ہوا تھا جب انہوں نے سلسلۂ معارف القرآن کی پہلی جلد شائع کی جس کا عنوان تھا ـــ **اللہ** ـــ اس سلسلہ کی دوسری اور تیسری کڑیاں ۱۹۴۵ء میں شائع ہوئیں۔ دوسری کڑی میں، انسان و آدم، ملائکہ، ابلیس، وحی وغیرہ موضوعات کے علاوہ، حضرت نوح، حضرت ہود و حضرت صالح (علیہم السلام) کے کوائفِ حیات شامل تھے اور تیسری جلد حضرت ابراہیمؑ سے لے کر حضرت عیسیٰؑ تک کے انبیاءؑ کے تذکارِ جلیلہ پر مشتمل تھی۔ ازاں بعد جب ان جلدوں کے نئے ایڈیشن شائع کرنے کا وقت آیا تو مناسب سمجھا گیا کہ ہر جلد کو اس کے موضوع کی نسبت سے الگ نام سے شائع کیا جائے۔ چنانچہ وہ تین جلدیں، ان پانچ مجلدات کی شکل میں شائع ہوئیں۔

(۱) **من و یزداں** ـــ جس میں اللہ تعالیٰ کے متعلق قرآنِ کریم میں عطا کردہ تفاصیل بڑی حسن و خوبی سے پیش کی گئی ہیں۔

(۲) **ابلیس و آدم** ـــ انسان، آدم، ملائکہ، شیطان، ابلیس، جن، روح، وحی، رسالت وغیرہ عنوانات سے متعلق حقیقت کشا مباحث۔

(۳) **جوئے نور** ـــ حضرت نوحؑ سے لے کر حضرت شعیبؑ تک کے انبیاءؑ کے کوائفِ حیات۔

(۴) **برقِ طور** ـــ حضرت موسیٰؑ اور دیگر انبیائے بنی اسرائیل کے تذکارِ زندگی اور بنی اسرائیل کے عروج و زوال کی عبرت آموز داستان۔

(۵) **شعلۂ مستور** ـــ حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ (علیہما السلام) کے سوانح حیات۔

ان میں سے شعلۂ مستور ۱۹۵۸ء میں شائع ہوئی تھی اور مدت سے نایاب تھی۔ اس دوران میں یورپ اور امریکہ میں حضرت عیسیٰؑ کے کوائف حیات سے متعلق ایسی تحقیقاتی تصانیف شائع ہوئیں جن میں بہت سے راز ہائے مستور سامنے لائے گئے۔ جب شعلۂ مستور کے جدید ایڈیشن کا تقاضا ہوا تو مصنف نے ضروری سمجھا کہ تحقیقات جدیدہ کی روشنی میں اس کے تاریخی مذکورات پر نظرثانی کی جائے۔ اس سے اس میں کافی حک و اضافہ کیا گیا۔ چنانچہ یہ تازہ ایڈیشن پہلے ایڈیشن کے مقابلہ میں کہیں زیادہ معلومات افزا ہے۔

پرویزؒ صاحب نے اس کتاب کے پہلے ایڈیشن کے تعارف میں، اس کے نام کے سلسلہ میں ایک وضاحت کی تھی۔ اسے ہم، اس کی اہمیت کے پیش نظر دہرا دینا چاہتے ہیں۔ انہوں نے لکھا تھا کہ جیسا کہ معلوم ہے) "حضرات انبیاء کرامؑ آسمانی انقلاب کے داعی ہوتے تھے۔ ان کی زندگی کا مشن یہ ہوتا تھا کہ طاغوتی قوتوں کو شکست دیکر ان کی جگہ ایک ایسا معاشرہ قائم کریں جو قوانین خداوندی پر متشکل ہو۔ حضرت عیسیٰؑ بھی اس سلسلۂ زریں کی ایک اہم کڑی تھے اور ان کا مقصد رسالت بھی آسمانی انقلاب تھا۔ لیکن اس انقلابی جدوجہد کی صرف ایک جھلک ہمارے سامنے آتی ہے جس کے بعد آپ ہجرت کر جاتے ہیں۔ ہجرت کے بعد کے واقعات قرآن نے بیان نہیں کئے۔ اس اعتبار سے کتاب کا عنوان "شعلۂ مستور" تجویز کیا گیا ہے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی امت نے بھی انقلابی دعوت کی بجائے خانقاہیت کی زندگی کو مقصودِ دین قرار دے لیا اور اس طرح یہ برقِ خاطف غاروں میں چھپ کر رہ گئی۔ یہی مستور شعلے نبی اکرمؐ کے عہد میں اس درخشندگی و تابندگی سے بے نقاب ہوئے کہ ان سے ساری فضائے عالم مرقعِ نور و نار بن گئی۔ نارِ باطل کے ہر خس و خاشاک کے لئے اور نور ہر نگۂ بصیرت طلب کے لئے۔ تفصیل اس اجمال کی آپ کو" معراجِ انسانیت" میں ملے گی۔

(٠)

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، آیات کے حوالہ میں، اوپر سورۃ کا نمبر ہوتا ہے اور نیچے آیت کا۔ (مثلاً ۲/۲۴ سے مراد ہے، سورہ بقرہ کی چوبیسویں آیت۔

(٠)

پرویزؒ صاحب کی تصانیف کی اشاعت کی سعادت طلوعِ اسلام ٹرسٹ کے حصہ میں آئی ہے جس پر ہم جس قدر بھی فخر کریں کم ہے، اگرچہ ہمیں افسوس ہے کہ نظامِ طباعت وغیرہ کی عام حالت کی وجہ سے ہم انہیں سابقہ معیار کے مطابق پیش نہیں کر سکتے۔ امید ہے قارئین کے حسنِ ذوق کے نزدیک ہماری یہ معذرت قابلِ پذیرائی ہوگی۔ والسلام

جنوری ۱۹۷۵ء

طلوعِ اسلام ٹرسٹ

وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوْتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ۝ (١٩/١٥)

قافلۂ بہار را طائرِ پیش رس نگر!

حضرت زکریّا و یحییٰ

عَلَیْھِمُ السَّلَامُ

وہ کاروانِ رشد و سعادت، جو صبحِ ازل خراماں خراماں سوئے منزل روانہ ہوا تھا، اب رفتہ رفتہ منزل کے قریب آتا جارہا ہے۔ اس کعبۂ مقصود سے ایک پڑاؤ اِدھر، مقامِ مسیح ناصری (علیہ السلام) ہے۔ اور جس مقدس سنگِ میل پر ہم اب پہنچے ہیں وہ اس مقام کا گویا نشانِ راہ ہے۔ یعنی حضرت زکریاؑ جن کی کفالت میں حضرت مریمؑ کو تفویض کیا گیا (۳/۳۶) اور حضرت یحییٰؑ (یوحنا) جنہوں نے قریہ قریہ میں (حضرت) مسیحؑ کی منادی کی۔ سورۃ آلِ عمران میں ہے۔

هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِىْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَآءِ ۝ (۳/۳۸)

اسی جگہ کا یہ معاملہ ہے (یعنی قربان گاہ کا) کہ زکریا نے اپنے پروردگار کے حضور دعا مانگی تھی، "خدایا! تو اپنے خاص فضل سے مجھے پاک نسل عطا فرما۔ بلاشبہ تو ہی ہے کہ دعائیں سننے والا اور التجائیں قبول کرنے والا ہے!"

اللہ نے اس دعا کو قبول فرمایا اور ایک فرزندِ صالح کی بشارت دی۔

فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّىْ فِى الْمِحْرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰهَ

يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ سَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ (۳/۳۹)

ملائکہ نے زکریا کو پکارا، اور وہ محراب میں کھڑا مصروفِ دعا تھا۔ "خدا انہیں یحییٰ کی (یعنی ایک لڑکے کی جو پیدا ہوگا اور اس کا نام یحییٰ رکھا جائے) بشارت دیتا ہے۔ وہ قوانینِ خداوندی کو سچ کر دکھانے والا، ایک بڑی جماعت کا لیڈر، صاحبِ نظم و ضبط اور بلند ترین صلاحیتوں کا مالک ہوگا۔

بیٹے کی خوشخبری

اس بشارت پر حضرت زکریاؑ متعجب ہوئے۔ جیسے اس سے پیشتر حضرت ابراہیمؑ کی بیوی، بیٹے کی خوشخبری پر حیران ہوئی تھیں۔

قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّ قَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَامْرَاَتِيْ عَاقِرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ۝ (۳/۴۰)

زکریا نے جب یہ سنا تو کہا، "خدایا! میرے یہاں لڑکا کیسے ہو سکتا ہے جبکہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے؟ (کیا میرے ہاں سچ مچ بیٹا پیدا ہوگا یا اسی طرح کوئی لڑکا مل جائے گا جس طرح مریم جیسی بیٹی مل گئی تھی)۔ جواب ملا کہ نہیں۔ جس طرح ہمارے قانونِ مشیت کے مطابق بیٹے پیدا ہوتے ہیں اسی طرح یہ پیدا ہوگا۔

آپ نے عرض کیا۔

قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْۤ اٰيَةً ؕ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ؕ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّ سَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ۝ (۳/۴۱)

اس پر زکریا نے عرض کیا، "خدایا! اس بارے میں میرے لئے کوئی خاص حکم ہو تو فرما دیجئے۔" ارشاد ہوا کہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ تم تین دن تک بات چیت نہ کرو مگر صرف اشارہ سے (یعنی روزہ رکھو جیسا کہ اس زمانے میں دستور تھا)۔ قانونِ خداوندی کو شدت کے ساتھ اپنے سامنے رکھو اور باقی جس طرح تمہارا معمول ہے اپنے فرائض کی تکمیل میں صبح و شام مصروف رہو۔

یہودیوں میں روزہ میں بات چیت بھی منع تھی۔ لوقا کی انجیل میں اس واقعہ کا تذکرہ ان الفاظ میں آیا ہے۔

یہودیہ کے بادشاہ ہیرودیس کے زمانہ میں ابیاہ کے فریق میں سے زکریاؑ نام کا ایک کاہن تھا اور اس کی بیوی ہارون کی اولاد میں سے تھی اور اس کا نام الیشبع تھا۔ اور وہ دونوں خدا کے حضور راستباز اور خداوند کے سارے حکموں اور قانون پر بے عیب چلنے والے تھے ۰ اور ان کے اولاد نہ تھی کیونکہ الیشبع بانجھ تھی اور دونوں عمر رسیدہ تھے ۰

جب وہ خدا کے حضور اپنے فریق کی باری پر کہانت کا کام انجام دیتا تھا تو ایسا ہوا کہ کہانت کے دستور کے مطابق اس کے نام کا قرعہ نکلا کہ خداوند کے مقدس میں جاکر خوشبو جلائے ۰ اور لوگوں کی ساری جماعت خوشبو جلاتے وقت باہر دعا مانگ رہی تھی ۰ کہ خداوند کا فرشتہ خوشبو کے مذبح کی دہنی طرف کھڑا ہوا اس کو دکھائی دیا۔ اور زکریاہ دیکھ کر گھبرایا اور اس پر دہشت چھاگئی ۰ مگر فرشتے نے اس سے کہا اے زکریاہ خوف نہ کر کیونکہ تیری دعا سن لی گئی اور تیری بیوی الیشبع تیرے لئے بیٹا جنے گی۔ تو اس کا نام یوحنا رکھنا۔ اور تجھے خوشی و خرمی ہوگی اور بہت سے لوگ اس کی پیدائش کے سبب سے خوش ہوں گے ۰ کیونکہ وہ خداوند کے حضور میں بزرگ ہوگا اور ہرگز نہ مے نہ کوئی اور شراب پیئے گا اور اپنی ماں کے پیٹ ہی سے روح القدس سے بھر جائے گا۔ اور بہت سے بنی اسرائیل کو خداوند کی طرف جو ان کا خدا ہے پھیرے گا۔ اور وہ ایلیاہ کی روح اور قوت میں اس کے آگے آگے چلے گا کہ والدوں کے دل اولاد کی طرف اور نافرمانوں کو راستبازوں کی دانائی پر چلنے کی طرف پھیرے اور خداوند کے لئے ایک مستعد قوم تیار کرے ۰ زکریاہ نے فرشتے سے کہا میں اس بات کو کس طرح جانوں کیونکہ میں بوڑھا ہوں اور میری بیوی عمر رسیدہ ہے۔ فرشتے نے جواب میں اس سے کہا میں جبرئیل ہوں جو خدا کے حضور کھڑا رہتا ہوں اور اس لئے بھیجا گیا ہوں کہ تجھ سے کلام کروں اور تجھے ان باتوں کی خوشخبری دوں۔ اور دیکھ جس دن تک یہ باتیں واقع نہ ہولیں تو چپکا رہے گا اور بول نہ سکے گا۔ اس لئے کہ تو نے میری باتوں کا جو اپنے وقت پر پوری ہوں گی یقین نہ کیا۔ اور لوگ زکریاہ کی راہ دیکھتے اور تعجب کرتے تھے کہ اسے مقدس میں کیوں دیر لگی۔ جب وہ باہر آیا تو ان سے بول نہ سکا۔ پس انہوں نے

معلوم کیا کہ اس نے مقدس میں رویا دیکھی ہے اور وہ اُن سے اشارے کرتا تھا اور گونگا ہی رہا۔ پھر ایسا ہوا کہ جب اس کی خدمت کے دن پورے ہوگئے تو وہ اپنے گھر گیا۔

(لوقا کی انجیل ۵ـــ ۱/۲۳)

(قرآنِ کریم نے یہ نہیں کہا کہ حضرت زکریاؑ کی قوتِ گویائی سلب ہوگئی تھی) اس کے بعد حضرت یحییٰؑ (یوحنا بپتسمہ دینے والے) کی ولادت کا ذکر ہے۔

اور وہ لڑکا بڑھتا اور روح میں قوت پاتا گیا اور اسرائیل پر ظاہر ہونے کے دن تک جنگلوں میں رہا۔ (لوقا ـــ ۱/۸۰)

سورۂ مریم میں ہے۔

إِذْ نَادٰى رَبَّهُ نِدَآءً خَفِيًّا ۝ قَالَ رَبِّ إِنِّيْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّيْ وَاشْتَعَلَ الرَّأْسُ شَيْبًا وَّلَمْ أَكُنْۢ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِيًّا ۝ وَإِنِّيْ خِفْتُ الْمَوَالِيَ مِنْ وَّرَآءِيْ وَكَانَتِ امْرَأَتِيْ عَاقِرًا فَهَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۝ يَّرِثُنِيْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ ۖ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا ۝ (۳ـــ ۱۹/۶)

جب ایسا ہوا تھا کہ زکریا نے اپنے نشوونما دینے والے کو انتہائی خاموشی سے پکارا (۳/۲۷)

اور کہا کہ اے میرے پروردگار! میں بڑھاپے کی وجہ سے کمزور ہوتا چلا جا رہا ہوں۔ میرے سر کے بال بالکل سفید ہوگئے ہیں۔ اے میرے نشوونما دینے والے! ایسا کبھی نہیں ہوا کہ میں نے تجھ سے کچھ مانگا ہو اور تُو نے نہ دیا ہو۔ (تیری اس رحمتِ بے پایاں سے مجھے امید ہے کہ میری بڑھاپے کی یہ دعا بھی شرفِ قبولیت سے نوازی جائے گی)۔

(میں بوڑھا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے۔ اس لئے بنظر بظاہر اب مجھے اولاد کا کوئی امکان دکھائی نہیں دیتا۔ اور اولاد نہ ہونے کا مجھے غم اس لئے ہے کہ) ہمارے جدِ امجد، حضرت یعقوب کی برکات اور خصوصیات، اس کے گھرانے میں، نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتی ہوئی، مجھ تک پہنچی ہیں۔ میرے بھائی بندوں میں کوئی اس قابل

نہیں جو ان کا اہل ہو سکے۔ اس لئے مجھے ڈر ہے کہ وہ میرے بعد انہیں ضائع کر دیں گے
اور یہ سلسلہ آگے نہیں چل سکے گا۔ اس لئے میری دعا یہ ہے کہ تو اپنی جناب سے مجھے
کوئی ایسا وارث عطا کر دے جو ان برکات و نعماء کا اہل بن سکے تاکہ میں انہیں اس کے سپرد
کر جاؤں۔ وہ ایسا ہونا چاہیئے جو اس منصبِ جلیلہ کے لئے ہر طرح سے موزوں اور تیری
نوازشات کا صحیح طور پر مستحق ہو۔

ہم اس سے پیشتر (برقِ طور میں) حضرت داؤد علیہ السلام کے تذکرہ میں دیکھ چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے
حضرت سلیمانؑ کو حضرت داؤد علیہ السلام کا وارث کہہ کر پکارا ہے۔ یہاں حضرت زکریا علیہ السلام نے
اپنے وارث کے لئے بحضور رب العزت دعا مانگی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام
رہبانیت کی زندگی بسر نہیں کیا کرتے تھے۔ ان کے اہل و عیال ہوتے تھے اور وہ اولاد کے لئے بھی آرزو
رکھتے تھے۔ انبیاء بنی اسرائیل کے سلسلہ میں یہ حقیقت بھی سامنے آ چکی ہے کہ ان میں (اللہ تعالیٰ کی
مشیت کے مطابق) بعض حالات میں باپ بھی نبی ہوتا تھا اور بیٹا بھی۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ نبوت، باپ
سے بیٹے کی طرف وراثتاً منتقل ہوتی تھی۔ نبوت یکسر وہبی طور پر ملتی ہے۔ اس میں نہ ذاتی کسب و ہنر کو
کوئی دخل ہوتا ہے، نہ حسب و نسب کا کوئی تعلق۔ بیٹے کو نبوت اس لئے ملتی تھی کہ وہ نبوت پانے کی خصوصیات
اپنے اندر رکھتا تھا اس لئے خدا اسے اس منصبِ جلیلہ کے لئے منتخب کر لیتا تھا۔

بہرحال حضرت زکریاؑ نے دعا مانگی جس کے جواب میں ارشاد ہوا۔

يٰزَكَرِيَّآ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ ۨ اسْمُهٗ يَحْيٰى ۙ لَمْ نَجْعَلْ
لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا ۝ (۱۹/۷)

(اس پر حکم ہوا) "اے زکریا! ہم تجھے ایک لڑکے کی (پیدائش کی) خوشخبری دیتے
ہیں۔ اس کا نام یحییٰ رکھا جاتے۔ یہ لڑکا ایسا ہو گا جس کی نظیر (تمہارے خاندان میں) نہیں
ملے گی۔

انجیل لوقا میں ہے۔

اور آٹھویں دن ایسا ہوا کہ وہ لڑکے کا ختنہ کرنے آئے اور اس کا نام اس کے باپ کے
نام پر زکریا رکھنے لگے۔ مگر اس کی ماں نے کہا نہیں بلکہ اس کا نام یوحنا رکھا جائے ۝

انھوں نے اس سے کہا کہ تیرے کنبے میں کسی کا یہ نام نہیں؟ اور انھوں نے اس کے باپ کو اشارہ کیا کہ تو اس کا نام کیا رکھنا چاہتا ہے؟ اس نے تختی منگا کے یہ لکھا کہ اس کا نام یوحنا ہے اور سب نے تعجب کیا۔ اسی دم اُس کا مُنہ اور زبان کھُل گئی اور وہ بولنے اور خدا کی حمد کرنے لگا۔[1]　　(لوقا کی انجیل (۵۹ — ۱/۶۴)

اس بشارت پر حضرت زکریاؑ نے عرض کیا۔

قَالَ رَبِّ أَنَّىٰ يَكُونُ لِي غُلَامٌ وَكَانَتِ امْرَأَتِي عَاقِرًا وَقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا ۝ (۱۹/۸)

زکریا نے (متعجب ہوکر) کہا کہ پروردگار! میرے یہاں لڑکا کیسے ہوسکتا ہے؟ میری بیوی بانجھ ہوچکی اور میرا بڑھاپا دُور تک پہنچ چکا۔

اس کے بعد آیات (۹ تا ۱۱) میں وہی کچھ کہا گیا ہے جو آیات (۴۰ — ۳/۴۱) میں پہلے آچکا ہے۔

حضرت یحییٰ

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اُنہیں وہ فرزند عطا فرمایا جسے بچپن میں ہی فہم و بصیرت عطا کر دی گئی اور جب بڑا ہوا تو اسے نبوّت (کتاب) عطا کر دی گئی۔ سورۂ مریم میں ہے يَا يَحْيَىٰ خُذِ الْكِتَابَ بِقُوَّةٍ (۱۹/۱۲) "اے یحییٰ! ضابطہ قوانینِ خداوندی کو قوت و اقتدار کے ساتھ محکم طور پر تھامو"۔ قرآنِ کریم نے یہاں ایک لفظ میں ساری حقیقت کو سمٹا کر رکھ دیا ہے۔ عیسائیوں کے عام تصور اور اناجیل کے بیان کے مطابق، حضرت یحییٰؑ JOHN THE BAPTIST ایک فقیرِ بادیہ نشین تھے جو لوگوں سے اخلاقی وعظ کہتے اور انہیں پانی میں بپتسمہ دیتے تھے اور نہایت مظلومیت کے عالم میں، ایک رقاصہ کی فرمائش پر، سرِ دربار ان کا سر قلم کر دیا گیا۔ لیکن قرآن کی رُو سے، خدا کے رسول، عظیم انقلابات کے پیغامبر ہوتے ہیں۔ ان کا مشن، دنیا میں "خدا کی حکومت" کا قیام ہوتا ہے اور اس راستے میں جو بھی حائل ہو اس کا مقابلہ کرنا۔ حضرت یحییٰؑ بھی خدا کے رسول تھے اور ان کا مشن بھی یہی تھا۔ اسی لئے ان

---

[1] انجیل متی میں ہے کہ حضرت یحییٰؑ کے متعلق حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا:

میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جو عورتوں سے پیدا ہوئے ہیں ان میں یوحنا بپتسمہ دینے والے سے کوئی بڑا نہیں ہوا۔　(۱۰/۱۱)

سے کہا گیا کہ "خدا کی کتاب کو قوت (اقتدار) کے ہاتھوں سے تھامو" قوت کے بغیر کتاب محض وعظ رہ جاتی ہے۔

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

حضرت یحییٰؑ کے مواعظ، رومیوں کی مستبد حکومت کے خلاف اعلاناتِ بغاوت تھے۔ چنانچہ (MARCELLO CRAVERI) کی تحقیق کے مطابق، وہ نظم و نسقِ حکومت کی خرابیوں کو ایک ایک کر کے گناتے اور لوگوں سے کہتے کہ اب یومِ مکافات قریب ہے۔ ظالموں کی حکومت کا شجرِ خبیثہ جڑ سے کٹ جائے گا۔ اگر بنی اسرائیل سب کے سب ختم بھی ہو جائیں گے تو بھی اس سے کچھ فرق نہیں پڑے گا۔ خدا کوئی اور قوم پیدا کر دے گا جس کے ہاتھوں باطل کا تختہ الٹ جائے گا۔ (THE LIFE OF JESUS)۔ یہ "وعظ" ایک فقیرِ بادیہ نشین کے نہیں ہو سکتے، ایک عظیم مصلح کے انقلاب آفریں اعلانات ہو سکتے ہیں۔ یہ تھے (قرآنِ کریم کی رو سے) حضرت یحییٰؑ جنہیں منصبِ نبوت سے سرفراز کیا گیا اور ان تمام خصوصیاتِ حسنہ سے نوازا گیا تھا جو باعثِ شرفِ انسانیت ہیں (۱۳ — ۱۹/۱۵)۔

سورۂ انبیاء میں اس واقعہ کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

وَ زَكَرِيَّآ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ رَبِّ لَا تَذَرْنِىْ فَرْدًا وَّ اَنْتَ خَيْرُ الْوٰرِثِيْنَ ۚۖ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۟ وَ وَهَبْنَا لَهٗ يَحْيٰى وَ اَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ ؕ (۸۹ — ۲۱/۹۰)

اور اسی طرح زکریا کا بھی معاملہ یاد کرو۔ جب اس نے اپنے رب کو پکارا اور کہا کہ اے میرے نشوونما دینے والے! تو مجھے اس دنیا میں بغیر وارث کے تنہا نہ چھوڑ، اگرچہ یہ حقیقت ہے کہ تو ہی ہم سب کا بہترین وارث ہے۔ (لیکن اس قسم کے وارث کی ضرورت بھی ظاہر ہے) (۳/۲۷) ؛ (۵ — ۱۹/۷)۔

ہم نے اس کی پکار سن لی اور اس کی بیوی میں اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت پیدا کر کے، اسے یحییٰ جیسا بیٹا عطا کر دیا۔

یہاں وَ اَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ کا ٹکڑا قابلِ غور ہے۔ حضرت زکریا نے عرض کیا تھا کہ میری بیوی

عقیم ہے اس لئے اس کے ہاں بچہ کیسے پیدا ہو سکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے آپ کی بیوی میں اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت پیدا کر دی (وَ اَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ) كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ (۳/۴۰) اللہ اپنی مشیت کو اس طرح پورا کر دیا کرتا ہے۔

حضرت زکریا اور یحییٰ (علیہم السلام) کا نام دیگر انبیائے کرامؑ کے زمرہ میں سورۃ انعام میں آیا ہے۔

وَ زَكَرِيَّا وَ يَحْيٰى وَ عِيْسٰى وَ اِلْيَاسَ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۙ (۶/۸۵)

اور زکریا، یحییٰ، عیسیٰ اور الیاس کو کہ یہ سب صالح انسانوں میں سے تھے۔

تورات میں زکریاہ نبی کا ایک صحیفہ بھی موجود ہے لیکن ان کا زمانہ بہت پہلے کا ہے۔ اس لئے حضرت یحییٰؑ کے والد (حضرت زکریاؑ) اُن سے الگ شخصیت ہیں۔

(۰)

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، قرآنِ کریم نے حضرت یحییٰؑ کی خصوصیتِ کبریٰ یہ بتائی ہے کہ "وہ ایک عظیم جماعت کے لیڈر، صاحبِ نظم و ضبط اور بلند ترین صلاحیتوں کے مالک تھے" (۳/۳۹)۔ آگے چل کر اس زمانے کی ایک وسیع و عریض تحریک کا تفصیلی تعارف آپ کے سامنے آئے گا جسے ایسینی کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ یہ انقلابیوں کی ایک بڑی مؤثر جماعت تھی جو سلطنتِ روما کے استبداد اور اخلاقی خرافات کے استیصال کے لئے رُو بہ عمل تھی۔ حضرت یحییٰؑ اس جماعت کے مرکز تھے اس لئے بڑی قوتوں کے مالک۔ تورات یا انجیل میں نہ ان کی ان خصوصیات کا ذکر ہے نہ ایسینی جماعت کی انقلابی سرگرمیوں کا کوئی تذکرہ۔ اس کے برعکس، ان کے قتل کی جو داستان انجیل متی میں درج ہے، وہ ایک افسانہ نظر آتی ہے۔ اس میں کہا گیا ہے۔

> اُس وقت چوتھائی ملک کے حاکم ہیرودؔس نے یسوع کی شہرت سنی اور اپنے خادموں سے کہا کہ یہ یوحنا بپتسمہ دینے والا ہے۔ وہ مُردوں میں سے جی اٹھا ہے اس لئے اس سے یہ معجزے ظاہر ہوتے ہیں کیونکہ ہیرودؔس نے اپنے بھائی فلپس کی بیوی ہیرودیاس کے سبب سے یوحنا کو پکڑ کر باندھا اور قید خانہ میں ڈال دیا تھا۔ اس لئے کہ

یوحنا نے اس سے کہا تھا کہ اس کا رکھنا تجھے روا نہیں۔ اور وہ ہر چند اسے قتل کرنا چاہتا تھا مگر عام لوگوں سے ڈرتا تھا کیونکہ وہ اسے نبی جانتے تھے۔ لیکن جب ہیرودیس کی سالگرہ ہوئی تو ہیرودیاس کی بیٹی نے محفل میں ناچ کر ہیرودیس کو خوش کیا۔ اس پر اس نے قسم کھا کر اس سے وعدہ کیا کہ جو کچھ تو مانگے گی' تجھے دوں گا۔ اس نے اپنی ماں کے سکھانے سے بولی کہ یوحنا بپتسمہ دینے والے کا سر تھال میں یہیں مجھے منگوا دے۔ بادشاہ غمگین ہوا مگر اپنی قسموں اور مہمانوں کے سبب سے اس نے حکم دیا کہ دے دیا جائے۔ اور آدمی بھیج کر قید خانے میں یوحنا کا سر کٹوا دیا۔ اور اس کا سر تھال میں لایا گیا اور لڑکی کو دیا گیا اور وہ اسے اپنی ماں کے پاس لے گئی۔ اور اس کے شاگردوں نے آکر اس کی لاش اٹھالی اور اسے دفن کردیا اور جاکر یسوع کو خبر کردی۔ (متی کی انجیل۔ باب ۱۴۔ آیات ۱۲-۱)

یہ قصہ پھر شاعروں اور ادیبوں کے ہتھے چڑھا اور "رقصِ سلومی" کے نام سے وجہ رنگینیٔ مجالس بنتا چلا گیا۔ لیکن قرآنِ کریم میں اس قسم کا کوئی واقعہ مذکور نہیں۔

حضرت یحییٰؑ کے بعد، آسمانی انقلاب کا یہ پروگرام حضرت عیسیٰؑ کی طرف منتقل ہو گیا جن کا تذکارِ جلیلہ آئندہ صفحات میں وجہ فروغِ دیدہ ہے۔

فَانْفُخُ فِیْهِ فَیَکُوْنُ طَیْرًا بِاِذْنِ اللّٰہِ (۳/۴۹)

دمِ مسیحا

(احیائے بنی اسرائیل کی آخری کوشش)

◎

اگر یک قطرہ خوں داری اگر مُشتِ پرے داری
بیا من با تو آموزم طریقِ شاہبازی را

حضرت عیسیٰ علیہ السلام

اُممِ سابقہ کے احوال وظروف پر، جن کا تذکرہ جوئے نور اور برقِ طور میں آچکا ہے، نگاہ ڈالیے۔ ایک حقیقت واضح طور پر سامنے آجائے گی کہ جب کسی قوم کی سرکشی و عدوان اپنے انتہائی نقطہ تک جا پہنچے تو ان کی آخری ہلاکت اور بربادی سے پیشتر اتمامِ حجت کیا جاتا ہے۔ لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّ يَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ ؕ (۸/۴۲) تاکہ جسے ہلاک ہونا ہے اتمام حجت کے بعد ہلاک ہو اور جسے زندہ رہنا ہے وہ بھی دلائل و براہین کے ساتھ زندہ رہے اور اس طرح دنیا پر یہ حقیقت آشکارا ہو جائے کہ قوموں کی موت و حیات یونہی اتفاقیہ نہیں بلکہ خاص قوانین کے مطابق واقع ہوا کرتی ہے۔ بنی اسرائیل کی خود فریبی اور خدا فراموشی کی داستان "برقِ طور" میں گزر چکی ہے۔ جس طرح اس شوریدہ بخت قوم نے خدا کی نعمتوں کو ٹھکرایا اور اس کے قوانین کی جگہ انسانی رسوم و ضوابط کو آئینِ زندگی بنا لیا، اس کی مثال (ان سے پیشتر) بہت کم دکھائی دے گی۔ ("ان سے پیشتر" اس لئے کہ ان کے بعد مسلمانوں نے تو اس باب میں کمال کر دکھایا ہے)۔ بخت نصر کا طوفانِ سلب و نہب ایک بہت بڑی تنذیر تھی جس کے بعد یہ کچھ سنبھلے۔ لیکن اس کا اثر زیادہ دیر تک نہ رہا۔ انہوں نے رفتہ رفتہ پھر وہی روش اختیار کر لی۔ اب ان کی آخری تباہی کا وقت آچکا تھا۔ (لیکن جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے) اس آخری تباہی سے پہلے اتمامِ حجت ضروری تھا۔ اس کے لئے خدا کا ایک عظیم المرتبت رسول، درخشندہ دلائل اور تابندہ براہین کے ساتھ ان کی طرف مبعوث ہوا جس کے نفسِ مسیحائی کو یہ قوت

آخری حجّت

عطا کی گئی تھی کہ وہ ان کے عروقِ مُردہ میں پھر سے خونِ زندگی دوڑا دیتا۔ اس اولوالعزم پیغمبر نے اپنی حقیقت کشا تعلیم اور مجاہدانہ سعی و عمل سے "خدا کی بادشاہت" کے فراموش کردہ تصوّر کو پھر سے اجاگر کیا۔ لیکن اس قوم نے جس کی شامتِ اعمال خدا کے اٹل عذاب کی شکل میں ان کے سر پر منڈلا رہی تھی، نہ صرف آپؑ کی زندگی بخش تعلیم ہی کی مخالفت کی بلکہ رومی حکام سے سازش کر کے، ان کی جان تک کے درپے ہو گئے۔ اس اتمامِ حجّت کے بعد، ان کی کوئی تدبیر خدا کے عذاب کو ان سے نہ ٹلا سکی۔ چنانچہ اس حادثۂ المیہ کے تھوڑے عرصہ بعد (جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے) یروشلم کی دوسری اور آخری تباہی ظہور میں آئی۔

اس جوشِ مخالفت میں یہودیوں نے قانونِ احترامِ انسانیت کی ہر شق کو توڑا اور خدا کے اس برگزیدہ رسول کی شانِ اقدس کے خلاف ایسے ایسے مکروہ اتہامات تراشے جن کے تصوّر سے روح کانپ اُٹھے۔ آپ کی پیدائش کو (معاذ اللہ، معاذ اللہ۔ نقلِ کفر کفر نباشد) ناجائز تعلقات کا نتیجہ بتایا۔ آپ کی حیاتِ طیّبہ کو عجیب و غریب افسانوں کا مجموعہ بنا کر پیش کیا اور آخر الامر آپ کی (بزعمِ خویش) وفات کو[1] (خاکم بدہن) ایک ملعون (مصلوب) کی موت کا نقاب اڑھا دیا۔ اس تفریط کا لازمی ردِّ عمل افراط تھا۔ چنانچہ آپ کے متبعین (عیسائیوں) نے تقابل کی ضد میں آپ کو ابن اللہ (خدا بیٹا) قرار دیا۔ اور آگے بڑھے تو آپ کو مقامِ الوہیت

افراط و تفریط کا گہوارہ

تک ہی پہنچا دیا اور واقعۂ تصلیب کو نوعِ انسانی کے تمام گناہوں کا کفارہ قرار دے کر شرک اور کفر کے ایک ایک گوشے کو (پناہ بخدا) آپ کی طرف منسوب کر دیا۔ نزولِ قرآن کے وقت خدا کا یہ مقرب بندہ اسی افراط و تفریط کے گہوارہ کی آماجگاہ بن رہا تھا۔ خدا کا پیغام ہونے کی جہت سے قرآن کا اوّلین فریضہ تھا کہ اس مقدّس رسول کے صحیح مقام سے دنیا کو آشنا کرلے اور مخالفت و معاندت کے گھناؤنے پردوں اور فرطِ عقیدت کے نگاہ فریب نقابوں کو الگ کر کے حقیقت کو اس کی اصلی شکل میں پیش کرے۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ قرآنِ کریم میں کسی اور رسول کی پیدائش، ذاتی کوائفِ حیات اور زندگی کے آخری مراحل

---

[1] یہودی سمجھتے تھے کہ انہوں نے حضرت عیسےٰؑ کو صلیب دے کر ختم کر دیا ہے۔ حالانکہ یہ واقعہ سرے سے غلط ہے۔ تفصیل آئندہ سامنے آئے گی۔

کے متعلق اس شرح و بسط سے تذکرہ نہیں آیا جیسا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق آیا ہے۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو حضرت عیسیٰؑ کی ذاتِ اقدس یہودیوں کے جوشِ انتقام اور عیسائیوں کے دفورِ عقیدت کی افسانوی چادروں میں اسی طرح لپٹی رہتی جس طرح ان کے لٹریچر میں آج تک لپٹے چلی آرہی ہے۔ چونکہ یہ ایک نہایت اہم بحث ہے، اس لئے ضروری ہے کہ پہلے یہ دیکھ لیا جائے کہ آپ کی حیاتِ طیبہ کو خود اناجیل میں کس طرح پیش کیا گیا ہے۔ اس کے بعد یہ حقیقت خود بخود اُبھر کر سامنے آجائے گی کہ قرآن نے اس باب میں جو کچھ کہا ہے وہ کس قدر بلند اور خدا کے ایک سچے رسول کے شایانِ شان ہے۔

اناجیل کی تفاصیل

اناجیلِ اربعہ (متی، مرقس، لوقا، یوحنا) عیسائیوں کے نزدیک مستند صُحُفِ مقدس ہیں۔ یہ اناجیل کس طرح وجود پذیر ہوئیں اور ہم تک کس طرح پہنچیں، یہ تفصیل طویل ہے۔ اس کے متعلق میری کتاب "مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں" دیکھئے جس میں تمام مزعومہ کتبِ سماوی کی مفصل تاریخ سامنے آگئی ہے۔ سردست صرف اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ اناجیل کو نہ حضرت عیسٰیؑ نے خود لکھا اور نہ لکھوایا، بلکہ آپ کے بعد آپ کے شاگردوں (حواریوں) نے از خود روایتاً مرتب کیا۔ یعنی یہ کتابیں حضرت عیسٰیؑ کی زندگی کی تاریخ ہیں۔ لیکن تاریخی اعتبار سے بھی یہ مجموعے اس قدر ناقابلِ اعتماد ہیں کہ خود عیسائی مؤرخین و محققین ان کے بیانات پر بھروسہ نہیں کرتے۔ حتّٰی کہ اس دعوے کو بھی محلِ نظر سمجھتے ہیں کہ یہ اناجیل جن حواریوں کی طرف منسوب ہیں، درحقیقت انہی کی تالیف ہیں۔ بایں ہمہ چونکہ حضرت عیسٰیؑ علیہ السلام کے کوائفِ حیات کے متعلق عیسائیوں کے ہاں سب سے معتبر یہی مآخذ ہیں اس لئے ہمیں لامحالہ انہی کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ اناجیلِ اربعہ کے علاوہ (جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے) آئندہ اوراق میں کہیں کہیں آپ کو ایک اور انجیل (برنباس) کا بھی حوالہ ملے گا۔ یہ انجیل ان متروک اناجیل میں سے ہے جنہیں عیسائیوں نے ایک عرصہ تک دنیا کے سامنے نہیں آنے دیا کیونکہ اس کا اکثر حصہ دیگر اناجیل سے مختلف اور عیسائیت کے مسلّمات کے خلاف ہے۔ اس کا اطالوی نسخہ وائنا کے کتب خانہ میں موجود ہے جو شروع بیسویں صدی میں بعض مستشرقین کی کوششوں سے دنیا کے سامنے آگیا اور مختلف زبانوں میں اس کے تراجم شائع ہوگئے۔ (برنباس حضرت مسیحؑ کے ایک حواری تھے)۔

اناجیل کی رُو سے حضرت عیسیٰؑ کے مختصر کوائفِ زندگی حسبِ ذیل ہیں۔ لوقا کی انجیل میں اس تذکرہ کی ابتدا یوحنا (بپتسمہ دینے والے) کی بشارت سے ہوتی ہے جس کے بعد مذکور ہے کہ حضرت زکریاؑ کی بیوی (الیشبع) کے حمل کے پانچویں مہینے حضرت مریمؑ کو ولادتِ حضرت مسیح کی بشارت ملی۔ جس کی تفصیل (متی کی انجیل میں) یوں مذکور ہے۔

پیدائش اب یسوع مسیح کی پیدائش اس طرح ہوئی کہ جب اس کی ماں مریم کی منگنی یوسف کے ساتھ ہو گئی تو ان کے اکٹھے ہونے سے پہلے وہ روح القدس کی قدرت سے حاملہ پائی گئی ۵ پس اس کے شوہر یوسف نے جو راست باز تھا اور اسے بدنام کرنا نہیں چاہتا تھا چپکے سے اس کے چھوڑ دینے کا ارادہ کیا ۵ وہ ان باتوں کو سوچ ہی رہا تھا کہ خداوند کے فرشتے نے اسے خواب میں دکھائی دے کر کہا ۵ اے یوسف ابنِ داؤد! اپنی بیوی مریم کو اپنے ہاں لے آنے سے نہ ڈر کیونکہ جو اس کے پیٹ میں ہے وہ روح القدس کی قدرت سے ہے ۵ وہ بیٹا جنے گی اور تو اس کا نام یسوع رکھنا، کیونکہ وہی اپنے لوگوں کو ان کے گناہوں سے نجات دے گا ۵ اور یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ جو خداوند نے نبی کی معرفت کہا تھا وہ پورا ہو کہ ۵

"دیکھو ایک کنواری حاملہ ہوگی اور بیٹا جنے گی اور اس کا نام عمانوایل رکھیں گے۔"

(متی ۲۳ ـــ ۱/۱۸)

لوقا کے بیان کے مطابق آپ کی پیدائش بیتِ لحم کے شہر میں ہوئی تھی۔

ان دنوں میں ایسا ہوا کہ قیصر اوگوستُس کی طرف سے یہ حکم جاری ہوا کہ ساری دنیا کے لوگوں کے نام لکھے جائیں ۵ یہ پہلی اسم نویسی سوریہ کے حاکم کورنیُس کے عہد میں ہوئی ۵ اور سب لوگ نام لکھوانے کے لئے اپنے اپنے شہر کو گئے ۵ پس یوسف بھی گلیل کے شہر ناصرۃ سے داؤد کے شہر بیت لحم کو گیا جو یہودیہ میں ہے، اس لئے کہ وہ داؤد کے گھرانے اور اولاد سے تھا ۵ تاکہ اپنی منگیتر مریم کے ساتھ جو حاملہ تھی نام لکھوائے ۵ جب وہ وہاں تھے تو ایسا ہوا کہ اُس کے جننے کا وقت آ پہنچا ۵ اور وہ پہلوٹا بیٹا جنی اور اس کو کپڑے میں لپیٹ کر چرنی میں رکھا کیونکہ ان کے واسطے سرائے میں جگہ نہ تھی ۵ (لوقا، ـــ ۲/۱)

اسی انجیل میں ذرا آگے چل کر مذکور ہے۔

جب آٹھ دن پورے ہوئے اور اس کے ختنہ کا وقت آیا تو اس کا نام یسوع رکھا گیا جو فرشتے نے اس کے پیٹ میں پڑنے سے پہلے رکھا تھا۔ (۲/۲۱)

انجیل متی میں اس کے بعد لکھا ہے کہ جب حضرت مسیحؑ پیدا ہوئے تو پورب کے کچھ مجوسی یہ کہتے ہوئے یروشلم کی طرف آئے کہ "یہودیوں کا جو بادشاہ پیدا ہوا ہے وہ کہاں ہے۔" یہ سُنکر ہیرودیس بادشاہ اور اس کے ساتھی گھبرا گئے۔ ہیرودیس نے مجوسیوں سے کہا کہ جب تم اس مولود کو دریافت کرلو مجھے اطلاع دینا۔ لیکن وہ ہیرودیس کے پاس واپس نہ لوٹے کیونکہ اس بچّے کے متعلق اُس کی نیت میں انہیں شبہ ہو گیا تھا۔[۱]

اس کے بعد انجیل میں لکھا ہے:۔

مصر کی طرف روانگی

جب وہ روانہ ہو گئے تو دیکھو خداوند کے فرشتے نے یوسف کو خواب میں دکھائی دے کر کہا کہ اُٹھ! بچّے اور اس کی ماں کو ساتھ لے کر مصر کو بھاگ جا اور جب تک میں تجھ سے نہ کہوں وہیں رہنا کیونکہ ہیرودیس اس بچّے کو تلاش کرنے کو ہے تاکہ اسے ہلاک کرے۔ پس وہ اٹھا اور رات کے وقت بچّے اور اس کی ماں کو ساتھ لے کر مصر کو روانہ ہو گیا اور ہیرودیس کے مرنے تک وہیں رہا تاکہ جو خداوند نے نبی کی معرفت کہا تھا وہ پورا ہو کہ مصر میں سے میں نے اپنے بیٹے کو بلایا۔

(متی ۱۳ — ۲/۱۵)

چنانچہ یوسف اپنی بیوی اور بچّے کو لے کر مصر چلا گیا اور اس وقت واپس لوٹا جب بچّے کی عمر سات برس کی ہو چکی تھی۔ لیکن انجیل برنباس میں ہے کہ

جب یسوع عمر کے بارہویں سال تک پہنچا وہ مریم اور یوسف کے ہمراہ یروشلم میں آیا تھا کہ وہاں خدا کی سونے کی کتاب میں لکھی ہوئی شریعت کے موافق سجدہ کرے۔ (فصل ۹)

---

[۱] انجیل متی میں یہ بھی مذکور ہے کہ ہیرودیس نے بیت لحم اور اس کی سرحدوں کے تمام بچّوں کو جن کی عمر دو برس یا اس سے کم تھی قتل کرا دیا تھا۔

واپسی مصر سے واپسی پر یہ کنبہ، گلیل کے علاقہ میں ناصرہ کی بستی میں جابسا (متی ۲/۲۳)۔ لوقا کی انجیل میں ہے کہ:

اس کے ماں باپ ہر برس عیدِ فسح پر یروشلم کو جایا کرتے تھے۰ اور جب وہ بارہ برس کا ہوا تو وہ عید کے دستور کے موافق یروشلم کو گئے۔ جب وہ ان دنوں کو پورا کر کے لوٹے تو وہ لڑکا یسوعؑ یروشلم میں رہ گیا اور اس کے ماں باپ کو خبر نہ ہوئی ۰ مگر یہ سمجھ کر کہ وہ قافلہ میں ہے ایک منزل نکل گئے اور اُسے اپنے رشتہ داروں اور جان پہچانوں میں ڈھونڈنے لگے ۰ جب نہ ملا تو اسے ڈھونڈتے ہوتے یروشلم تک واپس گئے ۰ اور تین روز پیچھے ایسا ہوا کہ انہوں نے اسے ہیکل میں استادوں کے بیچ میں بیٹھے ان کی سُنتے اور اُن سے سوال کرتے ہوئے پایا ۰ اور جتنے اس کی سُن رہے تھے اُس کی سمجھ اور اس کے جوابوں سے دنگ تھے ۰ وہ اُسے دیکھ کر حیران ہوئے اور اس کی ماں نے اُس سے کہا بیٹا! تو نے کیوں ہم سے ایسا کیا ؟ دیکھ تیرا باپ اور میں کڑھتے ہوئے تجھے ڈھونڈتے تھے۔

(لوقا ۴۱ — ۲/۴۸)

تعلیم انجیل برناباس سے بھی اس واقعہ کی تائید ہوتی ہے۔ اس کے بعد لوقا کی انجیل میں مذکور ہے کہ آپ نے یوحنا سے بپتسمہ لیا اور تیس برس کی عمر میں آپ خود تعلیم دینے لگے (۳/۲۳)۔ یہ سلسلہ دو تین برس تک جاری رہا لیکن اس مختصر سے عرصہ میں یہودی آپ کے سخت مخالف ہو گئے۔ اس لئے کہ آپ کی تعلیم ان کی اسلاف پرستی کی اندھی تقلید کے خلاف جاتی تھی۔

پس اُنہوں نے معلوم کیا کہ بے شک یسوع نے بزرگوں کی رسم و رواج کا خاکہ اڑایا ہے۔ تو ان کے دل میں سخت عداوت کی آگ بھڑک اٹھی۔　(برنباس فصل ۳۴)

سازش چنانچہ یہودیوں نے آپ کے خلاف سازش کی اور رومی حکام کو آمادہ کر لیا کہ آپ کے خلاف مقدمہ چلایا جائے۔ آپ کے بارہ شاگردوں (حواریوں) میں سے ایک (یہوداہ اسکریوتی) نے مخبری کی اور آپ کو گرفتار کرا دیا۔ بہتر ہو کہ تفصیل خود انجیل کی زبان سے سنئے:

اُس وقت یسوع ان کے ساتھ گتسمنی نام ایک جگہ میں آیا اور اپنے شاگردوں سے کہا کہ

یہیں بیٹھے رہنا جب تک کہ میں وہاں جا کر دعا مانگوں ٥ اور پطرس اور زبدی کے
دونوں بیٹوں کو ساتھ لے کر غمگین و بے قرار ہونے لگا ٥ اُس وقت اُس نے اُن
سے کہا میری جان نہایت غمگین ہے یہاں تک کہ مرنے کی نوبت پہنچ گئی ہے۔
تم یہاں ٹھیرو اور میرے ساتھ جاگتے رہو ٥ پھر تھوڑا آگے بڑھا اور مُنہ کے بل گر کر
یہ دعا مانگی کہ اے میرے باپ! اگر ہو سکے تو یہ پیالہ مجھ سے ٹل جائے۔ تاہم جیسا
میں چاہتا ہوں ویسا نہیں بلکہ جیسا تو چاہتا ہے ویسا ہی ہو ٥ پھر شاگردوں کے
پاس آکر اُنہیں سوتے پایا اور پطرس سے کہا کیا تم میرے ساتھ ایک گھڑی
بھی نہ جاگ سکے ٥ جاگو اور دعا مانگو تاکہ آزمائش میں نہ پڑو۔ روح تو مستعد ہے
مگر جسم کمزور ہے ٥ پھر دوبارہ جا کر اُس نے یہ دعا مانگی کہ اے میرے باپ! اگر یہ
میرے بغیر پیئے نہیں ٹل سکتا تو تیری مرضی پوری ہو ٥ اور آکر انہیں پھر سوتے پایا۔
کیونکہ ان کی آنکھیں نیند سے بھری ہوئی تھیں ٥ اور انہیں چھوڑ کر پھر چلا گیا اور وہی
بات پھر کہہ کر تیسری بار دعا مانگی ٥ تب شاگردوں کے پاس آکر اُن سے کہا: "اب
سوتے رہو اور آرام کرو۔ دیکھو وقت آپہنچا ہے اور ابنِ آدم گنہگاروں کے
حوالے کیا جاتا ہے ٥ اُٹھو چلیں۔ دیکھو میرا پکڑوانے والا نزدیک آپہنچا ہے ٥

وہ یہ کہہ ہی رہا تھا کہ یہوداہ جو ان بارہ میں سے ایک تھا' آیا اور اس کے ساتھ ایک
بڑی بھیڑ تلواریں اور لاٹھیاں لئے ہوئے سردار کاہنوں اور قوم کے بزرگوں
کی طرف سے آپہنچی ٥ اور اس کے پکڑوانے والے نے یہ پتا دیا تھا کہ جس کا میں بوسہ
لوں وہی ہے اسے پکڑ لینا ٥ اور فوراً اس نے یسوع کے پاس آکر کہا اے ربی! اسلام!
اور اس کے بوسے لئے ٥ یسوع نے اس سے کہا میاں! جس کام کو آیا ہے وہ کر لے۔
اس پر انہوں نے پاس آکر یسوع پر ہاتھ ڈالا اور اسے پکڑ لیا ٥ اور دیکھو یسوع کے ساتھیوں میں
سے ایک نے ہاتھ بڑھا کر اپنی تلوار کھینچی اور سردار کاہن کے نوکر پر چلا کر اس کا
کان اڑا دیا ٥ یسوع نے اس سے کہا اپنی تلوار کو میان میں کر لے کیونکہ جو تلوار کھینچتے
ہیں وہ سب تلوار سے ہلاک کئے جائیں گے ٥ آیا تو نہیں سمجھتا کہ میں اپنے باپ سے

منت کر سکتا ہوں اور وہ فرشتوں کے بارہ تمن سے زیادہ میرے پاس ابھی موجود کر دے گا ٥ میرے وہ نوشتے کہ یونہی ہونا ضرور ہے کیونکر پورے ہوں گے؟ اُسی گھڑی یسوع نے بھیڑ سے کہا کیا تم تلواریں اور لاٹھیاں لے کر مجھے ڈاکو کی طرح پکڑنے نکلے ہو؟ میں ہر روز ہیکل میں بیٹھ کر تعلیم دیتا تھا اور تم نے مجھے نہیں پکڑا ٥ مگر یہ سب کچھ اس لئے ہوا ہے کہ نبیوں کے نوشتے پورے ہوں۔ اس پر سارے شاگرد اسے چھوڑ کر بھاگ گئے ٥

(متی ۳۶ ـــ ۲۶/۵۶)

تصلیب اس کے بعد مقدمہ کی تفاصیل اور فیصلہ کا ذکر ہے اور پھر آپ کے صلیب دیئے جانے کا واقعہ۔

اُس وقت اس کے ساتھ دو ڈاکو صلیب پر چڑھائے گئے۔ ایک دہنے اور ایک بائیں ٥ اور راہ چلنے والے سر ہلا ہلا کر اس کو لعن طعن کرتے اور کہتے تھے ٥ اے مقدس کے ڈھانے والے اور تین دن میں بنانے والے اپنے تئیں بچا۔ اگر تو خدا کا بیٹا ہے تو صلیب پر سے اُتر آ ٥ اسی طرح سردار کاہن بھی فقیہوں اور بزرگوں کے ساتھ مل کے ٹھٹھے سے کہتے تھے ٥ اس نے اوروں کو بچایا۔ اپنے تئیں نہیں بچا سکتا۔ یہ تو اسرائیل کا بادشاہ ہے۔ اب صلیب پر سے اُتر آئے تو ہم اس پر ایمان لے آئیں ٥ اس نے خدا پر بھروسا رکھا ہے۔ اگر وہ اسے چاہتا ہے تو اب اس کو چھڑا لے کیونکہ اس نے کہا تھا میں خدا کا بیٹا ہوں ٥ اسی طرح ڈاکو بھی جو اس کے ساتھ صلیب پر چڑھائے گئے تھے، اس پر لعن طعن کرتے تھے ٥

اور دوپہر سے لے کر تیسرے پہر تک تمام ملک میں اندھیرا چھایا رہا ٥ اور تیسرے پہر کے قریب یسوعؑ نے بڑی آواز سے چلا کر کہا۔ ایلی، ایلی، لما شبقتنی یعنی اے میرے خدا! اے میرے خدا! تُو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا؟ ٥ جو وہاں کھڑے تھے ان میں سے بعض نے سُن کر کہا یہ ایلیاہ کو پکارتا ہے ٥ اور فوراً ان میں سے ایک شخص دوڑا اور اسفنج لے کر سرکہ میں ڈبو دیا اور سرکنڈے پر رکھ کر اسے چسایا ٥ مگر باقیوں نے کہا ٹھہر جاؤ۔ دیکھیں تو ایلیاہ اسے بچانے آتا ہے یا نہیں ٥ یسوع پھر بڑی آواز سے چلا اور جان دے دی؟ اور مقدس کا پردہ اوپر سے نیچے تک پھٹ کر دو ٹکڑے ہو گیا اور زمین

لرزی اور چٹانیں تڑک گئیں۔ (متی ۲۸ – ۵۱/۲۷)

تدفین اس کے بعد لکھا ہے کہ شام کے وقت پیلاطس (گورنر یروشلم) کی اجازت سے یوسف نامی ایک دولت مند آدمی نے آپ کی لاش کو دفن کر دیا اور ایک بڑا سا پتھر قبر کے سرہانے رکھ دیا۔ پھر مذکور ہے۔

اور سبت کے بعد ہفتے کے پہلے دن پو پھٹتے وقت مریم مگدلینی اور دوسری مریم قبر دیکھنے آئیں ٥ اور دیکھو ایک بڑا بھونچال آیا کیونکہ خداوند کا فرشتہ آسمان سے اُترا اور پاس آکر پتھر کو لڑھکا دیا اور اس پر بیٹھ گیا ٥ اس کی صورت بجلی کی مانند تھی اور اس کی پوشاک برف کی مانند سفید تھی ٥ اور اس کے ڈر کے مارے نگہبان کانپ اٹھے اور مُردہ سے ہو گئے ٥ فرشتے نے عورتوں سے کہا تم نہ ڈرو کیونکہ میں جانتا ہوں کہ تم یسوع کو ڈھونڈتی ہو جو مصلوب ہوا تھا ٥ وہ یہاں نہیں ہے کیونکہ اپنے کہنے کے موافق جی اُٹھا ہے۔ آؤ یہ جگہ دیکھو جہاں خداوند پڑا تھا ٥ اور جلد جا کر اس کے شاگردوں سے کہو کہ وہ مُردوں میں سے جی اٹھا ہے۔ اور دیکھو وہ تم سے پہلے گلیل کو جاتا ہے وہاں تم اسے دیکھو گے۔ دیکھو میں نے تم سے کہہ دیا ٥ اور وہ خوف اور بڑی خوشی کے ساتھ قبر سے جلد روانہ ہو کر اس کے شاگردوں کو خبر دینے دوڑیں ٥ اور دیکھو یسوع انہیں ملا اور اس نے کہا سلام! انہوں نے پاس آکر اس کے قدم پکڑے اور اسے سجدہ کیا ٥ اس پر یسوع نے اُن سے کہا ڈرو نہیں جاؤ میرے بھائیوں کو خبر دو تاکہ گلیل کو چلے جائیں۔ وہاں مجھے دیکھیں گے ٥ (متی ۱ – ۱۰/۲۸)

ازاں بعد۔

اور گیارہ شاگرد گلیل کے اُس پہاڑ پر گئے جو یسوع نے ان کے لئے مقرر کیا تھا ٥ اور انہوں نے اسے دیکھ کر سجدہ کیا مگر بعض نے شک کیا ٥ یسوع نے پاس آکر اُن سے باتیں کیں اور کہا کہ آسمان اور زمین کا کل اختیار مجھے دیا گیا ہے ٥ پس تم جا کر سب قوموں کو شاگرد بناؤ اور انہیں باپ اور بیٹے اور روح القدس کے نام پر بپتسمہ دو ٥ اور انہیں یہ تعلیم دو کہ اُن سب باتوں پر عمل کریں جن کا میں نے تم کو حکم دیا اور دیکھو میں دنیا کے آخر تک ہمیشہ

تمہارے ساتھ ہوں۔ (متی ۱۶ا۔ ۲۰/۲۸)

آسمان پر اٹھایا جانا

متی کی انجیل میں صرف اتنا ہی ہے۔ لیکن مرقس کی انجیل میں ہے غرض خداوند یسوع ان سے کلام کرنے کے بعد آسمان پر اٹھایا گیا اور خدا کی دہنی طرف بیٹھ گیا۔ پھر انہوں نے نکل کر ہر جگہ منادی کی اور خداوند ان کے ساتھ کام کرتا رہا اور کلام کو ان معجزوں کے وسیلے سے جو ساتھ ساتھ ہوتے تھے ثابت کرتا رہا۔ آمین (مرقس ۱۹ا۔ ۲۰/۱۶)

اسی طرح لوقا کی انجیل میں ہے۔

پھر وہ انہیں بیت عنیاہ کے سامنے تک باہر لے گیا اور اپنے ہاتھ اٹھا کر انہیں برکت دی ۵ جب وہ انہیں برکت دے رہا تھا تو ایسا ہوا کہ اُن سے جدا ہو گیا اور آسمان پر اٹھایا گیا ۵ اور وہ اس کو سجدہ کرکے بڑی خوشی سے یروشلم کو لوٹ گئے ۵ اور ہر وقت ہیکل میں حاضر ہو کر خدا کی حمد کیا کرتے تھے۔ (لوقا ۵۰ — ۲۴/۵۳)

انجیل برناباس کا بیان

یہ تو ہے اناجیلِ اربعہ کی بیان کردہ داستان۔ لیکن انجیل برناباس میں ان آخری مراحل کے متعلق ایک اور بیان ہے جو ان سے مختلف ہے۔ اس میں مذکور ہے۔

اور جبکہ سپاہی یہوداہ کے ساتھ اس جگہ کے نزدیک پہنچے جس میں یسوع تھا، یسوع نے ایک بھاری جماعت کا نزدیک آنا سُنا۔ تب اسی لیے وہ ڈر کر گھر میں چلا گیا اور گیارہ (شاگرد) سو رہے تھے۔ پس جبکہ اللہ نے اپنے بندہ کو خطرہ میں دیکھا۔ اپنے سفیروں جبرئیل اور میخائیل اور رفائیل اور اوریل کو حکم دیا کہ یسوع کو اس دنیا سے لے لیویں۔ تب پاک فرشتے آئے اور یسوع کو دکھن کی طرف دکھائی دینے والی کھڑکی سے لے لیا۔ پس وہ اس کو اٹھا لے گئے اور اسے تیسرے آسمان میں ان فرشتوں کی صحبت میں رکھ دیا جو کہ ابد تک اللہ کی تسبیح کرتے رہیں گے۔ (فصل ۲۱۵)

اور یہوداہ زور کے ساتھ اس کمرہ میں داخل ہوا جس میں سے یسوع اٹھا لیا گیا تھا۔

اور شاگرد سب کے سب سو رہے تھے۔ تب اللہ نے ایک عجیب کام کیا۔ پس یہوداہؔ بولی اور چہرے میں بدل کر یسوع کے مشابہ ہوگیا۔ یہاں تک کہ ہم لوگوں نے اعتقاد کیا کہ وہی یسوع ہے۔ لیکن اس نے ہم کو جگانے کے بعد تلاش کرنا شروع کیا تاکہ دیکھے معلم کہاں ہے؟ اس لئے ہم نے تعجب کیا اور جواب میں کہا اے سید! تو ہی تو ہمارا معلم ہے کیا تو اب ہم کو بھول گیا؟

مگر اُس نے مسکراتے ہوئے کہا "کیا تم احمق ہو کہ یہوداہ اسکریوتی کو نہیں پہچانتے اور اسی اثناء میں کہ وہ یہ بات کہہ رہا تھا سپاہی داخل ہوئے اور انہوں نے اپنے ہاتھ یہوداہ پر ڈال دیئے اس لئے کہ وہ ہر ایک وجہ سے یسوع کے مشابہ تھا۔

لیکن ہم لوگوں نے جب یہوداہ کی بات سنی اور سپاہیوں کا گروہ دیکھا تب ہم دیوانوں کی طرح بھاگ نکلے اور یوحنا جو کہ ایک کتان کے لحاف میں لپٹا ہوا تھا جاگ اٹھا اور بھاگا۔ اور جب ایک سپاہی نے اسے کتان کے لحاف کے ساتھ پکڑ لیا تو وہ کتان کا لحاف چھوڑ کر بھاگ نکلا۔ اس لئے کہ اللہ نے یسوع کی دعا سن لی اور گیارہ (شاگردوں) کو آفت سے بچا دیا۔ (فصل ۲۱۶)

پس سپاہیوں نے یہوداہ کو پکڑا اور اس کو اس سے مذاق کرتے ہوئے باندھ لیا۔ اس لئے کہ یہوداہ نے ان سے اپنے یسوع ہونے کا انکار کیا بحالیکہ وہ سچا تھا۔ تب سپاہیوں نے اسے چھیڑ کر تے ہوئے کہا "اے ہمارے سید! تو ڈر نہیں۔ اس لئے کہ ہم تجھ کو اسرائیل پر بادشاہ بنانے آئے ہیں اور ہم نے تجھ کو محض اس واسطے باندھا ہے کہ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ تو بادشاہت کو نامنظور کرتا ہے۔" یہوداہ نے جواب میں کہا "شاید کہ تم دیوانے ہوگئے ہو۔ تم تو ہتھیاروں اور چراغوں کو لے کر یسوع ناصری کو پکڑنے آئے ہو گویا کہ وہ چور ہے تو کیا تم مجھی کو باندھ لوگے جس نے تمہیں راہ دکھائی ہے تاکہ مجھے بادشاہ بناؤ۔"

اس وقت سپاہیوں کا صبر جاتا رہا اور انہوں نے یہوداہ کو مکوں اور لاتوں سے مار کر ذلیل کرنا شروع کیا اور غصے کے ساتھ اسے یروشلم کی طرف کھینچتے لے چلے۔

یوحنا اور پطرس نے سپاہیوں کا دُور سے پیچھا کیا اور ان دونوں نے اس لکھنے والے کو یقین دلایا کہ انہوں نے وہ سب مشورہ خود سنا جو کہ یہوداہ کے بارے میں کاہنوں کے سردار اور ان فریسیوں کی مجلس نے کیا کہ یہ لوگ یسوع کو قتل کرنے کے لئے جمع ہوئے تھے۔ تب وہیں یہوداہ نے بہت سی دیوانگی کی باتیں کیں۔ یہاں تک کہ ہر ایک آدمی نے تمسخر میں انوکھا پن پیدا کیا۔ یہ خیال کرتے ہوئے کہ وہ (یہوداہ) درحقیقت یسوع ہی ہے اور یہ کہ وہ موت کے ڈر سے بناوٹی جنون کا اظہار کر رہا ہے۔ اسی لئے کاہنوں نے اس کی دونوں آنکھوں پر ایک پٹی باندھ دی اور اس سے ٹھٹھا کرتے ہوئے کہا "اے یسوع ناصریوں کے نبی! (اس لئے کہ وہ یسوع پر ایمان لانے والوں کو یہی کہہ کر پکارا کرتے تھے) تو ہمیں بتا کہ تجھ کو کس نے مارا ؟" اور اس کے گال پر تھپڑ مارے اور اس کے منہ پر تھوکا۔

(انجیل برناباس فصل ۲۱۷)

اس کے بعد مذکور ہے۔

اور ہر ایک آدمی اپنے گھر کو پلٹ آیا۔ اور یہ جو لکھتا ہے اور یوحنا اور یعقوب اس (یوحنا) کا بھائی یسوع کی ماں کے ساتھ ناصرہ کو گئے۔ رہے وہ شاگرد جو اللہ سے نہیں ڈرے تو وہ رات کے وقت گئے اور یہوداہ کی لاش چُرا کر اسے چھپا دیا اور خبر اڑا دی کہ یسوع جی اٹھا ہے۔ تب اس فعل کے سبب سے ایک بے چینی پیدا ہوئی۔ پس کاہنوں کے سردار نے حکم دیا کہ کوئی آدمی یسوع ناصری کی نسبت کلام نہ کرے ورنہ وہ محروم کرنے کی سزا کے تحت میں آئے گا۔ اس لئے بڑی سختی ظاہر ہوئی۔ پس بہت سے آدمی سنگسار کئے گئے اور تازیانوں سے مارے گئے اور ملک سے جلا وطن کر دیئے گئے کیونکہ انہوں نے اس بارہ میں خاموشی کو لازم نہیں پکڑا۔

اور ناصرہ میں یہ خبر پہنچی کہ کیونکر یسوع ان کے شہر کا ایک باشندہ جی اٹھا ہے، اس کے بعد کہ وہ صلیب پر مر گیا تھا۔ تب اس نے جو کہ لکھتا ہے یسوع کی ماں سے منت کی کہ وہ براہِ کرم رونے سے باز آئے کیونکہ اس کا بیٹا جی اٹھا ہے۔ پس جب کنواری مریم نے اس بات کو سنا وہ رو کر کہنے لگی "تو اب ہمیں یروشلم چلنا چاہیئے

تاکہ میں اپنے بیٹے کو ڈھونڈوں۔ اس لئے کہ اگر میں اس کو دیکھ لوں گی تو آنکھیں ٹھنڈی کر کے مروں گی۔" (فصل ۲۱۸)

تب کنواری مع اس لکھنے والے اور یوحنا اور یعقوب کے اسی دن یروشلم میں آئی جس روز کہ کاہنوں کے سردار کا حکم صادر ہوا تھا۔ پھر کنواری نے جو اللہ سے ڈرتی تھی اپنے ساتھ رہنے والوں کو ہدایت کی کہ وہ اس کے بیٹے کو بھلا دیں، باوجود اس کے کہ اس نے معلوم کر لیا تھا کہ کاہنوں کے سردار کا حکم ظلم ہے اور ہر ایک آدمی کا انفعال (تاثر) کس قدر سخت تھا۔ اور وہ خدا جو کہ انسانوں کے دلوں کو جانچتا ہے کہ بے شبہ ہم لوگ بہوداہ (جس کو کہ ہم اپنا معلّم یسوع سمجھتے تھے) کی موت پر رنج و الم اور اس کو جی اٹھتا دیکھنے کے شوق میں محو ہو گئے تھے۔ اور وہ فرشتے جو کہ مریم پر محافظ تھے تیسرے آسمان کی طرف چڑھ گئے جہاں کہ یسوع فرشتوں کی ہمراہی میں تھا اور اس سے سب باتیں بیان کیں۔ لہذا یسوع نے اللہ سے منت کی کہ وہ اس کو اجازت دے کہ یہ اپنی ماں اور شاگردوں کو دیکھ آئے۔ تب اس وقت رحمان نے اپنے چاروں نزدیکی فرشتوں کو جو کہ جبرئیل اور میکائیل اور رافائیل اور اوریل ہیں، حکم دیا کہ یہ یسوع کو اس کی ماں کے گھر اٹھا کر لیجائیں اور یہ کہ متواتر تین دن کی مدت تک وہاں اس کی نگہبانی کریں اور سوا ان لوگوں کے جو اس کی تعلیم پر ایمان لائے ہیں اور کسی کو اسے نہ دیکھنے دیں۔ پس یسوع روشنی سے گھرا ہوا اس کمرہ میں آیا جس کے اندر کنواری مریم مع اپنی دونوں بہنوں اور مرتھا اور مریم مگدلینی اور لعزر اور اس کے لکھنے والے اور یوحنا اور یعقوب اور پطرس کے مقیم تھی۔ تب یہ سب خوف سے بے ہوش ہو کر گر پڑے گویا وہ مُردے ہیں۔ پس یسوع نے اپنی ماں کو اور دوسروں کو یہ کہتے ہوئے زمین سے اٹھایا "تم نہ ڈرو اس لئے کہ میں ہی یسوع ہوں اور نہ روؤ کیونکہ میں زندہ ہوں نہ کہ مُردہ۔" تب اُن میں سے ہر ایک دیر تک یسوع کے آجانے کی وجہ سے دیوانہ سا رہا۔ اس لئے کہ انہوں نے پورا پورا اعتقاد کر لیا تھا کہ یسوع مر گیا ہے۔ (انجیل برناباس فصل ۲۱۹)

اس کے بعد لکھا ہے کہ اللہ نے اپنے فرشتوں کو بھیجا جنہوں نے آکر بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح یہوداہ

کی اصلی صورت بدل کر حضرت مسیحؑ کے مشابہ بنا دی تھی اور اس طرح آپ کو صلیب سے محفوظ رکھا تھا'
ازاں بعد حضرت مسیحؑ نے اپنے حواریوں کو بہت سی نصیحتیں کیں اور

پھر اس کو چاروں فرشتے ان لوگوں کی آنکھوں کے سامنے آسمان کی طرف اٹھا لے گئے۔

(فصل ص ۲۲۱)

اخیر میں برناباس نے لکھا ہے۔

اور یسوع کے چلے جانے کے بعد شاگرد، اسرائیل اور دنیا کے مختلف گوشوں میں پراگندہ ہو گئے۔ رہ گیا حق (جو) شیطان کو پسند نہ آیا، اس کو باطل نے دبالیا جیسا کہ یہ ہمیشہ کا حال ہے۔ پس تحقیق شریروں کے ایک فرقے نے جو دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ یسوع کے شاگرد ہیں یہ بشارت دی کہ یسوع مر گیا اور وہ جی نہیں اٹھا۔ اور دوسروں نے یہ تعلیم پھیلائی کہ وہ درحقیقت مر گیا تھا مگر پھر جی اٹھا۔ اور اوروں نے منادی کی اور برابر منادی کر رہے ہیں کہ یسوع ہی اللہ کا بیٹا ہے۔ اور انہی لوگوں کے شمار میں پولس نے بھی دھوکا دیا۔ اب رہے ہم، تو ہم محض اسی کی منادی کرتے ہیں۔ یہ میں نے ان لوگوں کے لئے لکھا ہے کہ وہ اللہ سے ڈرتے ہیں تاکہ اخیر دن میں جو اللہ کی عدالت کا دن ہوگا چھٹکارا پائیں۔ آمین۔

(انجیل برناباس، فصل ص ۲۲۲)

یہ ہیں اناجیل کی بیان کردہ تفاصیل۔ لیکن (جیسا کہ ہم شروع میں لکھ چکے ہیں) ان بیانات کی تاریخی حیثیت محلِ نظر ہے اور خود عیسائی مؤرخین ان کے بیشتر حصّوں کو محض افسانہ قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ اور تو اور، حضرت مسیحؑ کی جائے پیدائش اور سِن ولادت جیسی ابتدائی باتوں کے متعلق بھی ابھی تک یقینی طور پر کچھ طے نہیں ہو سکا۔ حالانکہ آپ کی بعثت اس زمانہ میں ہوئی جب ان علاقوں میں

رینان کی تحقیق

تاریخ نویسی کا عام رواج ہو چکا تھا اور اس عہد کی کتبِ تاریخ جزوی تفاصیل تک کو بیان کرتی تھیں۔ چنانچہ مشہور عیسائی مؤرخ رینان (RENAN) اپنی کتاب "حیاتِ مسیحؑ" (THE LIFE OF JESUS) میں ان تمام امور پر تنقید کرتا اور اناجیل کے اکثر بیانات کی تردید کرتا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ آپ کی پیدائش ناصرہ میں ہوئی (ص ۲۶)

اور بیت لحم میں پیدائش کا قصہ محض افسانہ ہے (ص۴۷) جسے خاص مقصد کے پیشِ نظر وضع کیا گیا ہے۔ اس لئے کہ:

(اُس زمانے میں) عام عقیدہ یہ تھا کہ (آنے والا) مسیحؑ داؤد کی نسل میں سے ہوگا[1] اور اس کی طرح بیت لحم میں پیدا ہوگا۔ (ص۱۷۸)

اس کے بعد ریناںؔ لکھتا ہے کہ یہ بھی غلط ہے کہ آپ کی پیدائش مردم شماری کے سال ہوئی۔ یہ مردم شماری اس سال کے، جس سال میں متّی اور لوقاؔ کے بیان کے مطابق (حضرت) مسیحؑ کی پیدائش ہوئی ہے، کم از کم دس سال بعد واقع ہوئی تھی۔" (ص۴۶)۔ چنانچہ ریناںؔ کے بیان کے مطابق "آپؑ کی صحیح تاریخِ پیدائش متعین نہیں ہو سکتی۔ یہ آگسٹس کے عہد میں ۷۵۰ رومی کے قریب ہوئی ہوگی (اس لحاظ سے) سنِ عیسوی کی ابتدا سے بھی چند سال پہلے۔ حالانکہ تمام مہذب دنیا یہی حساب لگائے بیٹھی ہے کہ سنِ عیسوی (حضرت) مسیحؑ کی پیدائش سے شروع ہوتا ہے" (ص۴۷)۔ یعنی تمام عیسائی دنیا جس سال (ابتدائے سنِ عیسوی) کو حضرت مسیحؑ کی پیدائش کا سال قرار دیتی ہے، آپ کی پیدائش اس سے کئی برس بیشتر ہو چکی تھی۔ ریناںؔ اس کے بعد لکھتا ہے :-

آپ طبقۂ عوام سے متعلق تھے۔ آپ کے والد، یوسفؔ اور آپ کی والدہ مریمؔ، دونوں غریب گھرانے کے افراد تھے۔ دستکاری ان کا پیشہ تھا........ (حضرت) مسیحؑ کے اور بہن بھائی بھی تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سب سے بڑے آپ ہی تھے۔ .... مادری زبان آپ کی ارآمی تھی۔ یونانی زبان سے آپ واقف نہ تھے...... آپ کے والد کا انتقال جلدی ہو گیا اور اس کے بعد (حضرت) مریم ہی خاندان کی سرپرست رہ گئیں۔ یہی وجہ ہے کہ (حضرت) مسیح عام طور پر "ابنِ مریم" کے نام سے مشہور ہوئے یعنی جب آپ کو آپ کے ہم نام بچوں سے تمیز کرنا ہوتا تھا تو "یسوع ابنِ مریم" کہا جاتا تھا...... آپ کی ابتدائی زندگی ناصرہ میں ہی بسر ہوئی لیکن شوہر کی وفات کے بعد آپ کی والدہ

---

[1] خود اناجیل میں حضرت عیسیٰؑ کا جو نسب نامہ دیا گیا ہے اس کی تفاصیل میں بھی اختلاف ہے۔ یعنی ایک انجیل میں کچھ اور ہے اور دوسری میں کچھ اور۔

اپنے کنبہ سمیت قانا کی بستی کی طرف منتقل ہوگئیں جو ناصرہ سے دو اڑھائی گھنٹے کی مسافت پر واقع تھی ...... آپ نے اپنے والد کے اتباع میں نجاری کا پیشہ اختیار کیا۔
(ص ۴۶ لغایت ص ۴۹)

قرآن کریم کی تصریحات اب قرآن کریم کی طرف آئیے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، نزولِ قرآن کے وقت حضرت عیسٰی علیہ السلام کی ذاتِ گرامی کے متعلق عیسائیوں اور یہودیوں کی افراط و تفریط انتہائی گوشوں تک پہنچ چکی تھی اور اس طرح کثرتِ تعبیر سے یہ خواب کچھ ایسا بے طرح پریشان ہو چکا تھا کہ جب عصرِ حاضر کا مؤرخ اس زمانے کے لٹریچر پر نگاہ ڈالتا ہے تو محوِ حیرت رہ جاتا ہے کہ اس "بھول بھلیاں" سے اپنے آپ کو باہر کیسے نکالے! کوائف و سوانح حیات سے قطع نظر، آپ کے متعلق عیسائی اور یہودی ایسے متضاد نظریئے لئے بیٹھے تھے کہ اس حقیقت کا باور کرنا مشکل تھا کہ ایک ہی شخصیت کے متعلق تاریخ اس قسم کے متضاد و متباین نتائج بھی پیش کر سکتی ہے؟

عقائد کے لحاظ سے عیسائی :-

(۱) حضرت عیسٰیؑ کو ابن اللہ مانتے تھے۔
(۲) ابن اللہ ہی نہیں بلکہ خود خدا بھی۔
(۳) تثلیث کے اقانیم ثلاثہ (باپ۔ بیٹا۔ روح القدس) پر عقیدہ رکھتے تھے۔
(۴) آپ کے اور حضرت مریمؑ کے مجسموں کی پرستش ہوتی تھی۔
(۵) آپ کی تصلیب کو نوعِ انسانی کے گناہوں کا کفارہ تصور کرتے تھے۔
(۶) آپ کے زندہ آسمان پر چلے جانے کا عقیدہ رکھتے تھے۔
(۷) اور آپ کی واپسی کے منتظر بھی تھے۔

اس کے برعکس، جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، یہودی (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ) حضرت مریمؑ صدیقہ کے خلاف بہتان باندھتے اور چونکہ ان کے یہاں کسی کو صلیب دیا جانا اس کے لعنتی[1] ہونے کے مرادف سمجھا

---

[1] یہودیوں کے ہاں ارتداد کی سزا سنگساری تھی جسے وہ لعنت کی موت قرار دیتے تھے۔ (دیکھئے احبار ۱۴/۲۴)
(بقیہ فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

جاتا تھا، اس لئے وہ آپ کی پیدائش کی طرح آپ کی وفات کو (خاکم بدہن) ایک لعنتی کی موت تصور کرتے تھے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جس شخص کے متعلق ان کے خیالات یہ ہوں وہ اسے خدا کا رسول کیسے مان سکتے تھے؟ ان حالات میں قرآن کریم کا نزول ہوا۔ اب آپ خیال فرمایئے کہ ان خار دار جھاڑیوں میں اُلجھے ہوئے دامنِ مریمؑ اور قبائے مسیحؑ کو صحیح و سالم نکال کر لے آنا، کس قدر مشکل کام تھا۔ لیکن قرآنِ کریم اس مشکل ترین فریضہ سے جس معجزانہ انداز سے عہدہ برآ ہوا ہے، وہ اپنی نظیر آپ ہے (اور قرآن کی نظیر اس آسمان کے نیچے ہو کونسی سکتی ہے؟)۔

پیدائش حضرت مریمؑ

چونکہ قرآنِ کریم کے سامنے سب سے پہلے حضرت مریمؑ کی عفت و عصمت کی شہادت پیش کرنا تھا، اس لئے اس نے حضرت عیسیٰؑ کے تذکارِ جلیلہ سے پہلے حضرت مریمؑ کی پیدائش کا ذکر کیا ہے اور اس سلسلہ کو قائم رکھتے ہوئے پھر حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کا ذکر۔ سورۂ آلِ عمران میں ہے۔

اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّیْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ○ فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّیْ وَضَعْتُهَاۤ اُنْثٰی ؕ وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ ؕ وَ لَیْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰی ۚ وَ اِنِّیْ سَمَّیْتُهَا مَرْیَمَ وَ اِنِّیْۤ اُعِیْذُهَا بِكَ وَ ذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ (۳۵—۳/۳۴)۔

اس داستان کا آغاز اس واقعہ سے کیا جاتا ہے جب آلِ عمران کی ایک عورت نے اپنے رب کی منت مانی کہ میں اپنے پیدا ہونے والے بچے کو، تمام دنیاوی علائق سے آزاد کر کے، تیرے لئے وقف کرتی ہوں (کہ وہ تیرے مقدس گھر، ہیکل کی خدمت کرے)۔ اے میرے

(گذشتہ صفحے کا بقیہ فٹ نوٹ) (استثناء ۱۔۹/۱۴)۔ رومی حکومت کے ماتحت سنگساری کی جگہ صلیب نے لے لی۔ صلیب کی موت کے متعلق بھی ان کا یہی عقیدہ تھا کہ "جو پھانسی پاتا ہے وہ خدا کا ملعون ہوتا ہے" (استثناء ۲۱/۲۳)

پروردگار! تو میری اس نذر کو شرفِ قبولیت عطا فرما۔ تو سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ اس لئے تجھے معلوم ہے کہ میں نے کس حسنِ نیّت سے یہ منّت مانی ہے۔

اِس نے اپنے دل میں خیال کیا تھا کہ پیدا ہونے والا بچہ ' لڑکا ہوگا ' جو ہیکل کا راہب بن جائے گا اور اپنی پوری عمر ' اس کی خدمت کے لئے وقف کردے گا۔ لیکن اس کے ہاں پیدا ہوئی لڑکی! اس سے اُس کے دل میں خیال گزرا کہ لڑکا پیدا ہوتا تو زیادہ اچھا تھا۔

لیکن خدا کو خوب معلوم تھا کہ اس کے ہاں جو لڑکی پیدا ہوئی تھی وہ کن خوبیوں کی مالک تھی اور اس نے آگے چل کر ' خانقاہیت کی غیر خداوندی قیود کو توڑنے میں ' کتنے بڑے انقلاب کا موجب بننا تھا۔ لہٰذا اگر وہ لڑکا ہوتا تو ' اس لڑکی کے برابر نہیں ہوسکتا تھا۔

بہرحال ' اس کی ماں نے کہا کہ میں اس کا نام مریم رکھتی ہوں اور اسے ہیکل کی خدمت کے لئے وقف کرتی ہوں۔ میں دعا کرتی ہوں کہ خدا اسے اور (جب یہ بعد میں شادی کرلے تو) اس کی اولاد کو ' شیطانِ مردود کے وساوس سے محفوظ رکھے۔

یہودیوں کے ہاں ایک فرقہ تھا جسے نذرین یا منذورین کہتے تھے۔ ان میں سے ہر شخص یا تو خود اپنے آپ کو خدا کے لئے نذر کردیتا تھا یا اس کے اہلِ خاندان اسے نذر کردیتے تھے۔ بعض اوقات والدین ایک بچے کو اس کی ولادت سے قبل ہی نذری بنا دیتے تھے اور وہ ساری عمر نذری رہتا تھا۔ نذری کے متعلق سمجھا یہ جاتا تھا کہ عہدِ شباب ہی میں اس کا مرتبہ انبیاء کے برابر ہوجاتا ہے۔ ولادتِ حضرت مسیحؑ کے زمانے میں ' نذریوں کی تعداد بہت زیادہ ہوچکی تھی ــــــــــــــ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مریمؑ کے والدین ' اسی فرقے سے متعلق تھے۔

یہودیوں کے ہاں خانقاہیت کا رواج شروع میں نہیں تھا۔ یہ بعد کی اختراع ہے۔ ان کی تاریخ بتاتی ہے کہ ان کے ہاں یہ رواج حضرت عیسیٰؑ کی ولادت سے کچھ ہی پہلے شروع ہوا تھا۔ ابتداءً ہیکل کی خانقاہ میں صرف مرد راہب تھے۔ پھر راہبات کا سلسلہ شروع ہوا تو انہیں صرف زمانہ قبل از حیض تک وہاں رہنے کی اجازت تھی۔ پھر اس میں یہ ترمیم ہوئی کہ راہبات کی شادی ہیکل کے پیشواؤں کی جماعت کے اندر ہوسکتی تھی۔ آخر کار یہ راہبات ' عیسائی (NUNS) کی طرح ' ساری عمر تجرد کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کردی گئیں۔ حالانکہ نذریوں کے لئے یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ ساری عمر تجرّد کی زندگی

بسر کریں۔

سورۂ آلِ عمران کی جو آیت اوپر درج کی گئی ہے، اس سے مترشح ہوتا ہے کہ جب حضرت مریمؑ کی والدہ نے منت مانی ہے، اس وقت راہب کے لئے شادی کا دروازہ کھلا تھا، جبھی تو ان کی والدہ نے دُعا مانگی تھی کہ "اس بچی اور اس کی اولاد کو شیطان سے محفوظ رکھا جائے"۔ لیکن راہبہ اپنی شادی صرف ہیکل کے راہبوں میں سے کسی کے ساتھ کرسکتی تھی۔

حضرت مریمؑ نے اس غیر خداوندی رسمِ خانقاہیت کو توڑا تھا اور یہی ان کا جرم تھا جس کی وجہ سے ہیکل کے پیشوا ان کے خلاف ہوگئے تھے (تفصیل اس کی آگے چل کر سامنے آئے گی)۔

بہرحال، حضرت مریمؑ کو ہیکل کی نذر کردیا گیا جہاں آپ کی کفالت حضرت زکریاؑ جیسی جلیل القدر اور بزرگ ہستی کے سپرد ہوئی۔

فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ وَّ اَنْبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۙ وَّ كَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ۚ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ؕ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ○ (۳/۳۶)

سو اس کے رب نے، اس کی منت کو شرفِ قبولیت عطا فرمایا اور مریم کی پرورش کا نہایت عمدہ انتظام کردیا، یعنی اُسے زکریاؑ (جیسے نیک انسان) کی کفالت میں دیدیا۔ مریم اپنے زہد و ریاضت کی بنا پر، اس درجہ مرجعِ انام بن گئی کہ اس کے پاس نذر و نیاز کی چیزیں آنی شروع ہوگئیں۔ چنانچہ جب کبھی زکریاؑ عبادت گاہ (قربان گاہ) میں آتا تو مریمؑ کے پاس کھانے پینے کی چیزوں کو دیکھتا۔ وہ (بربنائے احتیاط) اس سے پوچھتا کہ اے مریم! تجھے یہ چیزیں کہاں سے ملتی ہیں۔ (کیونکہ اس کی کفالت تو زکریاؑ کے ذمے تھی)۔ وہ اس کے جواب میں کہہ دیتیں کہ (انہیں یہ چیزیں ہیکل کا کوئی آدمی نہیں دیتا بلکہ) یہ اللہ کی طرف سے آجاتی ہیں (یعنی جو لوگ اللہ کی نذریں مانتے ہیں، وہ دے جاتے ہیں)۔ اللہ اپنی مشیّت کے پیمانوں کے مطابق، اس طرح رزق کا سامان مہیا کردیتا ہے جو عام طور پر لوگوں کے خیال میں نہیں ہوتا (مریمؑ کا مقبولِ خلائق ہوجانا اس کا ذریعہ بنا)۔

اس آیت میں دو تین باتیں قابلِ غور ہیں۔ ایک تو یہ کہ اللہ تعالٰی نے اس نذر (یعنی حضرت مریمؑ) کو شرفِ قبولیت عطا فرمایا۔ دوسرے یہ کہ آپ کی پرورش و تربیت نہایت عمدگی سے ہوئی۔ تیسرے یہ کہ بچپن ہی سے آپ کی طبیعت زہد و انزوا کی طرف مائل تھی جس کی وجہ سے آپ محراب (قربان گاہ) کے قریب معتکف رہتیں اور آپ کے خورونوش کا عمدہ ترین سامان وہیں پہنچ جاتا۔ کھانے پینے کی چیزوں کے متعلق دریافت کرنے پر حضرت مریمؑ نے فرمایا کہ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ (یہ منجانب اللہ ہیں)۔ ضروری نہیں کہ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ سے مراد یہ ہو کہ یہ اشیاء ذریعہ اور واسطہ کے بغیر براہِ راست خدا کی طرف سے آتی ہیں۔ بلکہ (جیسا کہ برقِ طور میں حضرت موسیٰؑ کے تذکرۂ جلیلہ کے آخر میں تفصیلاً لکھا جا چکا ہے)، ذرائع و وسائل سے حاصل شدہ اشیاء کے متعلق بھی اللہ کے بندے یہی کہا کرتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مریمؑ کے زہد و تورع کی شہرت عام ہو گئی تھی۔ اس لئے لوگ ان کے پاس کھانے پینے کی چیزیں بطور نذر و منت از خود لئے چلے آتے تھے (جیسا کہ آج بھی خانقاہوں میں عام طور پر ہوتا ہے)۔

ہیکل کی زندگی

ہیکل کی راہبانہ زندگی اس قسم کی تھی[1]۔ معلوم ہوتا ہے کہ بچپن میں جب حضرت مریمؑ ہیکل میں آئیں تو اس وقت حضرت زکریاؑ نے انہیں اپنی کفالت میں لے لیا اور اس پر ہیکل کے متولیوں میں کسی قسم کا جھگڑا نہیں ہوا۔ لیکن جب وہ بڑھ کر جوان ہوئیں تو اس وقت ان کی کفالت کے اور دعویدار بھی پیدا ہو گئے اور اس متنازعہ فیہ معاملہ کا فیصلہ قرعہ اندازی سے کیا گیا۔

چنانچہ سورۃ آلِ عمران میں ہے:

وَ مَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ص
وَ مَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ۝ (۳/۴۳)

(اے رسول!) تو ان کے پاس نہ تھا جب وہ مریم کی کفالت کے لئے قرعہ اندازی کر رہے تھے۔ اور نہ ہی تو اس وقت اُن کے پاس تھا جب وہ اس کے لئے ایک دوسرے سے جھگڑتے تھے۔

---

[1] حضرت مریمؑ کی پیدائش اور ابتدائی زندگی کے حالات مروجہ اناجیلِ اربعہ میں نہیں ہیں لیکن متروک اناجیل میں یہ حالات بہ صراحت ملتے ہیں۔ بالخصوص ایک انجیل (ولادتِ مریم) تو مشتمل ہی انہی حالات پر ہے۔

قرآنِ کریم نے صرف اتنی بات کہہ کر کہ "پجاری ایک دوسرے سے جھگڑ رہے تھے"، ساری کہانی بیان کر دی ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، ہیکل کے قانون کے مطابق، راہبہ، صرف ہیکل کے راہبوں میں سے کسی کے ساتھ شادی کر سکتی تھی۔ جب تک حضرت مریمؑ بچی تھیں وہ حضرت زکریاؑ کی کفالت میں رہیں لیکن جب وہ جوان ہوئیں تو (جیسا کہ عام طور پر خانقاہوں میں ہوتا ہے) راہبوں کی للچائی ہوئی نظریں ان کی طرف اٹھنی شروع ہوئیں۔ حضرت مریمؑ ان راہبوں کی اندرونی زندگی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی تھیں۔ وہ بڑی پاک باز تھیں اور پاک باز رہنا چاہتی تھیں۔ اس لئے وہ ہیکل کی زندگی سے بیزار ہو گئیں۔ وہ وہاں سے نکل کر عام (پاکباز) انسانوں جیسی زندگی بسر کرنا چاہتی تھیں۔ لیکن ان کے اس ارادے کے راستے میں رہ و رسمِ خانقاہیت کی (انسانوں کی خودساختہ) شریعت حائل تھی۔ اس سے، وہ دن رات ایک شدید نفسیاتی کشمکش میں مبتلا رہنے لگیں۔ آپ سوچئے کہ ایک راہبہ کے لئے یہ کشمکش کس قدر جانگسل اور رسمِ خانقاہیت کے خلاف فیصلہ کرنا کس قدر ہمت طلب تھا۔ اس وقت انہیں توفیقِ ایزدی کی بڑی ضرورت تھی جو انہیں اس قسم کے انقلابی اقدام کے لئے آمادہ کر دیتی۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے، ان کے دل میں خدا کی طرف سے یہ اطمینان پیدا کر دیا گیا کہ وہ گھبرائے نہیں۔ ایسے سامان پیدا کر دیئے جائیں گے کہ وہ ہیکل کی ہوس آلود فضا سے نکل کر، اپنی منشا کے مطابق، گھر کی پاک اور صاف زندگی بسر کرے اور اس طرح (رسمِ خانقاہیت کے خلاف جہاد کر کے) اپنے دَور کی تمام عورتوں سے ممتاز ہو جائے (۴۲ — ۳/۴۳)۔ حضرت مریمؑ کو ملائکہ کی وساطت سے یہ اطمینان اسی طرح دلایا گیا جس طرح تمام مومنین کو ملائکہ کے ذریعے بشارتیں ملتی ہیں (دیکھئے ۴۱/۳۰) اور اس طرح ان کے سکونِ قلب کا سامان پیدا کر دیا جاتا ہے (۸/۱۲؛ ۹/۲۶)۔

بشارتِ حضرت عیسیٰؑ

انہی بشارتوں میں حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کا بھی ذکر تھا۔

إِذْ قَالَتِ الْمَلَٰٓئِكَةُ يَٰمَرْيَمُ إِنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ ۝ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَمِنَ الصَّٰلِحِينَ ۝ (۳/۴۵—۴۶)

اسی سلسلہ میں، ملائکہ نے مریمؑ سے کہا تھا کہ خدا تمہیں اپنی طرف سے ایک بات کی خوشخبری دیتا ہے، یعنی ایک بیٹے کی جس کا نام مسیحؑ (اور) عیسٰی ابنِ مریم ہوگا۔ دنیا میں صاحبِ وجاہت اور آخرت میں خدا کے مقربین میں سے۔

تندرست و توانا۔ چھوٹی عمر میں خوب باتیں کرنے والا اور پختہ عمر تک پہنچنے والا (۳/۴۵) نہایت عمدہ صلاحیتوں کا مالک، پاک باز انسان۔ (اس سے ان توہمات کا دور کرنا مقصود تھا جو ایک راہبہ کے دل میں اس خیال سے پیدا ہو سکتے ہیں کہ وہ خانقاہیت کی شریعت کے علی الرغم، متاہل زندگی اختیار کر رہی ہے۔ اس سے کہیں وہ یا اس کا بچہ، کسی آفت میں مبتلا نہ ہو جائے۔ بعض اوقات اس قسم کے توہمات کا ایسا نفسیاتی اثر ہوتا ہے کہ سچ مچ ایسا ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس کے دل سے ان خیالات کا دُور کرنا ضروری تھا)۔

کلمہ کی تشریح عنوان زیر نظر کے اخیر میں ملے گی اور چھوٹی عمر میں باتیں کرنے کی تصریح ذرا آگے چل کر آئے گی۔ یہاں صرف اتنا دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلی بشارت میں ہی حضرت عیسٰیؑ کو دنیا اور آخرت میں آبرومند، خدا کا مقرب اور صالح انسان قرار دیا ہے۔ اس بشارت پر حضرت مریمؑ نے عرض کیا۔

قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ وَلَدٌ وَّ لَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ اِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝ (۳/۴۶)

اس پر مریمؑ نے (زکریا کی طرح ۳/۳۹) تعجب سے کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے جبکہ میں ایک کنواری راہبہ ہوں۔ راہبہ کے ہاں اولاد کا کیا سوال؟ اس کے جواب میں، اُس سے وہی کچھ کہا گیا جو زکریا سے کہا تھا (۳/۳۹) کہ یہ خدا کے اُس قانونِ مشیت کے مطابق ہوگا جس کی رُو سے عام تخلیق ہوتی ہے۔ وہ قانون جو اس اصول پر مبنی ہے کہ خدا جب کسی بات کا فیصلہ کرتا ہے تو اُس کے ساتھ ہی اس اسکیم کا آغاز ہو جاتا ہے (۲/۱۱۷)۔

یہی الفاظ انجیل برناباس میں آئے ہیں۔

اس کنواری نے جواب دیا، اور میں بیٹا کیونکر پیدا کروں گی بحالیکہ میں کسی مرد کو جانتی تک نہیں۔ (فصل اوّل)

قرآنِ کریم میں سورۂ مریم میں، یہ واقعہ مزید تفاصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے جہاں فرمایا۔

وَ اذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ ۘ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّاۙ فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا ۗ فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ○ (۱۶ــــ ۱۹/۱۷)

اے رسول! اب تو اس کتاب (قرآن) میں، لوگوں سے، مریم کا قصہ بیان کر اور سلسلۂ کلام کا آغاز اس وقت سے کر جب وہ خانقاہیت کی زندگی کو چھوڑ کر، (اپنے گاؤں، ناصرہ میں) چلی گئی تھی جو (وہاں سے) مشرق کی سمت واقع تھا۔

(خانقاہیت کی زندگی اور وہاں کے ناخوش آیند واقعات نے اس کے دل پر ایسا اثر چھوڑا تھا کہ وہ) وہاں بھی لوگوں سے الگ تھلگ رہتی تھی۔ ہم نے (ان اثرات کو مٹانے کے لئے اسے زندگی کے خوشگوار پہلوؤں کے متعلق) تقویت بخش اشارہ کیا جو (اس کے خواب میں) ایک اچھے بھلے انسان کی شکل میں سامنے آیا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت حضرت مریمؑ ہیکل کو چھوڑ کر اپنے آبائی وطن ناصرہ میں تشریف لے جا چکی تھیں جو یروشلم سے شمال مشرق کی طرف واقع ہے۔ لوقا کی انجیل میں ہے۔

چھٹے مہینے جبرئیل فرشتہ خدا کی طرف سے گلیل کے ایک شہر میں جس کا نام ناصرۃ تھا ایک کنواری کے پاس بھیجا گیا جس کی منگنی داؤد کے گھرانے کے ایک مرد یوسف نام سے ہوئی تھی اور اس کنواری کا نام مریم تھا۔ (لوقا ۲۸ــ ۱/۲۶)

آیت (۱۹/۱۷) میں فَتَمَثَّلَ لَهَا آیا ہے۔ عربی لغت 'منتھی الادب' میں اس کے ایک معنی 'داستان زدن' بھی بیان ہوئے ہیں یعنی کیفیت بیان کرنا۔ اس اعتبار سے اس آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ اس پیغام رساں نے مریم سے اس کے ہاں ہونے والے تندرست و توانا بچے کی کیفیت بیان کی۔

دوسرے مقام پر اس آنے والے کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ ملك تھا (۳/۴۴) اور ملائکہ کسی کو نظر نہیں آیا کرتے (۹/۲۶)، اگرچہ ان کا نزول مؤمنین پر بھی ہوتا ہے (۴۱/۳۰)۔ اس لئے اگر وہ پیغام رساں "فرشتہ" تھا تو وہ حضرت مریمؑ کو نظر نہیں آسکتا تھا۔ لہٰذا، یہ واقعہ خواب کا ہوسکتا ہے۔ اور اگر وہ نظر آیا تھا تو وہ کوئی انسان پیغام رساں ہوسکتا ہے۔ خود لفظ ملك کے معنی پیغام رساں بھی ہیں۔ بہرحال اب

ہمیں آگے بڑھنا چاہیئے۔ اس پر حضرت مریمؑ نے کہا۔

قَالَتْ اِنِّیْٓ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا ٥ (۱۹/۱۸)

مریم اسے دیکھ کر گھبرا گئی۔ وہ بولی، "اگر تو خدا کے قانون کا احترام کرتا ہے، تو میں تجھ سے، خدائے رحمان کی پناہ میں آجانا چاہتی ہوں۔

اس آنے والے نے جواب دیا۔

قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ ۖ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا ٥ (۱۹/۱۹)

اس نے کہا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ میں تو تیرے پروردگار کی طرف سے ایک پیغام لے کر آیا ہوں (۳/۴۴) اور وہ پیغام یہ ہے کہ وہ تجھے ایک پاکیزہ فرزند عطا کرے گا۔

اس پر حضرت مریمؑ نے کہا۔

قَالَتْ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَكُ بَغِيًّا ٥ (۱۹/۲۰)۔

اس پر مریم نے کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے؛ جب تک میں ہیکل میں رہی، پاکباز راہبہ کی زندگی بسر کی۔ وہاں کسی انسان نے مجھے چھوا تک نہیں۔ وہاں سے نکلی ہوں تو میں نے شادی نہیں کی کیونکہ یہ چیز ضابطۂ خانقاہیت کے خلاف ہے (۳/۴۶؛ ۱۹/۲۸)۔

اور اللہ کے فرستادہ نے جواب دیا۔

قَالَ كَذٰلِكِ ۚ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ ۚ وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا ۚ وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا ٥ (۱۹/۲۱)

اس نے کہا کہ میں نے جو کچھ کہا ہے وہ قانونِ تخلیق کے مطابق ہی ہوگا (۳/۴۶)۔ یہ اس کے نزدیک کچھ بھی مشکل نہیں (کہ جو موانعات تیرے ذہن میں ہیں اور تمہیں اس طرح پریشان کر رہے ہیں، انہیں دور کر دے ۱۹/۹)۔ خدا نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ بچہ عام بچوں جیسا نہیں ہوگا۔ وہ ہماری طرف سے، لوگوں کے لئے، موجبِ رحمت اور حق و باطل کے پرکھنے کی نشانی ہوگی۔ (جو شخص اس کی نبوت پر ایمان لائے گا، وہ حق پر سمجھا جائے گا، جو اس سے انکار کرے گا، وہ باطل پر ہوگا)، اور یہ بات طے شدہ ہے (کہ وہ بچہ ہمارا پیغمبر

بنے گا (۳/۴۷))۔

پیدائش حضرت عیسیٰؑ اس کے بعد ارشاد ہے۔

فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا ۝ فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ ۚ قَالَتْ يٰلَيْتَنِىْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَ كُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا ۝ (۲۲ ـــــ ۱۹/۲۳)

(چنانچہ، رفتہ رفتہ وہ موانع دُور ہوتے گئے۔ ادھر مریم کے دل سے خانقاہیت کی غلط رسم کی خلاف ورزی کا خوف دُور ہوگیا۔ اُدھر ایک شخص، ہیکل کے احبار و رہبان کی تنبیہ و تخویف کے باوجود، مریم کے ساتھ شادی کرنے پر رضامند ہوگیا)۔ مریم کو ہونے والے بچّے کا حمل قرار پاگیا۔ اس پر ان دونوں نے یہی مناسب سمجھا کہ وہ گاؤں سے کہیں دُور چلے جائیں تاکہ بچّے کی ولادت کسی ایسی جگہ ہو جہاں ان کی جان پہچان کا کوئی نہ ہو اور یوں وہ احبار و رہبان کے طعن و تشنیع کے نشتروں سے محفوظ رہیں)۔

وضعِ حمل کا وقت آیا تو دردِ زہ کا اضطراب، مریم کو ایک کھجور کے درخت کی طرف لے گیا۔ (آئینِ خانقاہیت کے خلاف متاہل زندگی، پہلے بچّے کی ولادت، پردیس کا معاملہ، بے سروسامانی کا یہ عالم کہ سر پر چھت تک بھی نہیں۔ مریم گھبرا گئی اور کہنے لگی کہ اے کاش! میں اس سے پہلے ہی مرگئی ہوتی اور بالکل بھولی بسری ہو چکی ہوتی!

غور کیجئے۔ قرآن نے "يٰلَيْتَنِىْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَ كُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا" کے ایک مختصر سے ٹکڑے میں جذبات و احساسات کی ایک پوری دنیائے نسائیت کو کس نادرہ کاری سے سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔ حضرت مریمؑ کی اس قلبی کاوش کی تسکین کے لئے ارشاد ہوا۔

فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَآ اَلَّا تَحْزَنِىْ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا ۝ (۱۹/۲۴)

(اس کرب و یاس کے عالم میں اُسے، اس مقام کے نشیب کی طرف سے آواز آئی کہ اے مریم! گھبراؤ نہیں۔ اس طرف ایک (خوشگوار) پانی کی ندی ہے (اور اوپر، کھجور کے درخت میں پکی ہوئی کھجوروں کے خوشے لٹک رہے ہیں)۔

اور طبعی کرب و اضطراب کے لئے۔

وَ هُزِّيْٓ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا ۝ (۱۹/۲۵)

تو کھجور کے درخت کا تنہ پکڑ کے اپنی طرف ہلا۔ تازہ اور پکے ہوئے پھلوں کے خوشے تجھ پر گرنے لگیں گے۔

ان حالات کے ماتحت حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش ظہور میں آئی۔ حضرت مریمؑ سے کہا گیا کہ

فَكُلِيْ وَ اشْرَبِيْ وَ قَرِّيْ عَيْنًا ۚ فَاِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا ۙ فَقُوْلِيْٓ اِنِّيْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اُكَلِّمَ الْيَوْمَ اِنْسِيًّا ۚ (۱۹/۲۶)۔

تو ان تازہ کھجوروں کو کھا۔ ندی کا ٹھنڈا پانی پی۔ (پھر بچے کے نظارے سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی کر۔ (باقی رہا تیرا یہ اضطراب کہ لوگوں کی باتوں کا کیا جواب دوں گی۔ تو تم منت کا روزہ رکھ لینا) اور اگر کوئی آدمی تجھ سے کچھ پوچھے تو اشارہ سے کہہ دینا کہ میں نے خدائے رحمان کے لئے اپنے اوپر روزہ واجب کر رکھا ہے اس لئے میں آج کسی شخص سے بات چیت نہیں کر سکتی۔

یعنی اللہ تعالیٰ کی اس بخشش و عنایت کے لئے بطور تشکر و امتنان روزہ رکھیں (جیسا کہ حضرت زکریاؑ کے تذکرہ میں لکھا جا چکا ہے، یہودیوں کے ہاں روزہ کی حالت میں بات چیت نہیں کی جاتی تھی)۔

حضرت عیسیٰؑ کی ولادت کا تفصیلی ذکر انہی مقامات پر آیا ہے۔ باقی جگہ اس کا محض ضمنی تذکرہ ہے لیکن اس ضمنی تذکرہ میں بھی اس اصلی غایت کو سامنے لایا گیا ہے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے، یعنی حضرت مریمؑ کی عفت و ناموس کی شہادت۔ سورۂ انبیاء میں ہے۔

وَالَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا وَ جَعَلْنٰهَا وَابْنَهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ (۲۱/۹۱)

اور ان کے ساتھ ہی، اس عفت مآب خاتون کا معاملہ بھی یاد کرو جسے ہم نے (یہودیوں کی خود ساختہ شریعت کے علی الرغم) عیسیٰؑ جیسا بیٹا عطا کیا اور جس طرح ہر انسانی بچے میں خدائی توانائی کا شمہ ڈال کر اسے صاحب اختیار و ارادہ انسان بنا دیا جاتا ہے، اسے بھی ایسا ہی بنایا۔

(۳/۴۴ ؛ ۱۹/۱۷ ؛ ۳۲/۹). وہ دونوں، اقوامِ عالم کے لئے اس بات کی نشانی تھے کہ احکام خداوندی اور انسانوں کی خود ساختہ شریعت کے فیصلوں میں کتنا فرق ہوتا ہے. (یہودیوں کی خود ساختہ شریعت نے انہیں ـــ معاذ اللہ ـــ مردود و ملعون قرار دیا اور خدا کی شریعت نے انہیں مقرب و مقبول ٹھیرایا).

یہی الفاظ سورۂ تحریم میں بھی آئے ہیں (دیکھئے ۶۶/۱۲). سورۂ نساء میں خود حضرت عیسیٰؑ کو " رُوْحٌ مِّنْهُ" اللہ کی طرف سے روح، کہہ کر پکارا گیا ہے (۴/۱۷۱). روح کے متعلق "ابلیس و آدم" (عنوان ملائکہ) میں بحث ہو چکی ہے جہاں بتایا گیا ہے کہ روح اللہ کا امر (حکم) ہے یا اس کی طرف سے وحی. اس لئے ان مقامات میں" روح پھونکنے "سے مراد یہ نہیں کہ سچ مچ کوئی شے پھونک دی گئی تھی. بلکہ یہ خدا کا امر (حکم) تھا جو مشیت کے مطابق ظہور میں آ گیا. (اس سلسلہ میں آیات ۱۹/۲۱ ؛ ۲۱/۹۱ ؛ ۲۳/۵۰ بھی دیکھئے). یہ چیزیں اس وقت محض ضمناً سامنے آ گئی ہیں. حضرت عیسیٰؑ کے متعلق تفصیلی بحث آگے چل کر ملے گی. اس وقت صرف یہ بتانا مقصود تھا کہ قرآنِ کریم نے حضرت مریمؑ کی عفت و عصمت کی شہادات اس تکرار و اصرار کے ساتھ پیش کر کے انہیں یہودیوں کی تہمت تراشیوں سے بلند ثابت کیا ہے.

اس مقام پر ضمناً اس کا بھی اضافہ کر دیا جائے کہ عیسائیوں کے عقیدہ کے مطابق سنِ عیسوی حضرت عیسیٰؑ کے سالِ پیدائش سے شروع ہوتا ہے. لیکن اب تحقیقات نے یہ بتایا ہے کہ جو سال حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کا تصور کیا جاتا ہے آپ کی پیدائش اس سے چھ سات یا (کم از کم) چار برس پہلے ہو چکی تھی. یہ بات محض ضمناً بیان کی گئی ہے. قرآنِ کریم میں اس کا ذکر نہیں آیا، نہ ہی قرآن ایسی تفاصیل بیان کیا کرتا ہے کیونکہ اس کا مقصد وقائع نگاری نہیں، اہم حقائق کو سامنے لانا ہے.

اسی سلسلہ میں ایک اور بات بھی قابلِ ذکر ہے. عیسائیوں کے نزدیک حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش دسمبر کے مہینے میں ہوئی تھی. لیکن اب تحقیق کا رُخ اس طرف ہے کہ یہ نظریہ بھی حقیقت کے خلاف ہے. آپ کی پیدائش سردی کے موسم میں نہیں ہوئی تھی. قرآن کریم کے بیان کے مطابق آپ کی پیدائش اس موسم میں ہوئی تھی جب درختوں پر پکی ہوئی کھجوروں کے خوشے لٹک رہے تھے (جنہیں حضرت مریمؑ نے ہلا کر کھجوریں کھائی تھیں). یہ زمانہ سخت سردی کا نہیں ہوتا.

مصر کی طرف روانگی

ہم شروع میں دیکھ چکے ہیں کہ اناجیل کے بیان کی رُو سے یوسف حضرت مریمؑ اور بچّے کو لے کر مصر کی طرف چلا گیا تھا جہاں یہ کنبہ سات سال تک رہا۔ جب یہ لوگ وطن واپس آئے تو ہر سال، بڑے تیوہار کی تقریب پر یروشلم آیا کرتے تھے۔ جب حضرت عیسیٰؑ کی عمر بارہ برس کی ہوئی تو انہوں نے ہیکل کے راہبوں سے وعظ و نصیحت اور بحث و تذکیر شروع کر دی۔ جیسا کہ ظاہر ہے، قرآنِ کریم ایک تاریخی کتاب کی طرح تمام واقعات کو مسلسل بیان نہیں کرتا بلکہ وہ داستان کی انہی کڑیوں کو لیتا ہے جن سے استنباطِ نتائج مقصود ہو اور ان میں سے بھی بعض کی طرف محض اشارہ کر کے آگے بڑھ جاتا ہے۔ کیونکہ اس کے اوّلین مخاطب (عرب) ان واقعات کی تفاصیل و جزئیات سے واقف تھے (تفصیل "ابلیس و آدمؑ" میں رسالت کے عنوان میں گذر چکی ہے)۔ چنانچہ حضرت مریمؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے نقلِ مکانی کے متعلق بھی صرف ایک اشارہ پر اکتفا کیا گیا ہے جہاں فرمایا۔

وَ جَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَ اُمَّهٗۤ اٰيَةً وَّ اٰوَيْنٰهُمَاۤ اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّ مَعِيْنٍ ؕ (۲۳/۵۰)

اور (اسی طرح) ابنِ مریم (یعنی مسیح) اور اس کی ماں کو (اپنی سچائی کی) ایک بڑی نشانی بنایا اور انہیں ایک مرتفع مقام میں پناہ دی جو بسنے کے قابل اور شاداب تھا۔

قیاس یہ ہے کہ اس سے مراد نیل کا وہ بالائی حصہ ہے، جہاں حضرت عیسیٰؑ کا بچپن گذرا[1]۔ لیکن (جیسا کہ ذرا آگے چل کر بتایا جائے گا) ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد قانا کا وہ علاقہ ہو جہاں رینان کے بیان کے مطابق یہ کنبہ منتقل ہو کر گیا تھا۔ اگر یہ کنبہ مصر کی طرف گیا تھا تو وہاں سے مراجعتِ وطن کے زمانہ میں آپ کی عمر (اناجیل کے بیان کے مطابق) سات برس کی تھی یا زیادہ سے زیادہ بارہ برس کی۔ اگر یہ صحیح ہے تو ہیکل کے احبار و رہبان کی پُرفریب زندگی اور اُن کی وضعی رسومات کے خلاف آپ کی صدائے احتجاج اُس صلاحیت کی بنا پر تھی جو آپ کو چھوٹی عمر ہی میں حاصل تھی۔ لیکن گمانِ غالب یہی ہے کہ آپ نے یہ سلسلۂ رشد و ہدایت اور وعظ و تذکیر شرفِ نبوت سے بہرہ یاب ہونے کے بعد ہی شروع کیا تھا

---

[1] یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ نقل مکان واقعۂ صلیب کے بعد کی ہو (اس کے متعلق تفصیلی ذکر بعد میں آئے گا)۔

(جو اناجیل کی رُو سے قریب تیس برس کی عمر کا زمانہ ہے)۔ ریناںؔ کا بیان ہے کہ آپ نے پہلے گلیل کے صومعوں میں وعظ کہنا شروع کیا تھا اور اگرچہ یروشلم میں آپ قریب ہر سال آتے تھے لیکن یہاں ۳۱ سنہ میں سب سے پہلا اہم واقعہ ہوا جب ہیکل کے احبار و رہبان سے آپ کا تصادم ہوا (ریناں صفحہ ۱۵۸-۱۱۹)۔

قرآنِ کریم میں البتہ ایک اور واقعہ کا ذکر آیا ہے (جو اناجیل میں مذکور نہیں اور) جسے اس نے تکلّم فِی المھد (گہوارہ میں گفتگو) کے عنوان سے بیان کیا ہے۔ یہ واقعہ کب اور کیسے ہوا، اس کے متعلق پیدائش حضرت عیسیٰؑ کے ضمن میں ذرا آگے چل کر لکھا جائے گا۔

(۵)

تیس برس تک کی زندگی

حضرت عیسیٰؑ کی بارہ برس سے تیس برس تک کی زندگی کے کوائف و احوال کے متعلق اناجیل خاموش ہیں۔ لوقا سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی عمر اکتیس برس کی تھی جب آپ شرفِ نبوت سے سرفراز ہوئے۔ "جب یسوع خود تعلیم دینے لگا تو قریباً تیس برس کا تھا" (لوقا ۳/۲۳)۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں تیس برس لکھا ہے۔[1] یہ اتنا لمبا عرصہ اس قدر خاموشی اور گمنامی میں کس طرح گذرا، اس کے سمجھنے کے لئے اس زمانے کی ایک عظیم الشان تحریکِ اخوت پر (جو فرقہ ایسینی (ESSENES) سے متعلق تھی) نگاہ ڈالنی ضروری ہے۔ یہ علمائے فطرت کا ایک عجیب و غریب فرقہ تھا جس کے احوال و ظروف عوام کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھے جاتے تھے

---

[1] یہ تفاوت تو خیر کچھ ایسا نہیں۔ حضرت عیسیٰؑ کی سیرتِ مقدسہ کی دیگر تفاصیل کے متعلق عیسائی لٹریچر میں ایسے ایسے متضاد و متخالف بیانات موجود ہیں کہ پڑھنے والا محوِ حیرت رہ جاتا ہے کہ "یاالٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟" مغربی محققین باہمہ ادعائے تحقیق و کاوش ابھی تک حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کا زمانہ بھی صحیح طور پر متعین نہیں کر سکے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں "کرسمس" کا عنوان دیکھئے۔ آپ ایسا محسوس کریں گے گویا کسی طلسم کدۂ حیرت میں جا نکلے ہیں جہاں پریشانی کے سوا اور کچھ نہیں۔ بہرحال انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے بیان کے مطابق حضرت عیسیٰؑ کی عمر تیس برس کی تھی جب آپ نے پبلک لائف اختیار کی اور اس کے قریب اٹھارہ ماہ بعد واقعۂ تصلیب ظہور میں آگیا۔ گویا اس اعتبار سے آپ کی کُل مدتِ نبوت قریب ڈیڑھ سال تھی اور بعض بیانات کے مطابق زیادہ سے زیادہ تین برس۔

لیکن جس کی شاخیں اس زمانہ کی قریب قریب تمام مہذب دنیا میں پھیلی ہوئی تھیں۔ اس فرقہ کا تفصیلی تعارف تو میری کتاب "مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں" میں دیکھئے۔ اس مقام پر اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ اس کی رکنیت بڑی بڑی سخت ریاضتوں، زہرہ گداز مجاہدوں اور جانکاہ آزمائشوں کے بعد نصیب ہوتی تھی۔ خدمتِ خلق ان کا نصب العین اور تزکیۂ نفس ان کا مطمحِ نگاہ تھا۔ اس کے بڑے بڑے رکن جنگلوں اور پہاڑوں میں پھرتے، ضبطِ نفس کے لئے بڑی بڑی مشقتیں برداشت کرتے اور اس کے ساتھ ساتھ علم الاشیاء کے مختلف شعبوں میں تحقیق و کاوش کرتے اور جڑی بوٹیوں اور دیگر نباتات و معدنیات کے خواص دریافت کرتے تحصیلِ علومِ فطرت میں بڑی بڑی تکلیفیں اٹھاتے اور بلا مزد و معاوضہ بیماروں کا علاج کرتے[1] اور محتاجوں کی امداد کو پہنچتے۔ لیکن یہ پہاڑوں کے غاروں میں ہوتے یا جنگلوں میں، صحراؤں میں پھرتے یا بستیوں میں، سب ایک نظام سے وابستہ ایک مرکز سے ملحق رہتے۔ جاننے والے ان کے کیریکٹر کی پختگی، سیرت کی بلندی، زہد و عبادت، علم و عمل اور خدمتِ خلق کے بے پناہ جذبے کی قدر کرتے لیکن متغلب اور مستبد قوتیں ان کے عظیم الشان نظام سے خائف بھی رہتیں۔ فلسطین اور مصر اس فرقہ کے مراکزِ خصوصی تھے۔ اس فرقہ کے متعلق تاریخی قیاس آرائیاں شروع سے ہوتی چلی آرہی تھیں۔ لیکن حال ہی میں فلسطین کے علاقہ قمران کے غاروں سے جو پرانی دستاویزات (SCROLLS) برآمد ہوئی ہیں، انہوں نے ان حالات پر مزید روشنی ڈالی ہے۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ یہ فرقہ دینی احکام کے معاملہ میں بڑا متشدد تھا اور مسیح موعود کے ظہور کا بڑی بے تابی سے انتظار کرتا تھا۔ یہ، دیگر اسرائیلی فرقوں کے مقابلہ میں زیادہ پاک باطن تھا۔ یہ لوگ زندگی میں صرف ایک بار قسم کھاتے تھے جس میں وہ یہ عہد کرتے تھے کہ وہ دیانت و امانت کو شعار بنائیں گے اور جماعت کے رازوں کو سربستہ رکھیں گے۔ اس کے بعد قسم اٹھانا حرام سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک مادّہ (MATTER) تمام برائیوں کا سرچشمہ تھا اور اس سے لذت اندوز ہونا گناہ تھا۔ ان میں باہمی اخوت اور بھائی چارہ کا رشتہ تھا۔ یہ

---

[1] ازمنۂ قدیمہ میں آپ بالعموم دیکھیں گے کہ اس قسم کی زہد و پارسائی کی زندگی بسر کرنے والے لوگ خواص الادویہ کے بڑے ماہر اور چٹکلوں سے علاج کرنے میں بڑے حاذق ہوتے تھے۔ ہندوؤں کے ہاں یوگی اور سنیاسی آج بھی اس قسم کے صحرا نورد اور دشت پیما تارک الدنیا فرقوں کی یاد دلاتے ہیں اور غالباً انہی کے پسماندہ ہیں۔

سفر میں کبھی اکیلے نہیں نکلتے تھے۔ دو دو کر کے ہمراہ نکلتے تھے۔ ان کے مذہب میں ایک آدمی کے لئے ایک وقت میں، دو کپڑے یا دو جوتے رکھنا یا مال و دولت جمع کرنا جائز نہیں تھا۔ ازدواجی رشتہ بھی صرف ان کے لئے جائز تھا جنہیں اس کی اجازت دی جاتی تھی۔ ان میں سے جو لوگ زہد و ریاضت کی آخری منزل میں پہنچ جاتے تھے انہیں "واصلین" کہا جاتا تھا۔ انہیں نیلے رنگ کا ایک خرقہ، ایک رسّی اور ایک کلہاڑی عطا ہوتی تھی۔ یہی ان کا تمام ساز و سامانِ حیات ہوتا تھا۔ بعض کا خیال ہے کہ "الیسینی" کا مشتق لفظ "آسی" ہے جس کے معنی طبیب کے ہیں[1]۔

قرآن سے مترشح ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ جب (زمانہ قبل از نبوت میں) تلاشِ حقیقت میں مصروف تگ و تاز تھے، تو انہوں نے اس فرقہ کی طرف بھی اپنا رُخ کیا تھا۔ اس قیاس کی تائید ایک ایسے کتبہ سے بھی ہوتی ہے جو مصر کے محکمہ آثارِ قدیمہ کو ایسینی فرقے کے ایک قدیمی مسکن سے ملا اور جو جرمنی کی ایک علمی جماعت کے قبضہ میں ہے[2]۔ ہم (ابلیس و آدم) وحی کے عنوان میں بالتفصیل دیکھ چکے ہیں کہ نبوت کسی قسم کی ریاضتوں اور مشقتوں کی محتاج نہیں ہوتی، نہ وہ اس قسم کے کسب و ہنر کا نتیجہ ہوتی ہے۔ لیکن جسے مشیّت کی طرف سے منصبِ نبوت کے لئے منتخب کیا جاتا ہے، اس کی شروع ہی سے کیفیت یہ ہوتی کہ وہ حقیقت کی تلاش میں سرگرداں رہتا۔ اس کے لئے وہ عالمِ انفس و آفاق کے

ایک خصوصیتِ کبریٰ

ایک ایک گوشے میں پھر نکلتا اور اس کی یہ خلش و کاوش کہیں بھی قرار پذیر نہ ہوتی حتّٰی کہ وحی کی تجلّیاتِ ربانی حقیقت کو بے نقاب سامنے لے آتیں۔ قبل از نبوت، تلاشِ حقیقت میں اس کی سیمابیت کی کیفیت یہ ہوتی کہ

چہ کنم کہ فطرتِ من بہ مقام درنسازد　　　دلِ ناصبور دارم چو صبا بہ لالہ زارے
چو نظر قرار گیرد بہ نگارِ خوب روئے　　　تپد آں زماں دلِ من پئے خوب تر نگارے
ز شرر ستارہ جویم، ز ستارہ آفتابے　　　سرِ منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے
طلبم نہایتِ آں کہ نہایتے ندارد　　　بہ نگاہِ ناشکیبے بہ دلِ امیدوارے

---

[1] بہ حوالہ عباس محمود العقاد مصری کی کتاب "حیاتِ مسیح"۔

[2] بحوالہ تذکرہ (عنایت اللہ خاں المشرقی) اور انسائیکلوپیڈیا اوف ریلیجز اینڈ ایتھکس (ہیسٹنگز)

یہ ہوتی تھی کیفیت اس متجسّسِ حقیقت، قلبِ بے قرار کی جس میں نقاب کشائیِ حقائق کی تڑپ ہر آن قیامت خیز طوفان برپا رکھتی لیکن جس کی نگاہ کو کوئی سراب آسا درخشندگی فریب نہ دے سکتی۔ اس لئے کہ وہ (ہنوز) حقیقت کو بے نقاب نہ دیکھ سکنے کے باوجود کسی "من دونِ حقیقت" مقام سے مطمئن نہ ہوتا۔ لہٰذا منزل سے ورے اس کا قدم رُک ہی نہ سکتا۔

تلاشِ حقیقت کی یہی خلش و کاوش اور تب و تاب تھی جو حضرت مسیحؑ کو (غالباً) ان وادیوں میں کھینچ کر لے گئی جہاں (اُس زمانہ کے فی الجملہ) بہترین افراد، بقدرِ ظرف مصروفِ تجسّس تھے۔ تا آنکہ وحیِ خداوندی نے آپ کا ہاتھ پکڑ کر اس مقام پر پہنچا دیا جہاں کوئی انسان اپنی سعی و عمل اور کسب و ہنر سے نہیں پہنچ سکتا۔ یہ تھی وہ منزل جسے لوقا نے "خود تعلیم دینے کا مقام" اور انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مضمون نگار نے "پبلک لائف" کا آغاز قرار دیا ہے۔ سچ ہے۔

فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست

رسالت

یہ تو صرف قرآنِ کریم ہے جو ان مقامات کا صحیح تعارف کرا سکتا ہے کیونکہ مقامِ نبوّت و رسالت کی صحیح لِم اور کیفیت سے وہی ذات واقف ہو سکتی ہے جس سے یہ شرف و مجد عنایت ہوتا ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں ہے۔

وَ یُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِیْلَ ۝ وَ رَسُوْلًا اِلٰی بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ ۝ (۴۸ــ۳/۴۷) نیز ۵/۴۶؛ ۲۷ــ۵۷/۲۶)

اور (اے مریم!) اللہ اُس (ہونے والے لڑکے) کو کتاب اور حکمت کا علم عطا فرمائے گا، نیز تورات اور انجیل کا اور اسے بنی اسرائیل کی طرف بہ حیثیت رسول بھیجا جائے گا۔

یوحنا سے تعارف

ہم نے جو کچھ اوپر لکھا ہے اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ مصر میں ایسینی فرقے سے متمسک ہوئے لیکن (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) رینان کا خیال ہے کہ آپ مصر کی جانب تشریف نہیں لے گئے بلکہ ناصرہ سے قانا کی طرف منتقل ہو گئے تھے[1]۔ اس لئے آپ کا ایسینی فرقے سے تمسک بھی فلسطین کے گرد و پیش کے صحراؤں

(۱ے فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

میں ہی ہوا۔ اس باب میں رینان کا بیان قابلِ غور ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ

۲۸ئہ کے قریب، تمام فلسطین میں یوحنا نامی ایک نوجوان کی شہرت عام طور پر پھیل گئی۔ یہ ایک نوجوان زاہد تھا جس کا دل جوش و خروش سے بھرپور تھا۔ وہ پجاریوں کے خاندان سے تھا۔ (JUDEA) کے صحرا کے قریب اس کا مسکن تھا۔ بچپن ہی سے راہبانہ زندگی کی طرف اس کا میلان تھا۔ اس صحرا میں وہ اس قسم کی تجرد کی زندگی بسر کرتا تھا جیسے ہندوستان کے یوگی۔ کھال یا اونٹ کے بالوں (کے کمبل) اس کا لباس اور شہد اور جنگل کی ٹڈیاں اس کی خوراک۔ کچھ چیلے اس کے گرد و پیش رہتے تھے جو اسی قسم کی مشقت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ایسے ہی سمجھئے جیسے برہمنوں کے گرد (اور چیلے)۔ دراصل یہ ہے کہ یوحنا کی جائے پیدائش کے قریب بحرِ میّت کے مشرقی کنارے پر اسینی فرقہ کے لوگ رہتے تھے (انہی کا اثر یوحنا پر تھا) اندازہ یہ ہے کہ اس فرقہ پر بدھ مت کی تعلیم کا اثر غالب تھا۔ (صفحہ ۹۳ ـ ۹۶)

یہ تھے اسینی فرقہ کے اثرات، فلسطین کے گرد و نواح میں اور ان کی تعلیم کا مرکز یوحنا[1] بپتسمہ دینے والا۔

آگے چل کر رینان لکھتا ہے:۔

اگرچہ یوحنا کی تعلیم کا مرکز (JUDEA) میں تھا لیکن اس کی شہرت بہت جلد گلیل تک بھی جا پہنچی اور اس طرح حضرت مسیح تک۔ اس وقت آپ کی ابتدائی تعلیم کے زیرِ اثر چند ایک لوگ آپ کے گرد جمع ہو چکے تھے .... اس خواہش کے ماتحت کہ ذرا اس شخص کو چل کر دیکھیں تو سہی جس کی تعلیم آپ کی تعلیم سے اس قدر مشابہ تھی۔ آپ اپنے

(گذشتہ صفحہ کا فٹ نوٹ لے)۔ اس نقلِ مکانی کے متعلق قرآنِ کریم کی آیت پہلے لکھی جا چکی ہے۔ اس میں آپ دیکھیں گے کہ قرآنِ کریم نے کسی مقام کا نام نہیں لیا۔ صرف اس مقام کی خصوصیات کا ذکر کیا ہے۔

[1] بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہی یوحنا دراصل حضرت یحییٰؑ ہیں۔ اس صورت میں آپ کی تعلیم کسی غیر خدائی تعلیم سے متاثر نہیں ہو سکتی تھی۔

متبعین سمیت، یوحنا کے پاس تشریف لے گئے۔ (ص ۹۸)

اس کے بعد رینان نے لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کس طرح یوحنا کی تعلیم کے پُرجوش مبلغ بن گئے اور ان دونوں نے اس صحرا میں کیسا انقلاب انگیز نظامِ روحانیت قائم کرلیا۔ یہ سلسلہ اسی طرح آگے بڑھتا گیا تاآنکہ ۲۹ سنہ میں یوحنا کو گرفتار کرلیا گیا۔ اس کے بعد چالیس دن کے ایک خاص چلّہ سے فارغ ہو کر حضرت مسیح مراجعت فرمائے وطن ہوئے۔

اُس وقت کے معاشرہ کی حالت

اب ہمارے سامنے یہ سوال آتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم کس قسم کی تھی۔ لیکن آپ کی تعلیم کی اہمیت واضح طور پر سامنے نہیں آسکتی جب تک یہ نہ دیکھا جائے کہ جس قوم میں آپ کی بعثت ہوئی خود اس کی اُس وقت حالت کیا تھی۔ ظاہر ہے کہ اس قوم سے مراد یہودی (یا بنی اسرائیل) ہیں۔ لیکن اس علاقہ پر حکومت رومیوں کی تھی۔ اس لئے اس پس منظر کو دیکھنے کے لئے ہمیں ایک طرف یہودیوں کی مذہبی زندگی کو سامنے لانا ہوگا اور دوسری طرف، وہاں کے نظامِ حکومت و تمدن اور اندازِ معاشرت و معیشت کو۔ پہلے یہودیوں کی مذہبی زندگی کو دیکھئے۔

اُس زمانے میں یہودی پانچ بڑے بڑے فرقوں میں بٹے ہوئے تھے۔ صدوقی، فریسی، الیسینی، غالی اور سامری۔ ان میں سے صدوقیوں کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ یہ لوگ حکومتِ وقت کے حامی اور صاحبِ حشمت و جاہ تھے۔ مذہبی امور میں انتہائی قدامت پسند تھے اور ہیکل کے احبار و رہبان کی پشت پناہی کرتے تھے۔ توریت میں سے صرف صحفِ موسیٰؑ کو مستند تسلیم کرتے تھے اور باقی سب کتابوں کو محرّف کہتے تھے۔ جیسا کہ حکومت کے طرفدار مذہبی فرقوں کی کیفیت ہوتی ہے، ان کی زندگی عیش پرستی میں گذرتی تھی۔ یہ حیاتِ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے تھے۔ یہی وہ فرقہ تھا جو حضرت عیسیٰؑ کی مخالفت میں پیش پیش تھا۔

صدوقیوں کے مقابلہ میں فریسی فرقہ تھا۔ اس کے متبعین کی تعداد بہت زیادہ تھی اور یہ قدرے وسیع المشرب بھی تھے۔ جاہ و منصب میں ان کا کوئی حصہ نہیں تھا، اس لئے یہ اقتدار کی ہمیشہ مخالفت کرتے تھے، خواہ وہ ہیکل کی مذہبی پیشوائیت کا ہو یا ملک کی حکومت کا۔ ان میں صدوقیوں کے مقابلہ میں خوبیاں زیادہ تھیں لیکن اپنی افضلیت اور برتری کا احساس اس حد تک پہنچ چکا تھا کہ وہ کسی دوسرے

کو خاطر میں ہی نہیں لاتے تھے۔ ان کا یہی بے جا تکبر اور غرور تھا جس کی حضرت عیسےؑ نے سختی سے تنقید کی تھی۔

تیسرا فرقہ ایسینی تھا جس کا تعارف پہلے کرایا جا چکا ہے۔

چوتھا فرقہ غالیین کا تھا۔ انہیں جلیلی بھی کہتے تھے۔ شروع میں یہ ایسینی فرقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن اپنے متشدد نظریات کی بنا پر ان سے الگ ہو گئے۔ حکومت کے معاملہ میں ان کا عقیدہ یہ تھا کہ قیصر کی اطاعت بُت پرستی کے مترادف ہے۔ ان کا خیال تھا کہ قیصر جو مردم شماری کرانا چاہتا ہے اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ انہیں فرداً فرداً اپنی اطاعت پر مجبور کرے گا۔ اس لئے انہوں نے مردم شماری کی مخالفت کی اور حکومت کے خلاف بغاوت پر اُتر آئے۔ چنانچہ حکومت ان کی شورشوں سے ہمیشہ خائف رہتی تھی لیکن ان کی اس انتہا پسندی کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کے دل سے قانون کا احترام ہی اٹھ گیا تھا اور وہ کسی قسم کی حدود قیود کو بطیبِ خاطر گوارا نہیں کرتے تھے۔

سامریوں کا فرقہ، یہودیوں اور اشوریوں پر مشتمل تھا۔ یہ قدیم یہودی مذہب کے خلاف تھے چنانچہ انہوں نے بیت المقدس کے ہیکل کے علی الرغم اپنا ہیکل الگ تعمیر کر رکھا تھا۔ یہ ہمیشہ دوسرے یہودیوں کے خلاف برسرِ پیکار رہتے اور اس وجہ سے ملک میں فساد اور خوں ریزی کا دَور دورہ رہتا۔

یہ تھے یہودیوں کے فرقے۔ لیکن بہ ہیئت مجموعی، یہودی قوم کا مرکز ہیکل ہی تھا اور ہیکل کی حیثیت حکومت کے ایجنٹ کی ہو چکی تھی۔ ہیکل کے فرائض سے عہدہ برآ ہونے کے حقدار صرف وہ کاہن قرار پاتے تھے جو حضرت ہارونؑ کی نسل سے ہوں۔ ان کے سوا یہودیوں کا کوئی قبیلہ ہیکل کا متولی نہیں ہو سکتا تھا۔ ملک کے عوام دوہری غلامی میں ماخوذ تھے، ایک غلامی حکومت کی اور دوسری غلامی ہیکل کی مذہبی پیشوائیت کی۔ اور یہ دونوں حکومتیں خالصتہً استبداد پر مبنی تھیں۔ اس استبداد کا لازمی نتیجہ تھا کہ ان کے ہاں ایک نجات دہندہ کا تصور اُبھرتا۔ چنانچہ یہ نظریہ بڑی شدت سے اُبھرا اور اس نے ایک مستقل عقیدہ کی شکل اختیار کر لی۔ ان کے ہاں "نجات دہندہ" سے مراد ایک مذہبی راہ نما ہی نہیں تھا بلکہ ایک ایسی ہستی تھا جو انہیں حضرت داؤدؑ کی چھنی ہوئی مملکت کو بھی واپس دلا دے۔ اس اعتبار سے ان کے ہاں یہ نظریہ زیادہ شدت سے راسخ تھا کہ آنے والا مسیح بادشاہ

بھی ہوگا۔ زیتون کا تیل ملنا یہودیوں کے ہاں ایک مبارک مذہبی رسم تھی۔ (مسیح کا لفظ مسح سے ماخوذ ہے جس کے معنی جسم پر کوئی چیز ملنے کے ہیں)۔ اس آنے والے کو اسی اعتبار سے مسیح کہا جاتا تھا لیکن اس کی لِم اس سے زیادہ گہری تھی۔ اُس زمانہ میں بادشاہوں کی تاج پوشی کے وقت جو رسوم ادا کی جاتی تھیں ان میں اوّلیں رسم، زیتون کے تیل کا مسح تھا۔ یہودیوں کے ہاں مسح کی رسم اسی فراموش کردہ حقیقت کی یاد دہانی کے لئے تھی کہ آنے والا مسیح، بادشاہ ہوگا اور (حضرت) داؤدؑ کی نسل سے ہوگا۔

(٭)

اب آپ اُس زمانے کی سیاسی، معاشرتی اور معاشی زندگی کی طرف آیئے۔ قیصرؔیوں تو بادشاہ ہی تھا، لیکن اسے مقامِ الوہیت تک پہنچا دیا گیا تھا۔ قیصرِ اعظم آگسٹس کی باقاعدہ پرستش ہوتی تھی۔ اس کے جانشین بھی اسی طرح اپنی پرستش کراتے تھے۔ شاہنشاہ مطلق العنان تھا، اس لئے آئین اور قانون کا نام ہی نام باقی رہ گیا تھا۔ خود ہیرودوس نے اپنی بہن کو اپنی بیوی بنا رکھا تھا اور اس کا خاوند بھی زندہ موجود تھا۔ حکام کا طبقہ عیش و عشرت میں ڈوبا ہوا تھا اور عوام فقر و فاقہ کا شکار ہو رہے تھے۔ فلسطین کا علاقہ قریب بیس برس تک رومیوں اور ایرانیوں کی کشمکش کی آماجگاہ بنا رہا۔ اس سے وہاں کے باشندوں کی جو حالت ہو سکتی ہے، اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہ لوگ خود دو فریقوں میں بٹ گئے تھے ـــــ ایک گروہ رومیوں کا حامی تھا اور دوسرا ایرانیوں کا۔ اور ان کی باہمی مخاصمت اس درجہ شدت اختیار کر گئی تھی کہ اس قدر کشت و خون، بیرونی دشمنوں کی تلوار سے نہیں ہوتا تھا جس قدر باہمی خانہ جنگی میں ہوتا تھا۔ خود مذہبی ادارے بھی اس تفریق کا شکار ہو چکے تھے۔

مختلف قسموں کے ٹیکسوں سے رعایا کا کچومر نکل رہا تھا۔ خود ٹیکس کا جس قدر بوجھ تھا اس سے کئی گنا زیادہ بوجھ ٹیکس وصول کرنے والوں کا تھا۔ ان تمام خرابیوں کی وجہ سے لوگ جس بُری طرح فقر و فاقہ کا شکار اور مختلف بیماریوں میں مبتلا ہو چکے تھے، ان کی تفصیل اناجیل کے مطالعہ سے سامنے آ سکتی ہے۔

یہ تھے مختصراً وہ حالات[1] جن میں حضرت عیسیٰؑ کی بعثت ہوئی تھی۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا

---

[1] اس سلسلہ میں ہم نے عباس محمود العقاد کی کتاب سے بھی استفادہ کیا ہے۔

ہے کہ آپ کی دعوت کیسے عظیم انقلاب کی علمبردار ہوگی اور آپ کو معاشرہ کے کس کس گوشے سے جنگ کرنی پڑی ہوگی. لیکن اناجیل اور دیگر عیسوی لٹریچر میں سیرتِ مسیحؑ کی جو تصویر پیش کی گئی ہے

آپ کی تعلیم کیسی تھی؟

اس سے عام طور پر یہی مترشح ہوتا ہے کہ آپ خود بھی ایک مرنجاں مرنج درویش، تارک الدنیا فقیر اور عاجز و ناتواں زاہدِ گوشہ نشین تھے اور اپنے متبعین کو بھی مسکینی و عاجزی، فروتنی و بے چارگی، محکومیت و مغلوبیت، غربت و افلاس، نکبت و ادبار کی زندگی بسر کرنے کی تلقین کرتے تھے. مثلاً

> اور یسوع نے اپنے شاگردوں سے کہا، میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ دولت مند کا آسمان کی بادشاہت میں داخل ہونا مشکل ہے○ اور پھر تم سے کہتا ہوں کہ اونٹ کا سوئی کے ناکے میں سے نکل جانا اس سے آسان ہے کہ دولت مند خدا کی بادشاہت میں داخل ہو○ شاگرد یہ سنکر بہت ہی حیران ہوئے اور بولے کہ پھر کون نجات پا سکتا ہے؟○
>
> (متی ۲۵-۱۹/۲۳)

اور مندرجہ ذیل وعظ تو دنیا میں بطور ضرب المثل مشہور ہے جسے ہر صاحبِ تغلّب و استیلاء اپنے محکوموں کے لئے بطور افیون استعمال کرتا اور ہر فریب کار اپنے زہر آلود خنجر کو چھپانے کے لئے نرم و نازک ریشمیں رومال کی شکل میں ہاتھ میں رکھتا ہے. یہی وہ نسیم سحری ہے جسے خاص طور پر اس مقصد کے لئے بروئے کار لایا جاتا ہے کہ اس کی تھپکیاں مغلوب و مقہور، کمزور و ناتواں انسانوں کو کبھی خوابِ غلامی و محکومی سے بیدار نہ ہونے دیں، یعنی پہاڑی کا "حسین وجمیل" وعظ، جسے اناجیل نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے.

> تم سُن چکے ہو کہ کہا گیا تھا کہ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت○ لیکن میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ شریر کا مقابلہ نہ کرنا بلکہ جو کوئی تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دے○ اور اگر کوئی تجھ پر نالش کرکے تیرا کرتہ لینا چاہے تو چوغہ بھی اسے لینے دے○ اور جو کوئی تجھے ایک کوس بیگار میں لے جائے اس کے ساتھ دو کوس چلا جا○ جو کوئی تجھ سے مانگے اُسے دے اور جو تجھ سے قرض چاہے اس سے مُنہ نہ موڑ○
>
> (متی ۳۸-۵/۴۲)

اور

تم سُن چکے ہو کہ کہا گیا تھا کہ اپنے پڑوسی سے محبت رکھ اور اپنے دشمن سے عداوت ہ
لیکن میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ اپنے دشمنوں سے محبت رکھو اور اپنے ستانے والوں کے
لئے دعا مانگو تاکہ تم اپنے باپ کے جو آسمان پر ہے بیٹے ٹھہرو۔ کیونکہ وہ اپنے سورج کو بدوں اور
نیکوں دونوں پر چمکاتا ہے اور راست بازوں اور ناراستوں دونوں پر مینہہ برساتا ہے ہ

(متی ۴۳ — ۵/۴۵)

اس میں شُبہ نہیں کہ رافت اور محبت، حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم اور آپ کے متبعین کی نمایاں خصوصیت تھی۔ چنانچہ قرآنِ کریم نے خود اس کی تائید کی ہے اس لئے کہ رافت و محبت کو ہر صحیح تعلیم کا ایک جزو ہونا چاہیئے۔

ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلَىٰٓ اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَ قَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَ اٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ ۙ وَ جَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّ رَحْمَةً ۭ (۵۷/۲۷)

پھر اُن کے بعد ہم نے یکے بعد دیگرے اپنے رسولوں کو بھیجا اور ان کے بعد ہم نے (اپنے رسول) مریم کے بیٹے عیسیٰؑ کو (بھی) بھیجا اور اسے انجیل عطا فرمائی اور ان لوگوں کے دلوں میں جنہوں نے اس کی پیروی کی' ہم نے نرمی اور مہربانی پیدا کر دی۔

لیکن شریر کا مقابلہ نہ کرنا، جو کوئی کرتا لینا چاہے اُسے چغہ اتار کر خود دے دینا، جو ایک کوس بیگار میں لے جائے اس کے ساتھ دو کوس تک چلے جانا، دشمن سے محبت کرنا (انصاف نہیں بلکہ محبت!) کس طرح تعلیم خداوندی ہو سکتی ہے؟ ہر چند یہ الفاظ بڑے خوش آیند اور نگاہ فریب ہیں، لیکن جن کی نگاہیں زندگی کے حقائق پر ہیں، وہ بآسانی سمجھ سکتے ہیں کہ اس قسم کی تعلیم کبھی آسمانی تعلیم نہیں ہو سکتی (تفصیل اس اجمال کی اپنے مقام پر آئے گی)۔ حضرات انبیائے کرامؑ دنیا سے فتنہ و فساد، جور و ستم، ظلم و استبداد، تغلّب و قہرمانیت مٹانے کے لئے آتے تھے اور یہ ظاہر ہے کہ یہ مقصد عظیم شریر کا مقابلہ نہ کرنے اور کُرتہ مانگنے والے کو چغہ اتار کر دے دینے سے حاصل نہیں ہو سکتا۔
تمام سابقہ انبیائے کرامؑ کی تعلیم اور عملی کوائف گذشتہ مجلدات میں آپ کے سامنے آچکے ہیں۔

غور کیجئے کہ کسی ایک مقام پر بھی آپ کو یہ تعلیم ملتی ہے! خود اس جمود افزا اور تعطل انگیز وعظ کی ابتدا (جسے حضرت عیسیٰؑ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے) ان الفاظ سے ہوتی ہے کہ "تم سُن چکے ہو کہ کہا گیا تھا کہ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت" اور یہ آپ کو معلوم ہی ہے کہ یہ تعلیم حضرت موسیٰؑ کی ہے جو آج بھی تورات میں موجود ہے، بلکہ اس اضافہ کے ساتھ کہ زخم کے بدلے زخم اور چوٹ کے بدلے چوٹ" (دیکھئے خروج ۲۴ ـــ ۲۵/۲۱)۔ تو حضرت عیسیٰؑ کی طرف منسوب کردہ محولہ بالا تعلیم اس تعلیم کے صریحاً خلاف ہے۔ حالانکہ خود حضرت عیسیٰؑ کا اعلان ہے کہ:

> یہ نہ سمجھو کہ میں توریت یا نبیوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے آیا ہوں۔ منسوخ کرنے نہیں بلکہ پورا کرنے آیا ہوں ۵ کیونکہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب تک آسمان اور زمین ٹل نہ جائیں ایک نقطہ یا ایک شوشہ توریت سے ہرگز نہ ٹلے گا جب تک سب کچھ پورا نہ ہو جائے ۵ پس جو کوئی ان چھوٹے سے چھوٹے حکموں میں سے بھی کسی کو توڑے گا اور یہی آدمیوں کو سکھائے گا وہ آسمان کی بادشاہت میں سب سے چھوٹا کہلائے گا لیکن جو ان پر عمل کرے گا اور ان کی تعلیم دے گا وہ آسمان کی بادشاہت میں بڑا کہلائے گا ۵ کیونکہ میں تم سے کہتا ہوں کہ اگر تمہاری راستبازی فقیہوں اور فریسیوں کی راستبازی سے زیادہ نہ ہوگی تو تم آسمان کی بادشاہت میں ہرگز داخل نہ ہو گے۔ (متی ۲۰ـــ۱۷/۵)

اس سے ظاہر ہے کہ "پہاڑی کے وعظ" کی تعلیم حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم نہیں ہو سکتی بلکہ بعد میں آپ کی طرف منسوب کر کے اناجیل میں شامل کر دی گئی ہے (ایسا کیوں کیا گیا تھا اور اناجیل کب مرتب ہوئی تھیں، ان امور کی تفصیل آگے چل کر ملے گی)۔ قرآن کریم نے جہاں عیسائیوں اور یہودیوں کی دیگر مفتریات کی علانیہ تردید کی وہاں اس حقیقت کا بھی صاف صاف اعلان کر دیا کہ حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم بھی وہی تھی جو انبیاء سابقہ کی تھی اور ان کی بعثت بھی اسی مقصد کے لئے ظہور میں آئی تھی جس کے لئے یہ سلسلۂ رشد و ہدایت قائم کیا گیا تھا، یعنی زمین پر آسمان کی بادشاہت کا قیام۔ آپ نے بھی اسی دعوت کو دہرایا کہ

آپ کی سچی تعلیم کچھ اور تھی

.........فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ٥ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ٥ (۵۰ ـــ ۴۹/۳) نیز (۶۳ ـــ ۶۴/۴۳)

..........تم قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرو اور میری اطاعت کرو۔ یقیناً میرا اور تمہارا پروردگار (وہی) اللہ ہے۔ سو اسی (ایک) کی محکومیت اختیار کرو یہی سیدھی راہ ہے۔

اللہ کی محکومیت اختیار کرو جس کی عملی صورت یہ ہے کہ اس کی حکومت کے مرکزِ اوّلین (داعیٔ انقلاب) مامور من اللہ (رسول) کی اطاعت کرو۔ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ۝ وہی حقیقت کشا اور محکومیت شکن تعلیم جو اس سے پیشتر ہمارے سامنے آتی رہی ہے۔ شرائع سابقہ کے جزئی احکام میں تبدیلیاں ہو سکتی تھیں اور ہوتی چلی آ رہی تھیں، لیکن اس کے اصل الاصول میں حتماً اور یقیناً کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی تھی۔ ہر رسول اسی تعلیم کے اصل و اساس کی تائید و تصدیق کے لئے آتا تھا۔ یہی حضرت عیسیٰؑ نے کیا (دیکھئے ۳/۴۹ ؛ ۵/۴۶ ؛ ۶۱/۶)۔ آپ کی بعثت کی غرض یہ تھی کہ بنی اسرائیل کو وہ راہ دکھائی جائے جس سے وہ اس عذابِ الیم سے نجات حاصل کریں جس کی وجہ سے ذلّت و مسکنت (محکومی اور جمود) کی لعنت ان پر مسلّط ہو رہی تھی۔ یہی آپ کی تعلیم تھی اور یہی وعظ۔ ظاہر ہے کہ اس عظیم المرتبت مقصد کے حصول کے لئے ایک ایسی قوم کی ضرورت تھی جس کے جگر میں خونِ گرم، نگاہوں میں بصیرت، بازوؤں میں قوّت، سر میں سودائے عشق اور دل میں تقوےٰ ہو اور جو بڑی سے بڑی مصیبت کا استقبال نہایت خندہ پیشانی اور تبسم زیرلبی سے کریں۔

انقلاب آفریں جماعت

حضرت عیسیٰؑ تشریف لائے، قوم تک اپنا پیغام پہنچایا لیکن دیکھا کہ قوم راکھ کا ڈھیر بن چکی ہے۔ اب یہی صورت باقی تھی کہ اس راکھ کے نیچے دبی ہوئی چنگاریوں کو یک جا کر کے انہی سے کچھ سامانِ حرارت فراہم کیا جائے۔ آپ نے دعوت دی اور سرفروشوں کی اس جماعت نے بڑھ کر اس پر لبیک کہا۔

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۝ (۳/۵۱)

جب کہ عیسیٰ نے بنی اسرائیل میں اپنی دعوت کے خلاف انکار کا احساس کیا، تو وہ پکار اٹھا "کون ہے جو اللہ کی راہ میں میرا مددگار ہوتا ہے؟ اس پر حواریوں نے (یعنی

چند راستباز انسانوں نے جو مسیح پر ایمان لائے تھے) اس کی دعوت قبول کرتے ہوئے جواب دیا" ہم اللہ کے (کلمۂ حق کے) مددگار ہیں۔ ہم اس پر ایمان لاتے ہیں اور (اے داعیٔ حق) تو گواہ رہیو کہ اس کی فرمانبرداری میں ہمارا سر جھک گیا ہے۔

دوسرے مقام پر ہے۔

وَ اِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِيْ وَ بِرَسُوْلِيْ ۚ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَ اشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ ۝ (۵/۱۱۱)

اور جب میں نے حواریوں کی طرف (یعنی اس جماعت کی طرف جو حضرت مسیح پر ایمان لائی تھی بوساطت عیسیٰ) حکم بھیجا تھا کہ مجھ پر اور میرے رسول (مسیح) پر ایمان لاؤ اور انہوں نے کہا تھا" ہم ایمان لائے اور خدایا! تو گواہ رہیو کہ ہم مسلم (یعنی فرمانبردار) ہیں۔

خدا کے مخلص بندوں کی اس جماعت نے جب اپنے آپ کو اس مقصد کی خاطر یوں وقف کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی معیشت کا ایسا انتظام فرما دیا کہ اس کی فکر ان کی تگ و تاز اور سعی و عمل کی راہ میں دامنگیر نہ ہو۔

اِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ ؕ قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ قَالُوْا نُرِيْدُ اَنْ نَّاْكُلَ مِنْهَا وَ تَطْمَئِنَّ قُلُوْبُنَا وَ نَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَ نَكُوْنَ عَلَيْهَا مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝ (۱۱۲ — ۵/۱۱۳)

اس کے بعد، اس جماعتِ مومنین نے تم سے کہا تھا کہ کیا ہمارا نشوونما دینے والا ہماری اس آرزو کو پوری کر دے گا کہ ہم معاش کے لئے انفرادی سہاروں کے محتاج نہ رہیں اور ہمارے لئے سامان نشوونما خدا کے نظامِ ربوبیت سے ملا کرے — یعنی معیشت کے موجودہ" ارضی نظام" کی جگہ" سماوی نظام" قائم ہو جائے۔ اس کے جواب میں تم نے ان سے کہا تھا کہ جب تم نظامِ خداوندی کی صداقت پر ایمان رکھتے ہو تو تمہیں چاہیئے کہ تم اس کے قوانین کی پوری پوری نگہداشت کرو۔ جب تم ایسا کرو گے تو

اس کا وہ نظام قائم ہو جائے گا جس میں رزق کی ذمہ داری خود نظام کے سر ہوگی، افراد پر نہیں ہوگی۔

انہوں نے کہا کہ ہماری قلبی خواہش یہی ہے کہ ہم بلا منّتِ غیرے نظامِ ربوبیت ہی سے رزق حاصل کریں تاکہ اس طرف سے ہمارے دلوں کو اطمینان حاصل ہو جائے اور ہمیں یقین آجائے کہ جو کچھ تو ہم سے کہتا ہے وہ بالکل سچ ہے اور ہم اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اس کی شہادت دیں۔

مَآئِدَہ کے معنی "مَآئِدَۃً مِّنَ السَّمَآءِ" کے معنی یہ نہیں کہ اوپر سے کوئی چنا چنایا خوان اترتا تھا۔ بلکہ جیسا کہ صحرائے سینا میں بنی اسرائیل کے لئے انتظام ہوا تھا یا جیسا نظامِ ربوبیت کی رُو سے ہوتا ہے، اسی قسم کا انتظام اس جماعتِ مومنین کے لئے کیا گیا تھا۔

قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ اللّٰھُمَّ رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَیْنَا مَآئِدَۃً مِّنَ السَّمَآءِ تَکُوْنُ لَنَا عِیْدًا لِّاَوَّلِنَا وَ اٰخِرِنَا وَ اٰیَۃً مِّنْکَ ۚ وَارْزُقْنَا وَ اَنْتَ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ ○ قَالَ اللّٰہُ اِنِّیْ مُنَزِّلُھَا عَلَیْکُمْ ۚ فَمَنْ یَّکْفُرْ بَعْدُ مِنْکُمْ فَاِنِّیْۤ اُعَذِّبُہٗ عَذَابًا لَّاۤ اُعَذِّبُہٗۤ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ ○ (۵/۱۱۵-۱۱۴)

اس پر تم نے (اے عیسیٰؑ!) ہمارے حضور التجا کی تھی کہ اے ہمارے پروردگار! ہماری نشوونما کا سامان 'نظامِ ربوبیت کی رُو سے عطا ہو جائے تاکہ یہ چیز' اس جماعت کے السابقون الاوّلون (سب سے پہلے ایمان لانے والوں) کے لئے جشنِ مسرت کا بھی موجب ہو اور ان کے بعد آنے والوں کے لئے بھی۔ نیز یہ تیرے قانون کی صداقت کی عملی نشانی بن جائے۔ تو ہمیں اس طرح سامانِ زیست عطا فرما۔ اس لئے کہ جو رزق تیرے نظام کی رُو سے ملے وہ اس سے کہیں بہتر ہوتا ہے جو انسانوں کی وساطت سے حاصل ہو (انسانوں کے ہاتھ سے ملنے والے رزق سے تو پرواز میں سخت کوتاہی آجاتی ہے ۔۔۔ اس رزق سے تو موت اچھی ہے)۔

اس پر ہم نے کہا تھا کہ ہم تمہارے رزق کا اسی طرح انتظام کردیں گے۔ لیکن اپنے متبعین سے کہہ دو کہ اگر تم نے اس نظام کی صحیح صحیح قدردانی نہ کی اور جن بنیادوں پر اسے قائم کیا گیا ہے، تم اُن سے پھر گئے، تو اس کی ایسی سخت سزا ملے گی جو دنیا میں کسی اور قوم کو نہ ملی ہو۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک میں ایسے لوگ بھی موجود تھے جو اس جماعت میں کھلے بندوں شامل تو نہ تھے لیکن انہیں ان کے مشن سے ہمدردی پیدا ہو چکی تھی اور مؤیدین کی یہ جماعت، مجاہدین کی جماعت کی ضروریاتِ زندگی کی کفیل تھی[1]۔ مجاہدین کی یہی جماعت تھی جسے مسلمانوں کے لئے بطور نمونہ پیش کیا گیا ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْۤا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ فَاٰمَنَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ وَ كَفَرَتْ طَّآئِفَةٌ ۚ فَاَيَّدْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلٰى عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِيْنَ ○ (۶۱/۱۴)

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! (نظامِ خداوندی کے قیام و استحکام کے لئے رسول کے) مددگار بن جاؤ (بالکل اسی طرح) جیسے مریم کے بیٹے عیسےٰ نے حواریوں سے (خطاب کرکے) کہا تھا "خدا (کے دین) کی طرف میرا کون مددگار ہے؟" تو حواریوں نے کہا تھا "ہم اللہ کے (دین کے) مددگار ہیں. چنانچہ (اُن کی کوششوں سے) بنی اسرائیل کی ایک جماعت

---

[1] اناجیل میں "عشائے ربّانی" کے متعلق جو کچھ آیا ہے اس کا اس واقعہ سے کچھ تعلق نہیں. عشائے ربانی وہ آخری کھانا تھا جو حضرت عیسیٰؑ نے اپنے حواریوں کے ساتھ کھایا اور جس میں یسوع نے روٹی لی اور برکت چاہ کر توڑی اور شاگردوں کو دے کر کہا کہ لو کھاؤ یہ میرا بدن ہے. پھر پیالہ لے کر شکر کیا اور انہیں دے کر کہا کہ تم سب اس میں سے پی لو کیونکہ یہ عہد کا میرا وہ خون ہے جو بہتیروں کے لئے گناہوں کی معافی کے لئے بہایا جاتا ہے." (متی ۲۶/۲۹-۲۶)

عیسائیت میں اس عشائے ربّانی نے عجیب و غریب معتقدات کی شکل اختیار کرلی ہے۔

ایمان لے آئی اور ایک جماعت (پھر بھی) انکار پر جمی رہی۔ بالآخر ہم نے اُن کے دشمنوں کے برخلاف، پیروانِ دعوتِ ایمانی کی تائید کے سامان کر دیئے اور نتیجہ یہ ہوا کہ وہ (ان پر) غالب آگئے۔

ان حواریوں کے متعلق اناجیل کی تصریحات

ان حقائق سے آپ خود اندازہ لگا لیجئے کہ یہ جماعت کس قسم کی تھی اور ان کے پیشِ نظر کونسا عظیم الشان مقصد تھا۔ یہ تو قرآنِ کریم کا بیان ہے۔ اب اس کے مقابلے میں ان ہی حواریوں کے متعلق اناجیل کا بیان دیکھئے اور پھر غور کیجئے کہ کونسی تعلیم آسمانی ہو سکتی ہے؟ اناجیل کی رُو سے، ان حواریوں (شاگردوں) کی تعداد بارہ تھی جن میں پطرس بہت زیادہ مقرب نظر آتا ہے۔ لیکن اس پطرس کے متعلق متی کی انجیل میں لکھا ہے۔

> اس وقت سے یسوعؑ اپنے شاگردوں پر ظاہر کرنے لگا کہ مجھے ضرور ہے کہ یروشلم کو جاؤں اور بزرگوں اور سردار کاہنوں اور فقیہوں کی طرف سے بہت دکھ اٹھاؤں اور قتل کیا جاؤں اور تیسرے دن جی اٹھوں ۵ اس پر پطرس اس کو الگ لے جا کر اسے ملامت کرنے لگا کہ اے خداوند، خدا نہ کرے۔ یہ تجھ پر ہرگز نہیں ہونے کا ۵ اس نے پھر کر پطرس سے کہا اے شیطان میرے سامنے سے دُور ہو تو میرے لئے ٹھوکر کا باعث ہے کیونکہ تو خدا کی باتوں کا نہیں بلکہ آدمیوں کی باتوں کا خیال رکھتا ہے ۵　　　(متی ۲۱-۲۳/۱۶)

اسی انجیل کے چھبیسویں باب میں ہے کہ جب حضرت عیسیٰؑ کو یہودیوں کی صدر عدالت میں پیش کیا گیا تو آپ کے حواریوں کی بھی تلاش ہوئی۔ جب پطرس سے پوچھا گیا کہ وہ جنابِ مسیحؑ کو جانتا ہے تو اس نے صاف انکار کر دیا۔

> اور پطرس باہر صحن میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک لونڈی اس کے پاس آ کر بولی تو بھی یسوعؑ گلیلی کے ساتھ تھا ۵ اس نے سب کے سامنے یہ کہہ کر انکار کیا کہ میں نہیں جانتا تو کیا کہتی ہے ۵ اور جب وہ ڈیوڑھی میں چلا گیا تو دوسری نے اسے دیکھا اور جو وہاں تھے ان سے کہا یہ بھی یسوعؑ ناصری کے ساتھ تھا ۵ اس نے قسم کھا کر پھر انکار کیا کہ میں اس آدمی کو نہیں جانتا ۵ تھوڑی دیر کے بعد جو وہاں کھڑے تھے انہوں نے پطرس کے پاس آ کر کہا کہ بے شک تو بھی ان میں

سے ہے کیونکہ تیری بولی سے بھی ظاہر ہوتا ہے ٭ اس پر وہ لعنت کرنے اور قسم کھانے لگا
کہ میں اس آدمی کو نہیں جانتا اور فی الفور مرغ نے بانگ دی ٭ (متی ۶۹ - ۷۴/۲۶)

حالانکہ اس نے وعدہ کیا تھا کہ" اگر تیرے (حضرت مسیحؑ کے) ساتھ مجھے مرنا بھی پڑے تو بھی تیرا ہرگز انکار نہیں کروں گا اور سب شاگردوں نے بھی اسی طرح کہا" (متی ۲۶/۳۵)۔ ایک اور شاگرد' یہودا تھا جس نے (اناجیل کے بیان کے مطابق) چند سکّوں کے عوض غدّاری کی اور یہودیوں سے سازش کر کے حضرت عیسیٰؑ کو گرفتار کرا دیا۔ باقی رہے دس، سو ان کے متعلق لکھا ہے کہ جب حضرت مسیحؑ کی گرفتاری کا وقت آیا تو اس پر سارے شاگرد اسے چھوڑ کر بھاگ گئے[1]" (متی ۲۶/۵۶)۔ یہ ہیں وہ" شاگرد" جنہیں عیسائیت میں "رسول" مانا جاتا ہے، جو اناجیل کے مؤلف ہیں اور جن سے مذہب عیسائیت آگے چلتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں ذرا قرآنِ کریم کی کشادہ دامنی اور اظہارِ حقیقت پر غور فرمایئے کہ اس نے انہی حواریوں کی سیرت کس قدر بلند پیش کی ہے۔ یہ اس لئے کہ (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) قرآنِ کریم کی رُو سے یہ انبیاءِ کرامؑ اور ان کی مومن جماعتیں کوئی غیر نہ تھے، ایک ہی تسبیح کے دانے اور ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں تھیں۔

ایسی تصویر کیوں؟

تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی کہ حضرت عیسیٰؑ اور ان کی جماعت کی صحیح تصویر وہ نہیں جو اناجیل میں ملتی ہے اور جس کی رُو سے یہ حضرات مفلوک الحال فقیروں کی در بدر پھرنے والی ٹولی سے زیادہ کچھ نظر نہیں آتے۔ اناجیل میں ایسی تصویر کیوں پیش کی گئی ہے، اس کی وجہ بادنیٰ تدبّر سمجھ میں آسکتی ہے۔ جیسا کہ ذرا آگے چل کر معلوم ہوگا، حضرت عیسیٰؑ پر حکومت کے باغی ہونے کا الزام لگایا گیا اور اس جرم کے لئے ان پر مقدمہ چلایا گیا اور (اناجیل کی رُو سے) سزائے موت دی گئی۔ اس تمام کارروائی میں خود بنی اسرائیل (یہودیوں) کے اربابِ حل و عقد شامل تھے بلکہ انہی کی سازش اور اشتعال سے حکومت نے ایسا اقدام بھی کیا تھا۔ ورنہ اگر یہ شوریدہ بخت قوم خدا کے اس برگزیدہ رسول کا ساتھ دیتی تو مستبد رومیوں کی سلطنت کا تختہ اُلٹ جاتا اور بنی اسرائیل کی چھنی ہوئی عظمت اور لٹی ہوئی سطوت و حکومت پھر سے واپس مل جاتی۔

---

[1] اناجیل میں اس قسم کی باتیں کیوں داخل کی گئیں، اس کی وجہ چند سطور آگے چل کر ملے گی۔

حضرت عیسیٰؑ کی تبلیغ کو ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ یہودیوں کی مخالفت نے انتہائی شدت اختیار کر لی اور ان کے احبار و رہبان نے رومی حکام سے ساز باز کر کے اس تحریک کو کچلنے اور ختم کرنے کی ٹھان لی حالانکہ یہودیوں کا عقیدہ تھا کہ "یہوا" (خدا) کے سوا حقِ حکومت کسی کو حاصل نہیں۔ اور وہ ایک ایسے نجات دہندہ کی آمد کے منتظر تھے جو یہوا کی اس حکومت کو عملاً قائم کر کے دکھائے۔ لیکن بُرا ہو مذہبی پیشوائیت کا کہ وہ محض اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے اس انقلابی تحریک کی مخالف ہو گئی اور حکومت کے ساتھ مل کر اسے کچلنے کے درپے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت عیسیٰؑ کے متبعین کی جماعت ہنوز ابتدائی حالت میں تھی کہ یہ حکومت کے زیرِ عتاب آ گئی۔ اب ظاہر ہے کہ اس انقلابی جماعت کا اس طرح شیرازہ بکھرنے کے بعد، حکومت (اور یہودیوں) کی طرف سے ان پر کیا کیا سختیاں نہ کی گئی ہوں گی؟ اس وقت محض عیسائی ہونا ہی ایک سنگین جرم سمجھا جاتا ہو گا! یہی وجہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے بعد اس جماعت کے اراکین کی کوئی تفصیلی تاریخ نہیں ملتی۔ اس ابتلاء اور سختی کے زمانہ میں ان کے بہی خواہوں کی سب سے بڑی خواہش (اور کوشش) یہی ہو گی کہ ان کی طرف سے حکومت کے دل میں جو شبہات پیدا ہو چکے تھے، انھیں کسی نہ کسی طرح رفع کر دیا جائے۔ اس مقصد کے پیشِ نظر سب سے بہتر طریق کار یہی ہو سکتا تھا کہ ان کے متعلق یہ ظاہر کیا جاتا یہ تو بیچارے مرنجاں مرنج درویشوں کی ایک کمزور و ناتواں سی جماعت تھی جسے حکومت و ثروت سے کچھ علاقہ نہ تھا۔ "دشمن سے محبت کرو۔ شریر سے انتقام نہ لو۔ جو کُرتہ مانگے اسے چُغہ بھی اتار کر دے دو۔" یہ تھی ان غریبوں کی تعلیم اور "کوئی دولت مند خدا کی بادشاہت میں بار نہیں پا سکتا"، یہ تھا ان کا مسلک۔ اس سے ثابت کیا جاتا ہو گا کہ جو جماعت "ایک گال پر طمانچہ کھا کر دوسرا گال سامنے کر دینے" کی روش پر ایمان رکھے، اس کے متعلق یہ شبہ کرنا کہ وہ حکومت سے برسرِ پیکار ہونا چاہتی تھی، محض اتہام اور بہتان تراشی ہے۔ اس مقصد کے پیشِ نظر "خدا کی بادشاہت" اور "آسمانی حکومت" کے الفاظ کی بھی ایسی تاویلیں کی جاتی ہوں گی جن سے یہ ظاہر ہو کہ اس سے مفہوم محض روحانی بادشاہت ہے، دنیاوی حکومت سے اسے کچھ علاقہ نہیں۔ اسی غرض سے مذہب اور سیاست اور دین اور دنیا کو دو الگ الگ شعبے قرار دیا گیا اور حضرت مسیحؑ کی طرف اس قسم کے واقعات منسوب کئے گئے جن سے ظاہر ہو کہ وہ سیاست اور حکومت کے معاملات میں کبھی دخیل نہیں ہونا چاہتے تھے۔ متی کی انجیل میں ہے۔

اس وقت فریسیوں نے جا کر مشورہ کیا کہ اسے کیونکر باتوں میں پھنسائیں ہ پس انہوں نے اپنے شاگردوں کو ہیرودیوں کے ساتھ اس کے پاس بھیجا اور انہوں نے کہا اے اُستاد ہم جانتے ہیں کہ تو سچا ہے اور سچائی سے خدا کی راہ کی تعلیم دیتا ہے اور کسی کی پرواہ نہیں کرتا کیونکہ تو کسی آدمی کا طرفدار نہیں ہ پس ہمیں بتا. تو کیا سمجھتا ہے؟ قیصر کو جزیہ دینا روا ہے یا نہیں ہ یسوع نے ان کی شرارت جان کر کہا اے ریاکارو مجھے کیوں آزماتے ہو؟ جزیہ کا سکّہ مجھے دکھاؤ۔ وہ ایک دینار اس کے پاس لے گئے ہ اس نے ان سے کہا۔ یہ صورت اور نام کس کا ہے ہ انہوں نے اس سے کہا قیصر کا۔ اس پر اس نے ان سے کہا پس جو قیصر کا ہے قیصر کو اور جو خدا کا ہے خدا کو ادا کرو ہ انہوں نے یہ سنکر تعجب کیا اور اسے چھوڑ کر چلے گئے ہ (متی ۱۵ – ۲۲/۲۱)

لیکن ذرا غور سے دیکھئے تو نظر آجائے گا کہ خود یہی واقعات حقیقت کی غمازی کر رہے ہیں. اس لئے کہ جب حضرت مسیحؑ کو معاملاتِ حکومت و سیاست سے کچھ واسطہ نہ تھا تو ان سے ان معاملات کے متعلق استفسار و استصواب کا سوال ہی پیدا نہیں ہونا چاہیئے تھا. ایک تارک الدنیا جوگی سے کون پوچھتا ہے کہ حکومت کو ٹیکس دینا چاہیئے یا نہیں؟ بہرحال یہ ہیں وہ قرآئن جن سے مترشح ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ اور آپ کی جماعت کی طرف اس قسم کی تعلیم اور ایسے واقعات کیوں منسوب کئے گئے. لیکن خود اناجیل

حقیقت کی چلمنی جھلک

میں ایسی شہادات بھی موجود ہیں جن سے اصل حقیقت کی کچھ جھلک سامنے آجاتی ہے[1]. یہ ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰؑ صرف بنی اسرائیل کی

---

[1] اناجیل اربعہ ۶۵ء سے ۱۰۰ء تک کے زمانہ میں مرتب کی گئیں، یعنی جب حالات نے ذرا مساعدت کی اور اس جماعت کے منتشر افراد کو قدرے سکون میسر ہوا، اس وقت جو جو روایات حضرت مسیحؑ کی طرف منسوب کی جاتی تھیں انہیں اکٹھا کیا گیا. روایات کے ان مجموعوں کا نام اناجیل ہے. ظاہر ہے کہ ان میں وہ باتیں بھی ہوں گی جن کے متعلق حواریوں کو خود علم ہوگا اور وہ بھی جو اس وقت زبان زدِ خلائق ہوں گی اور جنہیں بہ تقاضائے مصلحت (جس کا ذکر پہلے لکھا جا چکا ہے) ان میں شامل کرنا ضروری سمجھا گیا. شروع شروع میں وہی فروتنی اور بے کسی کی روایات داخل کی گئی ہوں گی. بعد میں جب حالات بہتر ہوتے گئے تو اصل تعلیم اور واقعات کا بھی اضافہ ہوتا گیا. اناجیل سب قیاسی ہیں یقینی کوئی نہیں۔

طرف مبعوث ہوئے تھے۔ متی میں ہے۔

ان بارہ کو یسوع نے بھیجا اور انہیں حکم دے کے کہا غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا۔ بلکہ اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا۔

(متی ۶ — ۱۰/۵)

خود قرآنِ کریم بھی اس پر شاہد ہے جہاں فرمایا کہ

وَ رَسُوۡلًا اِلٰی بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ ۬ۙ (۳/۴۸) (۶۱/۶)

بنی اسرائیل کی طرف رسول۔

اور یہ کوئی نئی بات نہیں۔ ہم اس سے بیشتر (سابقہ مجلدات میں) دیکھتے چلے آرہے ہیں کہ تمام انبیائے سابقہ کسی نہ کسی خاص قوم کی طرف مبعوث ہوتے تھے۔ عالمگیر بعثت تو اس رسول خاتم الانبیاء ہی کی ہے جو خدا کا آخری اور مکمل پیغام لے کر آیا اور یوں سلسلۂ نبوت قیامت تک کے لئے مکمل و مختتم ہوگیا۔ بہرحال، حضرت عیسیٰؑ بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کی طرف مبعوث ہوئے تھے اور بنی اسرائیل کی جو حالت اُس زمانہ میں ہو چکی تھی، تاریخ اس پر شاہد ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ رومیوں کی حکومت میں یہودیوں کو عبادت اور مذہبی رسوم کی آزادی حاصل تھی۔ حتیٰ کہ حضرت عیسیٰؑ کا مقدمہ بھی پہلے یہودیوں ہی کی عدالت میں پیش ہوا تھا۔ یہودیوں میں جس چیز کی کمی تھی وہ یہی تھی کہ ان پر خدا کی بجائے انسانی قوانین کی حکومت مسلط تھی، یعنی ایک طرف ان کے احبار و رہبان کے قوانین کی حکومت ان کے قلب و دماغ پر اور دوسری طرف رومیوں کی حکومت ملک و وطن پر۔ حضرت مسیحؑ کی بعثت کی غرض یہی تھی کہ اس خدافراموش اور محکوم و مغلوب قوم کو روح اور بدن دونوں کی غلامی سے نجات دلا کر آزادی کا صحیح راستہ دکھایا جائے۔ مسٹر (CECIL ROTH) اپنی مشہور کتاب A SHORT HISROTY OF THE JEWISH PEOPLE میں لکھتا ہے۔

آپ حکومتِ الٰہیہ کا قیام چاہتے تھے

(حضرت مسیح) ان لوگوں میں سے تھے جنہیں رومی اربابِ حکومت نے اس جرم کی پاداش میں حوالۂ دار و رسن کر دیا کہ انہوں نے اپنی قوم کے حقوق و مفاد کی بازیابی کی جرأت کی تھی۔ (حضرت یسوعؑ) کے سامنے دو مقاصد تھے۔ ایک طرف آپ اس مسیحِ موعود ہونے

کے مدعی تھے جسے بنی اسرائیل کو غیروں کی غلامی اور محکومی سے چھڑانے کے لئے آنا تھا اور دوسری طرف انہیں ان اخلاقی اور معاشرتی ضوابط کی پابندی کرانی تھی جو بنی اسرائیل کے مصلحین کی نمایاں خصوصیت تھی۔

یعنی ایک طرف بنی اسرائیل کو رومیوں کی غلامی و محکومی سے نجات دلانا اور دوسری طرف ان کے معاشرہ کو قوانینِ خداوندی کے خطوط پر متشکل کرنا۔ یہ تھی غایت حضرت مسیحؑ کی بعثتِ مقدسہ کی۔ حقیقت یہ ہے کہ جس شدت و تکرار سے "خدا کی بادشاہت" کا اعلان حضرت مسیحؑ کی زبانِ اقدس سے ہوا ہے، آپ سے پیشتر (کتبِ تورات میں) اس انداز سے کہیں نہیں ملتا۔ اس حقیقت کو انجیل برناباس بڑے واضح الفاظ میں بیان کرتی ہے۔ اس کی فصل صـ۱۳۸ میں ہے۔ "تب ملک کے لوگوں نے آپس میں صلاح کی کہ یسوع کو اپنا بادشاہ بنانا چاہیئے۔" اس سے آگے فصل صـ۱۳۹ میں ہے کہ حضرت مسیحؑ نے فرمایا کہ

> عنقریب کاہنوں کے سردار اور قوم کے شیوخ مجھ پر اُٹھ کھڑے ہوں گے اور رومی حاکم میرے قتل کا حکم طلب کریں گے۔ کیونکہ وہ ڈرتے ہیں کہ میں بنی اسرائیل کا ملک غصب کرلوں گا۔

رومی حاکم تو خائف تھے کہ وہ سمجھتے تھے کہ اس طرح ان کے ہاتھ سے حکومت چھن جائے گی۔ لیکن یہودی

احبار و رہبان بھی اِسی لئے مخالف تھے

علماء و مشائخ کو بھی ان سے کچھ کم خوف و ہراس نہ تھا۔ اس لئے کہ "خدا کی بادشاہت" میں جہاں قیصریت کا کچھ کام نہیں، وہاں پاپائیت (براہمنیت) کا بھی کچھ علاقہ نہیں۔ اس "ملکِ عظیم" سے ان دونوں طاغوتی طاقتوں کو نکلنا ہوتا ہے۔ اس لئے یہودی احبار و رہبان بھی حضرت مسیحؑ کی مخالفت پر تلے بیٹھے تھے۔ انجیل برناباس کی فصل صـ۱۴۲ میں ہے۔

> تب ان لوگوں نے کاہنوں کے سردار کے ساتھ مشورہ کیا اور کہا "اگر یہ آدمی بادشاہ ہوگیا تو ہم کیا کریں گے۔ البتہ یہ ہم پر بڑی مصیبت ہوگی اس لئے کہ وہ اللہ کی عبادت میں قدیم طریقے کے موافق اصلاح کرنا چاہتا ہے۔ کیونکہ ہماری تقالید (رسومات) باطل سے اُس کی نبھ نہیں سکتی۔ تب اس جیسے آدمی کی حکومت کے ماتحت ہمارا کیا انجام ہوگا؟ یقیناً ہم اور ہماری اولاد (سب) تباہ ہو جائیں گے اس لئے کہ ہم اپنی خدمت سے نکال دیئے جائیں گے تو ہم مجبور ہوں گے کہ اپنی روٹی عطیہ کے طور پر مانگیں۔

حالانکہ اس وقت یہ خدا کا شکر ہے کہ ہمارا ایک بادشاہ اور ایک حاکم دونوں ہماری شریعت سے اجنبی ہیں اور ہماری شریعت کی کوئی پرواہ کرنے والے نہیں، جیسے کہ ہم ان کی شریعت کی کچھ پرواہ نہیں کرتے اور اسی سبب سے ہم قدرت رکھتے ہیں کہ جو چاہیں وہ کریں. پس اگر ہم نے غلطی کی تو ہمارا اللہ رحیم ہے، قربانی اور روزہ کے ساتھ اس کا راضی بنا لینا ممکن ہے. مگر جبکہ یہ آدمی بادشاہ ہو گیا تو ہرگز نہ راضی بنایا جا سکے گا مگر جبکہ اللہ کی عبادت ویسے ہی ہوتے دیکھے جیسی کہ موسیٰؑ نے لکھی ہے. (انجیل برناباس فصل ص۱۴۲)

کیا اس سے بڑھ کر کسی اور شہادت کی بھی ضرورت ہے اس حقیقت کے ثابت کرنے کے لئے کہ حضرت مسیحؑ کا مقصدِ رسالت کیا تھا؟ حتیٰ کہ آخری وقت تک ان لوگوں کو یہی خیال دامنگیر تھا کہ "اگر اسے زندہ چھوڑ دیا گیا اور اس نے اپنے کو بادشاہ بنا لیا تو پھر کیا نتیجہ ہوگا؟" (انجیل برناباس فصل ص۲۰). لیکن آگے بڑھنے سے پیشتر ایک اور شہادت بھی دیکھتے جائیے. انجیل متی میں ہے کہ آپ نے فرمایا.

دعوتِ مسیحیت اور تلوار

یہ نہ سمجھو کہ میں زمین پر صلح کرانے آیا ہوں صلح کرانے نہیں بلکہ تلوار چلوانے آیا ہوں ٥ کیونکہ میں اس لئے آیا ہوں کہ آدمی کو اس کے باپ سے اور بیٹی کو اس کی ماں سے اور بہو کو اس کی ساس سے جدا کر دوں ٥ اور آدمی کے دشمن اس کے گھر ہی کے لوگ ہوں گے ٥ جو کوئی باپ یا ماں کو مجھ سے زیادہ عزیز رکھتا ہے وہ میرے لائق نہیں اور جو کوئی بیٹے یا بیٹی کو مجھ سے زیادہ عزیز رکھتا ہے وہ میرے لائق نہیں ٥ اور جو کوئی اپنی صلیب نہ اٹھائے اور میرے پیچھے نہ چلے وہ میرے لائق نہیں ٥ (متی ۳۴ — ۱۰/۳۸)

غور فرمایا آپ نے کہ یہ کیا تعلیم ہے؟ سب سے پہلے تو وہی اصل الاصول کہ یگانگت اور بیگانگی کا معیار فقط کفر و ایمان ہے، وہی معیار جس کی رُو سے باپ اور بیٹا (واقعۂ حضرت نوحؑ)، بیٹا اور باپ (واقعۂ حضرت ابراہیمؑ)، میاں اور بیوی (واقعۂ حضرت لوطؑ) نے ایک دوسرے سے قطعِ علائق کیا؟ پھر سب سے بڑی بات یہ کہ "یہ نہ سمجھو کہ میں زمین پر صلح کرانے آیا ہوں. صلح کرانے نہیں بلکہ تلوار چلوانے آیا ہوں."

انقلابیوں کی جماعتِ مقدسہ

یہ تھا وہ مقصد جس کے لئے آپ کی بعثت ہوئی. اس مقصد کے لئے حصول کے لئے فدائیوں اور سرفروشوں

کی جس جماعت کا ذکر کیا جا چکا ہے، انہیں قریہ قریہ اور بستی بستی میں اس تعلیم کے عام کرنے کے لئے بھیجا جاتا تھا۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ کن ہدایات کے ساتھ بھیجا جاتا تھا؟ سنیئے۔

ان بارہ کو یسوع نے بھیجا اور انہیں حکم دے کے کہا کہ غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا○ بلکہ اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا○ اور چلتے چلتے یہ منادی کرنا کہ آسمان کی بادشاہت نزدیک آگئی ہے○ بیماروں کو اچھا کرنا۔ مردوں کو جلانا۔ کوڑھیوں کو پاک صاف کرنا۔ بدروحوں کو نکالنا۔ تم نے مفت پایا مفت دینا○ نہ سونا اپنے کمربند میں رکھنا نہ چاندی نہ پیسے○ راستے کے لئے نہ جھولی لینا نہ دو دو کرتے نہ جوتیاں نہ لاٹھی کیونکہ مزدور اپنی خوراک کا حقدار ہے○ اور جس گاؤں یا شہر میں داخل ہونا، دریافت کرنا کہ اس میں کون لائق ہے اور جب تک وہاں سے روانہ نہ ہو اسی کے ہاں رہو○ اور گھر میں داخل ہوتے وقت اسے دعائے خیر دو○ اور اگر وہ گھر لائق ہو تو تمہارا اسلام اسے پہنچے اور اگر لائق نہ ہو تو تمہارا اسلام تم پر پھر آئے○ اور اگر تمہیں کوئی قبول نہ کرے اور تمہاری باتیں نہ سنے تو اس گھر یا اس شہر سے نکلتے وقت اپنے پاؤں کی گرد جھاڑ دو○ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ عدالت کے دن اس شہر کی نسبت سدوم عمورہ کے علاقہ کا حال زیادہ برداشت کے لائق ہوگا○ (متی ۱۵-۵/۱۰)

اس کے بعد فرمایا۔

دیکھو میں تمہیں بھیجتا ہوں گویا بھیڑوں کو بھیڑیوں کے بیچ میں۔ پس سانپوں کی مانند ہوشیار اور کبوتروں کی مانند بھولے بنو○ مگر آدمیوں سے خبردار رہو کیونکہ وہ تمہیں عدالتوں کے حوالے کریں گے اور اپنے عبادت خانوں میں تم کو کوڑے ماریں گے○ اور تم میرے سبب سے حاکموں اور بادشاہوں کے سامنے حاضر کئے جاؤ گے تاکہ ان کے اور غیر قوموں کے لئے گواہی ہو○ لیکن جب وہ تمہیں پکڑوائیں تو فکر نہ کرنا کہ ہم کس طرح کہیں یا کیا کہیں۔ کیونکہ جو کچھ کہنا ہوگا اس گھڑی تمہیں بتایا جائے گا○ کیونکہ بولنے والے تم نہیں بلکہ تمہارے باپ کا روح ہے جو تم میں بولتا ہے○ بھائی کو بھائی قتل کے لئے حوالے کرے گا اور بیٹے کو باپ اور بیٹے اپنے ماں باپ کے برخلاف کھڑے ہو کر انہیں مروا ڈالیں گے○ اور میرے

نام کے باعث سب لوگ تم سے عداوت کریں گے مگر جو آخر تک برداشت کرے گا وہی
نجات پائے گا۰ لیکن جب تمہیں ایک شہر میں ستائیں تو دوسرے کو بھاگ جاؤ کیونکہ میں
تم سے سچ کہتا ہوں کہ تم اسرائیل کے سب شہروں میں نہ پھر چکو گے کہ ابنِ آدم آجائے گا۰
(متی ۱۶ — ۱۰/۲۳)

کیا انقلابی جماعت کے انداز اس سے الگ کچھ اور بھی ہوا کرتے ہیں؟ ہمارا خیال ہے کہ اس کے بعد یہ حقیقت کسی مزید دلیل کی محتاج نہیں رہتی کہ حضرت مسیحؑ کا مقصد بھی اسی قسم کا انقلاب پیدا کرنا تھا جس قسم کا قلبی اور مادی انقلاب اس سے بیشتر ہم حضرت موسیٰؑ کے ہاتھوں رونما ہوتا دیکھ چکے ہیں اور جس انقلاب کا داعی ہر مامور من اللہ ہوتا تھا۔ لیکن ابھی ایک اور شہادت بھی موجود ہے جس کے بعد اس امر کے اثبات کے لئے کسی اور دلیل کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ اُس زمانے میں دستور تھا کہ جسے صلیب دیا جاتا،

ایک حتمی شہادت

اس کا جرم ایک تختی پر لکھ کر اس تختی کو صلیب کے اوپر لٹکا دیا جاتا۔ انجیل کے بیان کے مطابق حضرت مسیحؑ کے ساتھ دو اور مجرم بھی صلیب دیئے گئے تھے۔ اُن کے جرائم کی نوعیت بھی ان کی تختیوں پر لکھ دی گئی تھی۔ تیسری تختی (بقول اناجیل) حضرت مسیحؑ کی تھی۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس تختی پر رومی حاکم نے کیا لکھ کر لٹکایا تھا؟ متی میں ہے، "اس کا الزام لکھ کر اسکے سر سے اوپر لگا دیا کہ

" یہ یہودیوں کا بادشاہ یسوع ہے ۰" (متی ۲۷/۳۷)

اس سے ذرا پہلے ہے کہ واقعۂ تصلیب سے پہلے جب حضرت مسیحؑ رومی سپاہیوں کی حراست میں تھے تو انہوں نے (معاذ اللہ) آپ کا تمسخر اڑایا۔ لیکن اس تمسخر میں کیا کیا؟

اس پر حاکم کے سپاہیوں نے یسوع کو قلعہ میں لیجا کر ساری پلٹن اس کے گرد جمع کی۰ اور اس کے کپڑے اتار کر اسے قرمزی چغہ پہنایا۰ اور کانٹوں کا تاج بنا کر اس کے سر پر رکھا اور ایک سرکنڈا اس کے داہنے ہاتھ میں دیا اور اس کے آگے گھٹنے ٹیک کر اسے ٹھٹھوں میں اڑانے لگے کہ اے یہودیوں کے بادشاہ! آداب۰! اور اس پر تھوکا اور وہی سرکنڈا لے کر اس کے سر پر مارنے لگے۰ اور جب اس کا ٹھٹھہ کر چکے تو چوغے کو اس پر سے اتار کر پھر اسی کے کپڑے اسے پہناتے اور صلیب دینے کو لے گئے ۰ (متی ۲۷ — ۲۷/۳۱)

(Mareello Graveri) جس کی کتاب (The life of Jesus) کا ذکر پہلے آچکا ہے، نے بھی لکھا ہے کہ جب رومی گورنر نے، یہودیوں کے جرگہ سے پوچھا کہ مسیح کا جرم کیا ہے تو انہوں نے کہا کہ

یہ شخص لوگوں سے کہتا ہے کہ قیصر کو خراج مت دو، اور اپنے آپ کو بادشاہ کہتا ہے۔

(صفحہ ۳۸۵)

اس پر گورنر نے پوچھا کہ جس کے متعلق تم کہتے ہو کہ وہ اپنے آپ کو یہودیوں کا بادشاہ کہتا ہے، بتاؤ کہ میں اسے کیا سزا دوں؟ تو انہوں نے کہا کہ اسے صلیب دے دو (صفحہ ۳۹)۔ علاوہ ازیں خود یہودیوں کے ہاں بادشاہ کی تخت نشینی کے وقت اس پر تیل کی مالش کی جاتی تھی اور اس اعتبار سے اُسے مسیح کہا جاتا تھا (جس کے لغوی معنی وہ شخص ہیں جس پر مالش کی جائے)۔ حضرت عیسیٰؑ نے جو اپنا نام یا لقب مسیح قرار دیا تھا تو یہودی اس سے بھی یہی مراد لیتے تھے کہ وہ بادشاہت کا مدعی ہے۔ (ایضاً صفحہ ۵۴، صفحہ ۳۰۸)۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ رومیوں کی نگاہ میں آپ کا جرم کیا تھا؟

دوگونہ مشکلات اس مقصدِ عظیم کو لے کر، حضرت عیسیٰؑ بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہوئے۔ حضرت موسیٰؑ کے سامنے بھی دوہری قسم کی مشکلات تھیں، یعنی فرعون جیسے مجسمۂ استبداد کی قہرمانی قوتیں اور خود اپنی قوم کا ضعفِ خودی۔ لیکن حضرت عیسیٰؑ کی مشکلات ان سے بھی کہیں بڑھ کر تھیں۔ رومی حکومت کا استبداد، فرعونی پنجۂ تظلّم سے کچھ کم نہ تھا۔ لیکن بنی اسرائیل کی طرف سے "بچپن" کی سی ضد اور ہٹ کا مظاہرہ نہ تھا جیسا کہ وہ عہدِ حضرت موسیٰؑ میں کرتے تھے بلکہ رومیوں سے بھی بڑھ کر تزاحم و تصادم کا خطرہ۔ اور سچ پوچھئے تو حضرت مسیحؑ کی منزل کے آخری مراحل میں جو کچھ پیش آیا اس میں رومیوں کی نسبت، یہودیوں کا جوشِ انتقام کہیں زیادہ کارفرما تھا۔ یہودی اپنے انبیاء کی پیشگوئیوں کے مطابق ایک آنے والے نجات دہندہ کے انتظار میں تھے۔ رہبان و رلہبات، خانقاہوں میں معتکف، اس مسیح کی آمد کے لئے خدا کے حضور دعائیں مانگا کرتے تھے۔ لیکن جب حضرت مسیح تشریف لائے تو سب سے پہلے انہی احبار و رہبان نے آپ کا انکار کیا۔ انکار کی وجہ تو پہلے بیان ہو چکی ہے، یعنی وہ دیکھتے تھے کہ جس مسلکِ حیات کی طرف حضرت مسیحؑ دعوت دیتے ہیں، اس میں ان احبا

ورہبان (علماء مشائخ) کی مذہبی سیادت وقیادت چھن جاتی ہے۔ لیکن اس انکار کے لئے توجیہہ یہ پیش کی گئی کہ آنے والا مسیحؑ یروشلم میں کیوں پیدا نہیں ہوا جسے دنیائے مذہب میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ گلیل کے علاقہ میں کیوں پیدا ہوا جہاں کے باشندوں کو یروشلم کے یہودی بہ نگاہِ حقارت دیکھا کرتے تھے۔ (MARTYRDOM OF MAN P. 135) خود انجیل میں ہے کہ

> فلپس نے نتھانیل سے مل کر اس سے کہا کہ جس کا ذکر موسٰے نے توراۃ میں اور نبیوں نے کیا ہے وہ ہم کو مل گیا۔ وہ یوسف کا بیٹا یسوع ناصری ہے۔ نتھانیل نے اس سے کہا کیا ناصرۃ سے کوئی اچھی چیز نکل سکتی ہے؟ (یوحنا ۴۶—۱/۴۵)

رُوح القدس کی تائید

ان مشکلات ومصائب کے نامساعد ماحول میں حضرت مسیحؑ کی پکار اٹھی۔ ظاہر ہے کہ اس جاں گداز اور صبر آزما مہم کے لئے بہت بڑی تائیدِ غیبی کی ضرورت تھی۔ قرآنِ کریم نے اسے "روح القدس" کی تائید کہا ہے۔

وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ وَ قَفَّیْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ز وَ اٰتَیْنَا عِیْسَى ابْنَ مَرْیَمَ الْبَیِّنٰتِ وَ اَیَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ (۲/۸۷)

اور (پھر دیکھو) ہم نے (تمہاری رہنمائی کے لئے پہلے) موسٰے کو کتاب دی۔ پھر موسیٰ کے بعد سلسلۂ ہدایت پے در پے رسولوں کو بھیجکر جاری رکھا۔ بالآخر مریم کے بیٹے عیسیٰ کو سچائی کی روشن نشانیاں دیں اور روح القدس کی تائید سے ممتاز کیا۔

"روح" کے مفہوم کے لئے "ابلیس و آدم" میں "ملائکہ" کا عنوان دیکھئے۔ اس سے مراد وحیِ الٰہی یا وہ ناموسِ اکبر (جبریل) ہے جس کی وساطت سے نزولِ وحی ہوتا تھا۔ دونوں صورتوں میں اس سے مقصود وہ تائیدِ خداوندی ہوگی جو بصورتِ وحی حضرات انبیائے کرامؑ کے شاملِ حال ہوتی تھی اور جس کی رُو سے اپنے نصب العین کی حقانیت اور دعوے کی صداقت ہر قسم کے شک وشبہ سے بالاتر ہو کر سامنے آجاتی ہے اور کبھی پاؤں میں لغزش نہیں پیدا ہونے دیتی۔ باقی رہے بیّنات، سو اس سے وہ واضح دلائل مراد ہیں جن کے ساتھ وحی کو پیش کیا جاتا ہے۔

وَ لَمَّا جَآءَ عِیْسٰى بِالْبَیِّنٰتِ قَالَ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَ لِاُبَیِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِیْ تَخْتَلِفُوْنَ فِیْهِ ۚ فَاتَّقُوا

اللہَ وَ اَطِیۡعُوۡنِ ○ (۴۳/۶۳)

اور جب عیسیٰ واضح دلائل کے ساتھ آیا تو اُس نے (بنی اسرائیل سے) کہا کہ میں تمہارے پاس حکمت (کی باتیں) لے کر آیا ہوں اور اس لئے آیا ہوں، تاکہ ان باتوں کو تمہارے لئے کھول کر بیان کردوں جن میں تم اختلاف کرتے رہتے ہو. لہٰذا قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو اور میری اطاعت کرو!

بیّنات و معجزات یہاں "بیّنات" سے مراد وہ دلائلِ روشن و براہینِ محکم ہیں جو بذریعہ وحی آپ کو دیئے گئے اور جو یکسر حکمت و بصیرت پر مبنی تھی. باقی رہے "معجزات"، سو ان کے متعلق سورۂ آلِ عمران میں ہے کہ حضرت مریمؑ سے کہا گیا کہ تیرا بیٹا جب منصبِ رسالت پر فائز ہوگا تو وہ بنی اسرائیل جیسی مُردہ قوم سے کہے گا کہ

اَنِّیۡ قَدۡ جِئۡتُکُمۡ بِاٰیَۃٍ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ ۙ اَنِّیۡۤ اَخۡلُقُ لَکُمۡ مِّنَ الطِّیۡنِ کَہَیۡـَٔۃِ الطَّیۡرِ فَاَنۡفُخُ فِیۡہِ فَیَکُوۡنُ طَیۡرًۢا بِاِذۡنِ اللّٰہِ ۚ وَ اُبۡرِیُٔ الۡاَکۡمَہَ وَ الۡاَبۡرَصَ وَ اُحۡیِ الۡمَوۡتٰی بِاِذۡنِ اللّٰہِ ۚ وَ اُنَبِّئُکُمۡ بِمَا تَاۡکُلُوۡنَ وَ مَا تَدَّخِرُوۡنَ ۙ فِیۡ بُیُوۡتِکُمۡ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لَّکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ﴿ۚ۴۹﴾ (۳/۴۹ ؛ ۵/۱۱۰)

میں، اس وحی کے ذریعے تمہیں ایسی حیات نو عطا کروں گا جس سے تم اپنی موجودہ پستی (خاک نشینی) سے اُبھر کر فضا کی بلندیوں میں اڑنے کے قابل ہوجاؤ گے اور اس طرح تمہیں فکر و عمل کی رفعتیں نصیب ہوجائیں گی (۷/۱۷۶).

یہ آسمانی روشنی، تمہاری بے نور آنکھوں کو ایسی بصیرت عطا کردے گی جس سے تم زندگی کے صحیح راستے پر چلنے کے قابل ہوجاؤ گے.

اس سے تمہاری قوم کی ویران کھیتی جس پر تر و تازگی کا کوئی نشان باقی نہیں رہا، پھر سے سرسبز و شاداب ہوجائے گی. تمہاری وہ کمینہ خصلتیں دور ہوجائیں گی جن کی وجہ سے تمہیں کوئی اپنے پاس پھٹکنے نہیں دیتا.

مختصراً یہ کہ ذلت و خواری کی وہ موت جو اِس وقت تم پر چاروں طرف سے چھارہی ہے (۳/۱۱۱)

ایک نئی زندگی میں بدل جائے گی (۶/۱۲۲)۔

میں (تمہارے موجودہ نظام سرمایہ داری کی جگہ) ایسا نظام قائم کروں گا جو اس کا جائزہ لیتا رہے گا کہ تم کھانے پینے کی چیزوں میں سے کس قدر اپنے مصرف میں لاتے ہو اور کس قدر ذخیرہ (HOARDING) کرتے ہو کہ اس سے ناجائز نفع کمایا جائے۔

اس قانون اور نظام میں تمہارے لئے باز آفرینی (ایک نئی زندگی حاصل کر لینے) کی بہت بڑی نشانی ہے بشرطیکہ تم اس کی صداقت پر یقین کر لو۔

پہلے لکھا جا چکا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے زمانہ میں ایسینی فرقے نے طبابت اور قوتِ ارادی کے عملیات وغیرہ میں بڑی مہارت حاصل کر رکھی تھی۔ خدمتِ خلق ان کا مسلک تھا جس کی وجہ سے وہ ہر جگہ مقبول تھے۔ ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ جب حضرت عیسیٰؑ اپنے شاگردوں کو تبلیغ کے لئے بھیجتے تھے تو انہیں تاکید کرتے تھے کہ "بیماروں کو اچھا کرنا، مُردوں کو جِلانا، کوڑھیوں کو پاک صاف کرنا، بدروحوں کو نکالنا اور ان تمام خدمات کے معاوضہ میں کچھ نہ لینا۔ تم نے مفت پایا ہے مفت دینا" (متی ۱۰/۸)۔ ظاہر ہے کہ قریہ قریہ بستی بستی، اللہ کا پیغام پہنچانے والوں کے لئے، اپنے زمانہ اور ماحول کے تقاضوں کے اعتبار سے، اس سے بہتر طریق کار اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا اور جب ان شاگردوں میں علاج معالجہ وغیرہ کی یہ خصوصیات تھیں تو جو لوگ خود حضرت عیسیٰؑ کے پاس آتے ہوں گے وہ اس باب میں بہت بڑی توقعات لے کر آتے ہوں گے اور ان کی یہ توقعات پوری بھی ہوتی ہوں گی۔ جہاں تک معجزات کا تعلق ہے، اس سلسلہ میں تفصیلاً "معراجِ انسانیت" میں لکھا گیا ہے۔ وہاں منجملہ دیگر امور، یہ بات بھی سامنے آگئی ہے کہ معجزات کے متعلق گفتگو اب ایک تاریخی بحث ہے۔ اس لئے کہ خود نبی اکرمؐ کو (قرآن کے علاوہ) کوئی حسّی معجزہ نہیں دیا گیا اور حضورؐ کے بعد سلسلۂ نبوّت ہی ختم ہو گیا۔ اس لئے اب کسی کو معجزہ ملنے یا نہ ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جہاں تک سابقہ انبیائے کرامؑ کا تعلق ہے، ایک گروہ معجزات کے متعلق قرآن کے الفاظ کو ان کے حقیقی معانی پر محمول کرتا ہے، اس لئے معجزات کو حسّی معجزات سمجھتا ہے۔ لیکن دوسرا گروہ، ان الفاظ کے مجازی معانی لیتا ہے اور ان سے متعلق بیان کو استعارہ سمجھتا ہے۔ میں نے ان الفاظ کے مجازی معانی لئے ہیں اور انہی کے مطابق "مفہوم القرآن" میں بیان کردہ مفہوم، مندرجہ بالا آیات کے نیچے درج کیا ہے۔ اس مفہوم کی رُو سے حضرت عیسیٰؑ کے معجزات سے مراد ان کے آسمانی پیغام کی اعجاز نمائی ہے جو

مُردوں کی بستی میں صُورِ اسرافیل پھونک دیتا ہے[1] (قرآن نے اکثر مقامات پر غلط روش پر چلنے والوں کو مردے اور آسمانی آواز پر لبیک کہنے والوں کو زندہ انسان کہا ہے)۔ وہ بے بال و پر، کمزور و ضعیف انسانوں کو بازوئے شاہین عطا کر دیتا ہے (کَھَیْئَۃِ الطَّیْرِ) جس سے وہ عروج و اقبال کی فضاؤں میں اڑنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ وہ انقلابی پیغام، ان نیم مُردہ (لیکن زندگی کی آرزو رکھنے والوں) سے علانیہ کہتا ہے کہ

اگر یک قطرہ خوں داری اگر مشتِ پرے داری
بیا من با تو آموزم طریقِ شاہبازی را

وہ آنکھوں پر سے جہل و تعصب کے ظلمت انگیز پردے اٹھا کر نورِ بصیرت عطا کرتا ہے۔ وہ ان کے قلوب کے امراض کو شفا بخشتا ہے اور اس طرح ایک پیکرِ آب و گل کو جیتے جاگتے، تندرست و توانا انسان کی شگفتہ و شاداب صورت عطا کر دیتا ہے[2]۔

باقی رہا وَ اُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَ مَا تَدَّخِرُوْنَ فِيْ بُيُوْتِكُمْ (۳/۴۸)، اس سے یہ مفہوم ہو سکتا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میں وہ احکامِ خداوندی بیان کروں گا جن سے واضح ہو

---

[1] قرآن کریم میں قوموں کی حیاتِ اجتماعیہ کو "زندگی" اور ان کی تباہ حالی کو "موت" سے تعبیر کیا گیا ہے اور رسولوں کی بعثت اس موت کو زندگی میں تبدیل کرنے کے لئے ہوتی ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ۚ (۸/۲۴)

مسلمانو! اللہ اور اس کے رسول کی پکار کا جواب دو، جب وہ تمہیں اس چیز کی طرف دعوت دیتا ہے جو تمہیں زندگی عطا کر دے۔

[2] جن لوگوں میں کوئی عضوی نقص ہوتا یہودی انہیں ناپاک تصور کیا کرتے تھے اور انہیں مذہبی رسومات میں شریک ہونے اور قربان گاہوں میں داخلے کی اجازت نہیں دیتے تھے (دیکھئے احبار ۲۱/۱۷-۲۴)۔ اسی طرح برص کے مریضوں کو بھی ناپاک تصور کیا جاتا تھا (احبار ۱۳-۱/۱۳)۔ حضرت عیسیٰ نے یہودیوں کی ان خود ساختہ پابندیوں کی مخالفت کی تاکہ اس قسم کے مریض پھر سے انسانوں کے زمرہ میں شمار ہونے لگ جائیں۔ اس صورت میں مریضوں کی شفایابی سے یہ بھی مقصود ہو سکتا ہے۔

جائے کہ کن کن چیزوں کا ذخیرہ رکھنا جائز ہے اور کون کونسی چیزیں ایسی ہیں جن میں احتکار و اکتناز جائز نہیں۔

یہ تو رہا قرآن کے متبعین کا مسلک۔ جہاں تک مغرب کے عیسائی مؤرخین اور مفکرین کا تعلق ہے، وہ بیماروں سے متعلق معجزات کو علاج سے تعبیر کرتے ہیں۔ مثلاً ریناں اس باب میں لکھتا ہے:۔

سماریہ میں، جو اس مقام سے جہاں (حضرت) عیسیٰ رہتے تھے تھوڑے سے فاصلہ پر تھا ایک جادوگر رہتا تھا جس کا نام سائمن تھا۔ اس نے اپنی شعبدہ بازیوں سے (لوگوں کی نگاہوں میں) قریب قریب الوہیت کا مقام حاصل کر رکھا تھا۔ (ص ۱۸۹)

اس سے ریناں کا مقصود یہ بتانا ہے کہ اُس زمانے میں سحر و عملیات کا کتنا چرچا تھا۔ پھر وہ لکھتا ہے۔

قریب قریب وہ تمام معجزات جن کے متعلق (حضرت) عیسیٰؑ نے خیال کیا کہ آپ سے سرزد ہوئے ہیں، امراض کے علاج سے متعلق تھے۔ اُس زمانے میں جیسا کہ آج بھی مشرق میں عام طور پر خیال کیا جاتا ہے، علاج الامراض کوئی سائنٹفک شے متصور نہیں ہوتا تھا بلکہ ایسا خیال کیا جاتا تھا گویا کہ وہ علاج کرنے والے کا ذاتی الہام ہے۔ سائنٹفک طریق علاج، جسے پانچ سو سال پیشتر یونانیوں نے ایجاد کیا تھا، اس زمانے میں فلسطین کے یہودی اس سے واقف نہ تھے۔ ان حالات کے ماتحت، کسی بزرگ انسان کا مریضوں کے ساتھ شفقت سے پیش آنا اور انہیں ان کی صحت کا یقین دلا دینا واقعی صحت کا موجب بن جاتا تھا۔ اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ خاص خاص زخموں کو چھوڑ کر، عام امراض میں کسی بزرگ انسان کا مریض کو چھُو دینا، بڑی بڑی دوائیوں جیسا کام کر دیتا ہے! کسی مقدس ہستی کی طرف تو دیکھ لینا ہی شفا بخش دیتا ہے۔ اس کا تو تبسّم ہی امید افزا اور زندگی بخش ہوتا ہے ......
...... جب امراض کے متعلق یہ یقین ہو کہ وہ گناہوں کا نتیجہ ہیں یا بدروحوں کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں (اور طبعی اسباب کی وجہ سے نہیں ہیں)، تو بہترین طبیب وہ مقدس انسان ہوتا ہے جس کا تعلق عالمِ بالا سے ہو۔ (اس زمانے میں) مرگی یا اسی قسم کی اعصابی بیماریاں بدروحوں کی وجہ سے تصوّر کی جاتی تھیں ...... ان حالات میں ہمدردی کے چند جملے بدروح کو نکال دینے کے لئے کافی ہوتے تھے۔ (حضرت) عیسیٰؑ انہی طریقوں سے ایسے

بیماروں کا علاج کرتے تھے۔ (صفحہ ۱۹۰ ـ ۱۹۴)

اس کے بعد رینآن لکھتا ہے کہ جب حضرت عیسیٰؑ سے آپ کے مخالفین کسی معجزہ کا مطالبہ کرتے تو آپ اس سے بہ شدت انکار کر دیا کرتے تھے۔ ایسے معجزات کے متعلق وہ لکھتا ہے کہ "یہ آپ کے شاگردوں کے اضافے ہیں جو اپنے آقا کی صحیح عظمت کا اندازہ نہ لگا سکے اور اسے اس قسم کی چیزوں سے بڑھانا چڑھانا شروع کر دیا۔" (صـ ۱۹۴)۔ اس کے بعد وہ لکھتا ہے کہ آپ کی صحیح عظمت اس انقلابِ عظیم کے اندر پوشیدہ تھی جو آپ کی وجہ سے رونما ہوا۔ یہ وہ انقلاب تھا جسے کوئی جادوگر یا عامل وجود میں نہیں لا سکتا۔

کوئی شعبدہ باز، برنگِ سائنس، وہ اخلاقی انقلاب پیدا نہیں کر سکتا جو (حضرت) عیسیٰؑ نے پیدا کیا۔ (صفحہ ۱۹۵)

اسی طرح E.A. MICKLEM نے اپنی کتاب MIRACLES AND THE NEW PSYCHOLOGY میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ جن بیماریوں کا علاج 'معجزانہ انداز' سے کرتے تھے، وہ دراصل PSYCHOTHERAPY "نفسیاتی طریقِ علاج" تھا جو اس زمانے کے لوگوں کے نزدیک فی الواقع معجزہ تھا۔

اگر یہ طریقِ علاج نفسیاتی ہی تھا تو اس باب میں ہمارا (یعنی قرآن پر ایمان رکھنے والوں کا) عقیدہ ہے کہ اس کے متعلق نہ تو (معاذ اللہ) حضرت عیسیٰؑ خود کسی غلط فہمی کا شکار ہوں گے کہ وہ اسے معجزہ سمجھتے ہوں اور نہ ہی کبھی یہ ہو سکتا ہے کہ وہ اسے معجزہ کہہ کر پیش کرتے ہوں۔ خدا کا رسول، علم اور کیرکٹر دونوں اعتبارات سے اتنا بلند ہوتا ہے کہ وہ اپنے متعلق نہ کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتا ہے اور نہ ہی کبھی غلط بیانی کرتا ہے۔

(٥)

بہر کیف، حضرت عیسیٰؑ تشریف لائے اور با ہمہ جلال و جمال جلوہ افروزِ محفل ہوئے۔ ان کے آبگینۂ سمادی میں زندگی کے تمام سامان موجود تھے لیکن شفا تو اسی مریض کو مل سکتی تھی جو دوائی کا استعمال کرے اور طبیب کی ہدایات پر کاربند ہو۔ جو بیمار طبیبِ مشفق کو دشمنِ جاں اور اس کی دوا کو سامانِ ہلاکت سمجھے اُسے بھلا کس طرح شفا نصیب ہو سکتی ہے؟ یہ یہودی حضرت موسیٰؑ کے زمانے کے بنی اسرائیل نہ تھے کہ

ہر چند اُن سے بچپن کی سی حماقتیں سرزد ہوتی تھیں لیکن دل میں ہنوز کسی کا خوف اور جذبہ تعظیم باقی تھا جس کی وجہ سے وہ دوائی بھی پی لیتے تھے اور (کم از کم، آنکھوں کے سامنے پرہیز بھی کرتے تھے۔ لیکن اب تو ان میں سرکشی و عدوان اور ضد اور تعصب اپنی انتہا تک پہنچ چکا تھا اور اس کا سبب تھے و علماء و مشائخ جنہوں نے اپنی "خدائی" کی مسندیں بچھا رکھی تھیں اور جن کی وجہ سے قوم کے مزاجِ خانقاہی میں اس قدر پختگی اور ان کی خوئے اسلاف پرستی میں ایسی محکمی پیدا ہو چکی تھی کہ وہ اپنے مسلک سے ایک انچ بھی اِدھر اُدھر ہٹنا نہیں چاہتے تھے بغور دیکھئے تو یہودیوں کی اُس وقت کی حالت، اُن کی اسارتِ بابل کے زمانے کی حالت سے بھی بدتر ہو چکی تھی۔ وہ ایک آنے والے نجات دہندہ کے ہمہ تن چشم منتظر تھے۔ لیکن چونکہ تعلیمِ خداوندی پر عمل پیرا ہونے سے ان کی اپنی "خدائی" چھنتی تھی اس لئے علماؔ و مشائخ کے اس رہزنوں کے گروہ نے حضرت عیسیٰؑ کی سخت مخالفت کی اور اس جوشِ مخالفت میں ان حربوں پر اُتر آئے جو فی الحقیقت باعثِ ننگِ انسانیت تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب کسی قوم میں "برہمنیت" پیدا ہو جاتے تو مذہبی سطوت و اقتدار کے "خداوند" اپنی مسانید عظمت و عقیدت کو برقرار رکھنے کے لئے جو کچھ بھی کر گزریں کم ہے۔ انجیل برناباس کا جو اقتباس پہلے دیا جا چکا ہے اسے ایک مرتبہ پھر سامنے لائیے۔ یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ان علمائے یہود کی مخالفت کا جذبۂ محرکہ کیا تھا۔ انہیں خطرہ تھا کہ

یہود کی سرکشی

علماء کی مخالفت

> اگر یہ بادشاہ ہو گیا تو ہم کیا کریں گے۔ البتہ یہ ہم پر بڑی مصیبت ہوگی۔ اس لئے کہ وہ اللہ کی عبادت میں قدیم طریقے کے موافق اصلاح کرنا چاہتا ہے........ اس لئے جب ہم اپنی خدمت سے نکال دیئے جائیں گے تو ہم مجبور ہوں گے کہ اپنی روٹی عطیہ کے طور پر مانگیں۔ (فصل ۱۴۲)

کسی قوم کی تاریخ پر نگاہ ڈالئے۔ یہ حقیقت بے حجابانہ سامنے آجائے گی کہ اس کی غلامی و محکومی کی زنجیریں پختہ سے پختہ تر کرنے کے لئے اُن کے پُرفریب خانقاہ نشینوں اور مسانیدِ علم و ارشاد پر خود غلط تمکّن گزینوں کا کس قدر ہاتھ ہوتا ہے؛ جس قدر بھیانک جرائم ان گوشوں سے نمودار ہوتے ہیں، دنیا کے کسی اور گوشے سے باید و شاید۔ احبار و رہبانِ یہود کی اس تمام سازش اور غداری کو قرآنِ کریم نے ایک جامع لفظ میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے، جہاں فرمایا کہ وَ مَكَرُوْا وَ مَكَرَ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ

خَیْرُ الْمَاکِرِیْنَ ع (۳/۵۴) انہوں نے ایک چال سوچی، ایک خفیہ تدبیر کی۔ یہ فریب کاری کی چال اور غدارانہ تدبیر کیا تھی؟ یہی کہ حکومت کو حضرت عیسیٰؑ کے خلاف مشتعل کر دیا جائے اور یوں اس "خطرہ" سے حفاظت کا سامان پیدا کر لیا جائے! یا للعجب!! متی کی انجیل میں ہے۔

> اس وقت سردار کاہن اور قوم کے بزرگ کائفا نام سردار کاہن کے دیوان خانے میں جمع ہوگئے۰ اور صلاح کی کہ یسوع کو فریب سے پکڑ کر قتل کریں۰ مگر کہتے تھے کہ عید کو نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ لوگوں میں بلوا ہو جائے۰ (متی ۳ـ۵/۲۶)

سنگین سازش

اس کے بعد ہے۔

> اس وقت ان بارہ میں سے ایک نے جس کا نام یہوداہ اسکریوتی تھا سردار کاہنوں کے پاس جا کر کہا تھا کہ اگر میں اسے تمہارے حوالے کرادوں تو مجھے کیا دو گے؟ انہوں نے اسے تیس روپے تول کر دے دیئے۰ اور وہ اس وقت سے اس کے پکڑوانے کا موقع ڈھونڈنے لگا۰ (متی ۱۴ـ۱۶/ ۲۶)

پھر ذرا آگے چل کر مذکور ہے کہ

> اور یسوع کے پکڑنے والے اس کو کائفا نام سردار کاہن کے پاس لے گئے جہاں فقیہہ اور بزرگ جمع ہو گئے تھے۰ اور پطرس فاصلے پر اُس کے پیچھے پیچھے سردار کاہن کے دیوان خانے تک گیا اور اندر جا کر پیادوں کے ساتھ نتیجہ دیکھنے کو بیٹھ گیا۰ اور سردار کاہن اور سارے صدرِ عدالت والے یسوع کو مار ڈالنے کے واسطے اس کے خلاف جھوٹی گواہی ڈھونڈنے لگے۰ مگر نہ پائی گو کہ بہت سے جھوٹے گواہ آئے۔ لیکن آخر کار دو گواہوں نے آکر کہا کہ۰ اس نے کہا ہے میں خدا کے مقدس ہیکل کو ڈھا سکتا اور تین دن میں اسے بنا سکتا ہوں۰ اور سردار کاہن نے اسے کھڑے ہو کر کہا۔ تو جواب نہیں دیتا؟ یہ تیرے خلاف کیا گواہی دیتے ہیں؟۰ مگر یسوع چپکا ہی رہا۔ سردار کاہن نے اس سے کہا میں تجھے زندہ خدا کی قسم دیتا ہوں اگر تو خدا کا بیٹا مسیحؑ ہے تو ہم سے کہہ دے۰ یسوع نے اس سے کہا تو نے خود کہہ دیا بلکہ میں تم سے کہتا ہوں کہ اس کے بعد تم ابنِ آدم کو قادرِ مطلق کی دہنی طرف بیٹھے اور آسمان کے بادلوں پر آتے دیکھو گے۰ اس پر سردار کاہن

نے یہ کہہ کر اپنے کپڑے پھاڑے کہ اس نے کفر بکا ہے۔ اب ہمیں گواہوں کی کیا حاجت رہی؟ دیکھو تم نے ابھی یہ کفر سنا ہے۔ تمہاری کیا رائے ہے؟ انہوں نے جواب میں کہا وہ قتل کے لائق ہے۔ اس پر انہوں نے اس کے منہ پر تھوکا اور اس کے مکّے مارے اور بعض نے طمانچے مار کے کہا۔ اے مسیح ہمیں نبوت سے بتا کہ کس نے تجھے مارا۔

(متی ۵۷ — ۶۸/۲۶)

چنانچہ

جب صبح ہوئی تو سب سردار کاہنوں اور قوم کے بزرگوں نے یسوع کے خلاف مشورہ کیا کہ اسے مار ڈالیں اور اسے باندھ کر لے گئے اور پیلاطس حاکم کے حوالے کیا۔

(متی ا — ۲/۲۷)

اس کے بعد حسبِ بیان اناجیل، حضرت مسیحؑ کو رومی حاکم (پیلاطس) کی عدالت میں پیش کیا گیا اور وہاں سے یہودیوں کے زور دینے پر فتوائے موت صادر ہوا[1] اور یوں بنی اسرائیل کی اس شوریدہ تخت قوم نے اپنی آخری تباہی اور بربادی کے لئے خدا کے غضب و عتاب کو خود اپنے ہاں دعوت دی اور اپنی قبر اپنے ہاتھوں کھودی۔

اس کے بعد واقعۂ تصلیب کے متعلق، اناجیل کے بیانات شروع میں درج کئے جا چکے ہیں۔ ان پر ایک مرتبہ پھر نگاہ ڈال لیجئے، اس لئے کہ اب ہم قرآنِ کریم کی روشنی میں خود اس منزل تک آ پہنچے ہیں۔ یہودیوں کے ہاں صلیب کی موت، لعنتی موت خیال کی جاتی تھی۔ اس لئے وہ بہت خوش تھے کہ انہوں نے اپنی آتشِ انتقام کو خوب ٹھنڈا کیا۔ عیسائی خود اس کے معترف تھے (اور ہیں) کہ حضرت عیسیٰؑ کو واقعی سولی پر چڑھایا گیا اور انہوں نے وہیں جان دی۔ اس کے بعد آپ کو یوسف والے باغ میں دفن کیا گیا جہاں سے آپ تیسرے دن جی اٹھے اور شاگردوں سے پند و نصائح کرنے

---

[1] یہودیوں کی صدر عدالت کو سزائے موت کے علاوہ ہر قسم کی سزا دینے کی اجازت تھی۔ سزائے موت کے لئے انہیں رومی گورنر کی طرف رجوع کرنا پڑتا تھا۔ (MARTYRDOM OF MAN P. 168)

کے بعد اٹھا لئے گئے۔ اور (ان کے عقیدہ کے مطابق) یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ خدا (یا خدا کا اکلوتا بیٹا) اپنی قربانی سے نوعِ انسانی کے گناہوں کا کفارہ بن جائے۔ چنانچہ پولُس کے خط بنام گلتیون میں مذکور ہے۔

> کیونکہ جتنے شریعت کے اعمال پر تکیہ کرتے ہیں وہ سب لعنت کے ماتحت ہیں۔ چنانچہ لکھا ہے کہ جو کوئی ان سب باتوں کے کرنے پر قائم نہیں رہتا جو شریعت کی کتاب میں لکھی ہیں وہ لعنتی ہے ہ اور یہ بات ظاہر ہے کہ شریعت کے وسیلے سے کوئی شخص خدا کے نزدیک راستباز نہیں ٹھہرتا کیونکہ لکھا ہے کہ راستباز ایمان سے جیتا رہے گا اور شریعت کو ایمان سے کچھ واسطہ نہیں بلکہ لکھا ہے کہ جس نے اُن پر عمل کیا وہ ان کے سبب سے جیتا رہے گا ہ مسیح جو ہمارے لئے لعنتی بنا اس نے ہمیں مول لے کر شریعت کی لعنت سے چھڑایا کیونکہ لکھا ہے کہ جو کوئی لکڑی پر لٹکایا گیا وہ لعنتی ہے ہ تاکہ مسیح یسوع میں ابرہام کی برکت غیر قوموں تک بھی پہنچے اور ہم ایمان کے وسیلے سے اس روح کو حاصل کریں جس کا وعدہ ہوا ہے ہ (گلتیون ۱۰ــ۳/۱۴)

(واضح رہے کہ کفار کا عقیدہ رومن کیتھولک تک ہی محدود نہیں۔ عیسائیوں کا (بظاہر معقولیت پسند فرقہ) پروٹسٹنٹ بھی، اس باب میں، رومن کیتھولک جیسے متشدّد فرقے سے پیچھے نہیں۔ اس فرقہ کے بانی لوتھر کا یہ قول مشہور ہے کہ

SIN HARD, BUT BELIVE HARDER

"خوب گناہ کرو لیکن اس کے ساتھ، (کفارہ پر) ایمان کو اور مضبوط کرتے جاؤ۔"

بحوالہ CHAVERI - 416

لیکن ہم نے دیگر اناجیل کی بیان کردہ تفصیلات کے ساتھ انجیل برناباس کا بیان بھی دیکھا ہے جس میں مذکور ہے کہ حضرت مسیحؑ اپنی گرفتاری سے پہلے ہی (بتائیدِ خداوندی) محفوظ نکال لئے گئے اور آسمان پر اٹھا لئے گئے تھے۔ یہودیوں کو اس باب میں سخت اشتباہ ہوا۔ انہوں نے یہوداہ اسکریوتی کو، جو سازش کر کے حضرت مسیحؑ کی نشاندہی کے لئے آیا تھا خود مسیح سمجھ کر گرفتار کیا اور یہی یہوداہ تھا جسے صلیب دی گئی۔ شاگردوں نے تیسرے دن (اور بعض روایات کے مطابق اُسی رات) اس کی لاش کو چُرا لیا اور عوام میں مشہور کر دیا کہ حضرت مسیحؑ جی اٹھے اور آسمان پر تشریف لے گئے۔ اس کے بعد حضرت مسیحؑ آسمان سے

نازل ہوئے اور شاگردوں سے وعظ نصیحت کے بعد پھر آسمان پر واپس چلے گئے۔ (یہ انجیل برنباس کی تفاصیل کا خلاصہ ہے)۔

یہ ہیں اس واقعہ کے متعلق یہودیوں اور عیسائیوں کے بیانات وعقائد، جو ظاہر ہے کہ افراط وتفریط پر مبنی ہیں۔ لیکن اگر ہم قندیلِ قرآن کی روشنی میں تلاشِ حقیقت کے لئے نکلیں تو اصل واقعہ کے خطوط افراط و تفریط کی اس گھٹا سے نکھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے سب سے پہلے ایک اصولی چیز بیان فرمائی ہے کہ اس اختصار سے تمام تفاصیل و جزئیات محصور ہوگئی ہیں۔

قرآنی تفاصیل

وَ مَكَرُوْا وَ مَكَرَ اللّٰهُ ؕ وَ اللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ۚ (۳/۵۴)

اور پھر ایسا ہوا کہ یہودیوں نے (مسیح کے خلاف) مکر کیا (یعنی مخفی اور باریک طریقے مخالفت کے کام میں لائے) اور خدا بھی ویسے ہی طریقے کام میں لایا (یعنی مسیح کی حفاظت کے پوشیدہ اسباب وذرائع پیدا کر دیئے) اور یاد رکھو! اللہ جسے بچانا چاہے، تو (مخفی طریقوں سے کام لینے والوں میں اُس سے بہتر کوئی نہیں!

یعنی یہودیوں کی تدبیر یہ تھی کہ حضرت مسیحؑ کو گرفتار کر کے رومیوں کے ہاتھوں صلیب پر لٹکوا دیا جائے لیکن اللہ اُن کی اس تدبیر سے بے خبر نہ تھا۔ اس نے اپنے اس برگزیدہ رسول کو اس "لعنتی موت" سے بچانے کی خود تدبیر کر رکھی تھی۔ اور ظاہر ہے کہ انسانوں کے مقابلہ میں خدائی تدبیر ہمیشہ کامیاب ہوگی۔ وَ اللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ○

یہودیوں کا دعوےٰ ہے کہ حضرت مسیحؑ کو صلیب دیا گیا اور اس طرح وہ (معاذ اللہ) لعنت کی موت مرے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ سب غلط ہے۔

وَ قَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ وَ مَا قَتَلُوْهُ وَ مَا صَلَبُوْهُ وَ لٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ؕ وَ اِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ؕ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَ مَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ۙ (۴/۱۵۷)

اور (نیز) ان کا یہ کہنا کہ ہم نے مریم کے بیٹے عیسےٰ کو جو خدا کا رسول ہونے کا دعویٰ کرتا تھا

(سولی پر چڑھا کر) قتل کر ڈالا. حالانکہ (واقعہ یہ ہے کہ) نہ تو انہوں نے قتل کیا اور نہ سولی پر چڑھا کر ذلّت کی موت مارا. بلکہ حقیقت ان پر مشتبہ ہوگئی (یعنی صورتِ حال ایسی ہوگئی کہ انہوں نے سمجھا، ہم نے مسیح کو مصلوب کر دیا، حالانکہ یہ صحیح نہیں تھا) اور جن لوگوں نے اس بارے میں اختلاف کیا (یعنی عیسائیوں نے جو کہتے ہیں مسیح مصلوب ہوئے لیکن اس کے بعد زندہ ہو گئے) تو بلاشبہ وہ اس کی نسبت شک و شبہ میں پڑے ہوئے ہیں. اس بارے میں اُن کے پاس کوئی یقینی بات نہیں ہے، بجز اس کے کہ ظن و گمان کے پیچھے جائیں اور یقیناً انہوں نے عیسیٰ کو قتل نہیں کیا.

انہوں نے یقیناً نہ حضرت عیسیٰؑ کو قتل کیا اور نہ صلیب پر لٹکایا. پھر ہوا کیا؟ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ (انہیں اس باب میں سخت اشتباہ ہوگیا) بس اس ٹکڑے کے اندر اصل واقعہ نقاب اوڑھے سکرا رہا ہے. اس کے متعلق یہود و نصاریٰ جو طرح طرح کی باتیں کر رہے ہیں، وہ محض ظن و تخمین ہے، علم و حقیقت نہیں. مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ حقیقتِ نفس الامری یہ ہے کہ انہوں نے حضرت مسیحؑ کو ہرگز ہرگز قتل نہیں کیا. اس لئے یہ دعویٰ کہ وہ (معاذ اللہ) ایک لعنتی کی موت مرے سرتاسر لغو اور بے بنیاد ہے. اللہ تعالیٰ نے بکمالِ حکمت و تدبّر حضرت مسیحؑ کو یہودیوں کی مشئوم چال سے محفوظ رکھا اور لعنتی کی موت کے بجائے، عزّت و تکریم کی ان انتہائی بلندیوں تک پہنچا دیا جو ایک رسول کا صحیح مقام ہے. بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ (۴/۱۵۸). اُن تک یہودیوں کا ہاتھ پہنچنے ہی نہیں دیا. وَ اِذْ كَفَفْتُ بَنِیْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَنْكَ اِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ (۵/۱۱۰) اور اس کے متعلق حضرت عیسیٰؑ کو پہلے ہی سے آگاہ کر دیا گیا تھا.

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰٓى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَ رَافِعُكَ اِلَىَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ جَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ اِلَىَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۝ (۳/۵۴)

(ان کی آخری تدبیر یہ تھی کہ عیسیٰؑ کو گرفتار کر کے صلیب پر لٹکا دیا جائے اور اس طرح اسے، بزعمِ خویش، ذلّت و رسوائی کی موت مار دیا جائے) خدا نے عیسیٰؑ سے کہہ دیا

> کہ تم اطمینان رکھو۔ ان کی یہ سازش کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی ــــ تم اپنی طبعی موت مرو گے۔ میری طرف سے تمہارے مدارج بلند ہوں گے۔ میں تمہیں ان مخالفین کی دسترس سے بہت دُور لے جاؤں گا اور جو الزامات یہ تمہارے خلاف تراشتے ہیں، ان سے تمہاری بریت کروں گا۔ (اس وقت تمہاری جماعت کے افراد کمزور نظر آتے ہیں، لیکن آخر الامر) میں ان لوگوں کو جو تیرا اتباع کریں گے، ہمیشہ کے لئے ان پر فوقیت دوں گا جو تیرا انکار کر رہے ہیں۔
>
> یاد رکھو! اس قسم کی کشمکش کے فیصلے، لوگوں کی اپنی اپنی آرزوؤں اور خواہشوں کے مطابق نہیں ہوا کرتے۔ یہ ہمارے قانونِ مکافات کی رُو سے ہوتے ہیں جس کی طرف ہر ایک کھنچے چلا آ رہا ہے، جس کے دائرے سے کوئی بھی باہر نہیں رہ سکتا۔

ان تصریحات سے مترشح ہوتا ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے جس شخص کو صلیب پر چڑھایا گیا تھا وہ حضرت عیسٰیؑ نہیں تھے بلکہ ان لوگوں پر حقیقتِ حال مشتبہ ہو گئی تھی۔ اس سے ظاہر ہے کہ حضرت عیسٰیؑ گرفتاری سے پہلے ہی محفوظ کر دیئے گئے تھے اور اس بنا پر انجیل برنباس کا بیان (اس کے بعض حصوں کو چھوڑ کر) زیادہ قابلِ اعتماد نظر آتا ہے کیونکہ وہ قرآنِ کریم کی بیان کردہ حقیقت سے زیادہ قریب ہے۔

آپ گرفتار ہی نہیں ہوئے

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہودیوں کی سازش کا علم ہو جانے کے بعد حضرت عیسٰیؑ بحکمِ خداوندی خاموشی سے کسی اور مقام کی طرف تشریف لے گئے۔ اور آپ کے شاگردوں کو اس حقیقت کا علم تھا۔ قرآنِ کریم نے قدوسیوں کی اس جماعت کا جس انداز سے ذکر کیا ہے اس کے پیشِ نظر یہ باور نہیں کیا جا سکتا کہ انہیں معلوم ہو کہ سچ مچ حضرت مسیحؑ کو گرفتار کر لیا گیا ہے اور اُن پر مقدمہ چلا کر انہیں سزائے موت دی جائے گی اور اس پر بھی وہ نہ صرف خاموش بیٹھے رہیں بلکہ آپ کو چھوڑ کر بھاگ جائیں۔ ایک رسول کی معیت میں اس کے صحیح متبعین کی جماعت کی روح کس قدر بلند ہوتی ہے، اس کا ہم اندازہ ہی نہیں کر سکتے؟ اگر ضرورت پڑے تو وہ دنیا کی اس محبوب ترین شخصیت کی حفاظت کے لئے اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا دیں اور اس میں عشرتِ دوام محسوس کریں۔ وہ اپنے آپ کو حوالۂ دار و رسن کر دیں، لیکن اسے خراش تک نہ آنے دیں۔ لہذا اسے تسلیم ہی نہیں کیا جا سکتا کہ حواری حضرت عیسٰیؑ کو اس طرح چھوڑ کر بھاگ جاتے۔ اصل صورتِ حال یونہی دکھائی دیتی ہے کہ حواریوں کو معلوم تھا کہ حضرت عیسٰیؑ تشریف لے جا چکے ہیں اور جس شخص کو گرفتار

کیا جا رہا ہے کوئی اور ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فدائیوں کی اس جماعت نے باہمی مشورہ سے، خود اپنے میں سے ایک سچے جاں باز کو تیار کر رکھا ہو کہ وہ حضرت مسیحؑ کا بھیس بدل کر اپنے آپ کو یہوداہ کی سراغ دہی کے بعد (جو خود اس تدبیر کا ایک جزو ہو سکتی ہے) گرفتار کرا دے، تاکہ دشمن حضرت مسیحؑ کی تلاش میں سعی و کاوش نہ کریں۔ اس کے بعد انہوں نے کاوش کی ہوگی کہ عام قاعدہ کے مطابق (جیسا کہ اناجیل میں مذکور ہے) اُس گرفتار شدہ کی ہڈیاں صلیب پر نہ توڑی جائیں۔ اس لئے کہ اناجیل کی تفاصیل سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس مصلوب نے صلیب پر جان نہیں دی نہ اس کی ہڈیاں توڑی گئیں نہ دوسرے مصلوب مجرموں کے ساتھ اسے دفن کیا گیا۔ اُسے جمعہ کی دوپہر (۳ اپریل ۳۳ء) کو صلیب پر لٹکایا گیا۔ صلیب، پھانسی کی طرح ایک جھٹکے میں جان نہیں لے لیتی تھی بلکہ اس کی صعوبت اور تکلیف سے کئی روز کے بعد موت واقع ہوتی تھی۔ جمعہ کی سہ پہر کے بعد دو تین گھنٹہ کا وقفہ گزرا تھا کہ سبت (ہفتہ) کی شام شروع ہو گئی۔ ایک تو یہودی شریعت کے مطابق سبت تعطیل کا دن تھا۔ دوسرے وہ (۳ اپریل والا) سبت ان کے ایک عظیم الشان سالانہ تیوہار کا دن تھا (رینان صفحہ ۲۹۲)۔ اس لئے شام سے پہلے ہی اس مصلوب کو (بغیر ہڈیاں توڑے) صلیب سے اتار کر یوسف نامی ایک دولت مند شخص کے سپرد کر دیا گیا (جو یا تو حضرت مسیحؑ کا متبع تھا یا آپؑ کے مشن سے ہمدردی رکھتا تھا)۔ حواریوں نے خفیہ خفیہ یوسف کے باغ میں اس کا علاج کیا اور تیسرے دن (اتوار کے روز) اسے ساتھ لے کر چل دیئے۔

یہ کوائف شاہد ہیں کہ نہ حضرت مسیحؑ گرفتار ہوئے اور نہ آپ کو صلیب دی گئی۔ اب ظاہر ہے کہ اناجیل کے بیانات کہ جسے صلیب دی گئی (اور جسے عیسائی اب تک حضرت مسیحؑ ہی خیال کرتے چلے آ رہے ہیں) بُری طرح صلیب پر چیخا اور چلّایا اور اس نے کہا کہ "ایلی ایلی لما شبقتنی (متی ۲۷/۴۶)" "اے میرے خدا تُو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا" کیا معنی رکھتے ہیں؟ یہ کچھ کہنے والا کبھی مسیح

۱۔ صلیب کیا تھی؟ اس قسم (✝) کی لکڑی زمین میں گاڑ کر متوازی لکڑی کے ساتھ مجرم کے بازو پھیلا دیئے جاتے تھے اور اس کے ہاتھوں میں میخیں ٹھونک کر اسے اس لکڑی سے لٹکا دیا جاتا تھا۔ وہ اس تکلیف سے قریب قریب بے ہوش ہو جاتا اور اس کے بعد بھوک، پیاس، گرمی وغیرہ کی شدت اور کوفت سے سسک سسک اور گھل گھل کر جان دے دیتا تھا۔ صلیب سے اتارتے وقت عام طور پر اس کی ٹانگوں کی ہڈیاں توڑ دیتے تھے۔

نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ خدا کے ایک برگزیدہ رسول سے یہ ناممکن ہے کہ وہ اس قسم کی مصیبت اور آزمائش میں ایسا پست ہمت اور بودا ثابت ہو اور اس قسم کے کلمات زبان پر لے آئے جنہیں عام عزم ہمت اور حوصلہ و استقلال کے انسان کی غیرت بھی گوارا نہ کرے۔ ان لوگوں نے سمجھا ہی نہیں کہ خدا کے رسول، شرفِ انسانیت اور استحکامِ خودی کی کن بلندیوں پر جلوہ بار ہوتے ہیں۔ وہ بھلا موت سے کیا ڈرینگے جبکہ موت ان کے نزدیک ایک ابدی زندگی کا دروازہ ہو! اس لئے یہ کچھ کہنے والا مسیح نہیں تھا۔ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ لوگوں پر حقیقت حال مشتبہ ہو گئی تھی۔

تاریخی تحقیقات اور اثری انکشافات سے جوں جوں حقائق پر پڑے ہوئے پردے اُٹھتے چلے جاتے ہیں، قرآنِ کریم کے اس دعوے کی صداقت کے مزید ثبوت فراہم ہوتے چلے جاتے ہیں کہ جو شخص صلیب دیا گیا تھا، وہ حضرت عیسیٰؑ نہیں تھے، ان کے مشابہ کوئی اور شخص تھا Marcello Graveri جس کی کتاب THE LIFE OF JESUS کا ذکر پہلے آچکا ہے، نے اس سلسلہ میں (متعدد حوالوں کی رُو سے) لکھا ہے کہ جب رومی سپاہی (حضرت) عیسیٰؑ کو کشاں کشاں سوئے دار لے جا رہے تھے تو ضعف اور کمزوری کی وجہ سے آپ سے وہ شہتیر اٹھائے نہیں جاتے تھے۔ جنہیں گاڑ کر صلیب بنانا مقصود تھا۔ راستے میں (Simon) نامی ایک شخص ملا جو کھیتوں میں کام کاج کرنے کے بعد اپنے گھر واپس جا رہا تھا۔ رومن سپاہیوں نے اسے بیگار میں پکڑا اور کہا کہ وہ ان شہتیروں کو اٹھا کر ساتھ چلے۔ چنانچہ اس نے شہتیر اٹھا لئے تو (حضرت) عیسیٰؑ نے ایسا کیا کہ خود سائمن کی شکل اختیار کر لی اور سائمن (حضرت) عیسیٰؑ کا ہم شکل ہو گیا۔ چنانچہ سائمن کو (چیختے چلّاتے) سولی پر چڑھا دیا گیا اور (حضرت) عیسیٰؑ سائمن بنے، صلیب کے نیچے کھڑے مسکراتے رہے (صفحہ ۲۹۵)۔ آپ نے دیکھا کہ قرآن کے بیان ـــــ و لکن شبہ لھم ـــــ کی کیا کیا تشریحات سامنے آرہی ہیں۔

ہجرت بہرحال حضرت مسیحؑ نے ان حالات میں فلسطین سے ہجرت کر لی (جس طرح رات کی تاریکی اور خاموشی میں حضور نبیِ اکرمؐ نے مکّہ سے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی تھی) اور کسی دوسری طرف تشریف لے گئے۔ یہ اسی قسم کی ہجرت تھی جسے ہم 'اتمامِ حجت کے بعد' انبیائے سابقہ کے احوال و کوائف میں دیکھتے چلے آرہے ہیں۔ حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ، حضرت لوطؑ، حضرت ابراہیمؑ وغیرہم (علیہم السلام) نے اسی طرح ہجرت کی تھی۔ ان میں سے بعض انبیائے عظام کے بعد از ہجرت

واقعاتِ زندگی کے متعلق قرآنِ کریم نے ذکر کیا ہے۔ لیکن اکثر وہ ہیں (حضرت ہودؑ، صالحؑ، لوطؑ علیہم السلام) جن کی بعد از ہجرت زندگی کے متعلق قرآن نے کچھ نہیں کہا۔ اس لئے کہ جیسا کہ لکھا جا چکا ہے، قرآنِ کریم تاریخ کی کتاب نہیں کہ وہ کسی رسول (یا قوم) کی پیدائش سے وفات (یا ابتدا سے انتہا) تک کے تمام واقعات بیان کرے۔ وہ ان واقعات میں سے صرف اتنے حصہ پر اکتفا کرتا ہے جسے وہ مقصد پیشِ نظر کے لئے ضروری سمجھتا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کی بعد از ہجرت زندگی کے متعلق بھی قرآن نے کچھ نہیں بتایا۔

وفات

تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت سامنے آگئی کہ قرآنِ کریم نے کس طرح یہودیوں اور عیسائیوں کے اس خیال اور باطل عقیدہ کی تردید کردی ہے کہ حضرت مسیحؑ کو صلیب دیا گیا تھا۔ باقی رہا عیسائیوں کا یہ عقیدہ کہ آپ زندہ آسمان پر اٹھا لئے گئے تھے، تو قرآن سے اس کی بھی تائید نہیں ہوتی۔ بلکہ اس میں ایسے شواہد موجود ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ آپ نے دوسرے رسولوں کی طرح اپنی مدتِ عمر پوری کرنے کے بعد وفات پائی۔ سورہ آلِ عمران کی جو آیت اوپر درج کی جا چکی ہے اس میں وفات کا ذکر صاف طور پر موجود ہے۔

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰۤى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَ رَافِعُكَ اِلَىَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (۳/۵۴)

جب ایسا ہوا تھا کہ اللہ نے فرمایا" اے عیسیٰ! میں تیرا وقت پورا کروں گا (وفات دے دوں گا) اور تجھے (یعنی تیرے درجات کو) اپنی طرف بلند کروں گا۔ تیرے مخالفین (کی تہمتوں) سے پاک کر دوں گا۔

سورہ مائدہ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰؑ سے پوچھیں گے کہ کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ وہ تیری اور تیری والدہ کی پرستش کیا کریں۔ وہ اس کے جواب میں کہیں گے کہ معاذ اللہ! میں بھلا ایسا کیسے کہہ سکتا تھا۔ باقی رہے یہ لوگ (میرے متبعین)، سو كُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ج فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِىْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ط (۵/۱۱۷)

جب تک میں ان میں موجود رہا، میں ان کی نگرانی کرتا رہا کہ اس قسم کے مشرکانہ عقائد ان میں پیدا نہ ہوں۔

لیکن جب تُو نے مجھے وفات دے دی تو اس کے بعد ان کا نگران تُو ہی ہو سکتا تھا (میں نہیں)۔

علاوہ ازیں قرآنِ کریم کے اکثر مقامات سے یہ واضح ہے کہ حضرات انبیائے کرامؑ میں سے کسی کو خلود اور زندگیٔ دوام حاصل نہیں ہوئی تھی۔ سورۃ انبیاء میں ہے۔

وَ مَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ وَ مَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَ مَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ ۝ (۷ — ۲۱/۸)

اور (اے پیغمبر!) ہم نے تجھ سے پہلے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا، مگر اسی طرح، کہ آدمی تھے۔ ان پر ہماری وحی اُترتی تھی۔ پھر (اے گروہِ منکرین) اگر تمہیں یہ بات معلوم نہیں تو ان لوگوں سے پوچھ کر معلوم کر لو جو اہلِ کتاب ہیں۔ اور ہم نے ان پیغمبروں کو کبھی ایسے جسم کا نہیں بنایا کہ کھانا نہ کھاتے ہوں اور نہ ہی وہ ہمیشہ زندہ رہنے والے تھے۔

اسی سورہ میں ذرا آگے چل کر ارشاد ہوا۔

وَ مَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ؕ اَفَاۡئِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ ۝ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ؕ وَ نَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَ الْخَيْرِ فِتْنَةً ؕ وَ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ۝ (۳۴ — ۲۱/۳۵)

اور (اے پیغمبر!) ہم نے تجھ سے پہلے کسی کو ہمیشگی نہیں دی (اور نہ تیرے لئے ہمیشہ زندہ رہنا ہے)، پھر اگر تجھے مرنا ہے تو کیا یہ لوگ ہمیشہ زندہ رہنے والے ہیں؟ ہر جان کے لئے موت کا مزہ چکھنا ہے اور ہم تمہیں (زندگی کی) اچھی بُری حالتوں سے نمودِ ذات کے مواقع بہم پہنچاتے ہیں اور پھر (بالآخر) تم سب کو ہماری طرف لوٹنا ہے!

اسی حقیقت کو دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَ مَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا ؕ وَ سَيَجْزِي

اللّٰہُ الشّٰکِرِیۡنَ ۝ (۳/۱۴۳).

اور محمدؐ اس کے سوا کیا ہیں کہ اللہ کے رسول ہیں اور ان سے پہلے بھی اللہ کے رسول گزر چکے ہیں (جو اپنے اپنے وقتوں میں ظاہر ہوئے اور راہِ حق کی دعوت دے کر دنیا سے چلے گئے)۔ پھر اگر ایسا ہو کہ وہ وفات پا ئیں (اور بہر حال انہیں ایک دن وفات پانا ہے) یا (فرض کرو) ایسا ہو کہ قتل ہو جائیں، تو کیا تم اُلٹے پاؤں راہِ حق سے پھر جاؤ گے (اور ان کے مرنے کے ساتھ ہی تمہاری حق پرستی بھی ختم ہو جائے گی؟) اور جو کوئی راہِ حق سے اُلٹے پاؤں پھر جائے گا، تو وہ (اپنا ہی نقصان کرے گا) خدا کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اور جو لوگ شکر گزار ہیں (یعنی نعمتِ حق کی قدر دانی کرنے والے ہیں) تو قریب ہے کہ خدا انہیں ان کا اجر عطا فرماتے!

اسی قسم کا فقرہ حضرت مسیحؑ کے متعلق بھی ارشاد ہوا ہے۔

مَا الۡمَسِیۡحُ ابۡنُ مَرۡیَمَ اِلَّا رَسُوۡلٌ ۚ قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِہِ الرُّسُلُ ؕ وَ اُمُّہٗ صِدِّیۡقَۃٌ ؕ کَانَا یَاۡکُلٰنِ الطَّعَامَ ؕ اُنۡظُرۡ کَیۡفَ نُبَیِّنُ لَہُمُ الۡاٰیٰتِ ثُمَّ انۡظُرۡ اَنّٰی یُؤۡفَکُوۡنَ ۝ (۵/۷۵)

مریم کا بیٹا مسیح اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ کا ایک رسول ہے۔ اس سے پہلے کتنے رسول (اپنے وقتوں میں) گذر چکے۔ اور اس کی ماں (بھی اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ) صدیقہ تھی (یعنی بڑی ہی راستباز تھی)۔ یہ دونوں (تمام انسانوں کی طرح) کھاتے پیتے تھے (یعنی غذا کی احتیاج رکھتے تھے اور ظاہر ہے کہ جسے زندہ رہنے کے لئے غذا کی احتیاج ہو، اس میں ماوراء البشریت کوئی بات کیونکر ہو سکتی ہے)۔ دیکھو کس طرح ہم ان لوگوں کے لئے دلیلیں واضح کرتے ہیں۔ اور پھر دیکھو کس طرف کو یہ لوگ پھرے ہوئے جا رہے ہیں؟ (کہ اتنی موٹی سی بات بھی سمجھ نہیں سکتے؟)۔

جو شخص ان تصریحات پر خالی الذہن ہو کر غور کرے گا وہ یقیناً اس نتیجہ پر پہنچ جائے گا کہ نزولِ قرآن کے وقت

وفات کے معنی

حضرت عیسیٰؑ کے زندہ ہونے کی تائید قرآنِ کریم کی آیات سے نہیں ملتی، بلکہ اس کے برعکس، آپ کے "گذر جانے" اور وفات پا جانے کی شہادت قرآن میں

موجود ہے۔ وفات کے معنی ہیں اس طرح پورا ہو جانا (یا پورا کر دیا جانا) کہ اس میں سے کچھ بقایا نہ رہے (تفصیل کے لئے میری لغات القرآن دیکھئے)۔ لہٰذا وفات کے معنی ہوں گے "کسی کے وقت کا پورا ہو جانا" یعنی دنیا میں قیام کی مدت کا پورا ہو جانا۔ قرآنِ کریم میں وفات کا لفظ ان معنوں میں متعدد مقامات پر مستعمل ہوا ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں مومنین کی ایک دعا مذکور ہے کہ

رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَ كَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَ تَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ۝ (۳/۱۹۳)

پس خدایا ہمیں سامانِ حفاظت عطا فرما دے۔ ہماری برائیاں مٹا دے اور (اپنے فضل و کرم سے) ایسا کر کہ ہماری موت نیک کرداروں کے ساتھ ہو۔

یہاں توفنا کے معنی ظاہر ہیں۔ اسی طرح سورۂ اعراف میں ہے۔

رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّ تَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ ۝ (۷/۱۲۶)

پروردگار! ہمیں صبر و شکیبائی سے معمور کر دے۔ (تاکہ زندگی کی کوئی اذیت ہمیں اس راہ میں ڈگمگا نہ سکے) اور ہمیں دنیا سے اس حالت میں اٹھا کہ تیرے فرماں بردار ہوں!

حضرت یوسفؑ کی یہ دعا کہ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ۝ (۱۲/۱۰۱) بھی اسی مفہوم کو لئے ہوئے ہے۔ سورۂ محمدؐ میں اس لفظ کے معنی اور بھی واضح ہو گئے ہیں۔

فَكَيْفَ اِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَ اَدْبَارَهُمْ ۝ (۴۷/۲۷)

تو (غور تو کرو، ان کا) کیسا حال ہوگا جب ملائکہ انہیں وفات دیں گے ان کے مونہوں اور ان کی پیٹھوں کو مارتے ہوں گے۔

ان کے علاوہ کئی ایک اور مقامات بھی ہیں جن میں یَتَوَفّٰی کے معنی مار دینے کے ہیں، مثلاً (۲/۲۳۴)؛ (۲/۲۴۰؛ ۴/۱۵؛ ۱۶/۷۰؛ ۲۲/۵؛ ۳۲/۱۱)۔ بغرضِ اختصار ان آیات کو درج نہیں کیا جاتا۔ قرآنِ کریم میں خود دیکھ لیجئے۔ ان کے معانی میں کسی قسم کا اشکال نہیں۔ بلکہ ان مندرجہ صدر آیات سے بھی زیادہ واضح طور پر معانی سامنے آجاتے ہیں۔

اب ان مقامات کو پھر سے سامنے لایئے جن میں حضرت عیسیٰؑ کی وفات کا ذکر ہے اور جو پہلے درج کی جا چکی ہیں۔ (یعنی ۳/۵۴؛ ۵/۱۱۷)۔ سورۂ مائدہ کی آیت (۵/۱۱۷) میں کہا گیا ہے کہ كُنْتُ عَلَيْهِمْ

شَهِيدًا مَّا دُمْتُ فِيهِمْ ۔۔۔ (جب تک میں ان میں زندہ موجود تھا میں ان پر نگران تھا) اس میں "مَا دُمْتُ فِيهِمْ" کے الفاظ غور طلب ہیں۔ سورۂ مریم میں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے اربابِ قوم کے استفسار کے جواب میں فرمایا وَ اَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوةِ وَ الزَّکٰوةِ مَا دُمْتُ حَیًّا ﴿۱۹/۳۱﴾ کہ اللہ نے مجھے صلوٰۃ وزکوٰۃ کا حکم دے رکھا ہے جب تک میں زندہ ہوں"۔ آیت کے آخری الفاظ (مَا دُمْتُ حَیًّا) اپنی تفسیر آپ کر رہے ہیں۔ اسی سورہ میں حضرت یحییٰؑ کے متعلق ارشاد ہے۔

وَ سَلٰمٌ عَلَیْهِ یَوْمَ وُلِدَ وَ یَوْمَ یَمُوْتُ وَ یَوْمَ یُبْعَثُ حَیًّا ﴿۱۹/۱۵﴾

اور اس پر سلامتی ہے (اس کی) پیدائش کے دن (سے) موت کے دن (تک اور) جس دن وہ زندہ اٹھایا جائے گا۔

یہی الفاظ (تھوڑا اور آگے چل کر) حضرت عیسیٰؑ کے متعلق آتے ہیں۔

وَ السَّلٰمُ عَلَیَّ یَوْمَ وُلِدْتُّ وَ یَوْمَ اَمُوْتُ وَ یَوْمَ اُبْعَثُ حَیًّا ﴿۱۹/۳۳﴾

اور مجھ پر سلامتی ہے میری پیدائش کے دن سے موت کے دن تک اور جس دن مجھے زندہ اٹھایا جائے گا۔

ان آیات سے بھی واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ اس دنیا میں اپنی طبعی زندگی تک رہے۔

قرآنِ کریم میں دو ایک مقامات ایسے بھی ہیں جہاں توفّٰی کے معنی موت دینے کے نہیں ہیں۔ مثلاً سورۂ انعام میں ہے۔

وَ هُوَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّیْلِ وَ یَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ یَبْعَثُكُمْ فِیْهِ لِیُقْضٰۤى اَجَلٌ مُّسَمًّى ﴿۶/۶۰﴾

اور (دیکھو) وہی ہے جو رات کے وقت تم کو "وفات دے دیتا ہے" (یعنی سُلا دیتا ہے) اور جو کچھ تم نے دن (کی حرکت و ہوشیاری) میں کدو کاوش کی تھی اس سے بے خبر نہیں ہے۔

پھر (جب رات بھر سو لیتے ہو تو) دن کے وقت تمہیں اٹھا کھڑا کرتا ہے تاکہ (بدستور کد و کاوش میں لگ جاؤ اور زندگی کی) مقررہ میعاد پوری ہو جائے۔

اس کی تفسیر سورۂ زمر میں ان الفاظ میں آئی ہے۔

اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَ الَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا ۚ فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَ يُرْسِلُ الْاُخْرٰى اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ○ (۳۹/۴۲)

اور دیکھو! اللہ "نفوس" کو (دو طرح پر) وفات دیتا ہے (ایک تو) اُن کی موت کے وقت اور (دوسرے) جو مرے نہیں، ان کی نیند میں۔ پھر انہیں روک رکھتا ہے جن پر موت کا حکم کیا ہوتا ہے اور دوسروں کو ایک مقررہ وقت تک کے لئے بھیج دیتا ہے۔ یقیناً اس میں اس قوم کے لئے بڑی ہی نشانی ہے جو غور و فکر کی عادی ہو۔

ظاہر ہے کہ ان مقامات میں "نفس" کے معنی جان کے نہیں بلکہ نفسِ شعوریہ (CONSCIOUS MIND) کے ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ بحالتِ نیند اور بحالتِ موت، نفسِ شعوریہ (احساس و ادراک) کی قوتوں کو معطل کر دیتا ہے۔ نیند کی صورت میں تو اس کھوئے ہوئے شعور و ادراک کو واپس لوٹا دیا جاتا ہے لیکن موت کی صورت میں واپس نہیں لوٹایا جاتا (جب تک پھر دوسری زندگی عطا نہ ہو) اس لئے کہ حالتِ نیند میں انسان میں سوائے شعور و ادراک کے اور سب کچھ موجود ہوتا ہے۔ ان معانی کے پیشِ نظر زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے متعلق سورہ آلِ عمران اور سورۂ مائدہ کی مندرجہ صدر آیات میں توفّی کے معنی موت نہیں بلکہ نیند کی سی بے ہوشی کے ہیں اور اس سے یہ مراد لی جا سکتی ہے کہ آپ کو صلیب دی گئی لیکن آپ صلیب پر بے ہوش ہو گئے، مرے نہیں ــــ اور لوگوں کو شبہ ہو گیا کہ آپ مر چکے ہیں (یعنی لوگوں کا وہی خیال جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے)۔ لیکن، جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، دیگر قرآن کے پیشِ نظر یہ صحیح نہیں۔ قرآنِ کریم آپ کے صلیب دیئے جانے کی بصراحت تردید کرتا ہے (وَمَا صَلَبُوْهُ)۔ پھر سورۂ مائدہ کی مندرجہ صدر آیت میں واضح الفاظ میں ہے کہ "جب تک میں ان میں رہا ان کی حالت پر گواہ تھا۔ اس کے بعد جب تُو نے وفات دے دی تو پھر تُو ہی ان کا نگہبان تھا۔" اس سے بھی ظاہر ہے کہ یہاں وفات سے مراد نیند کی سی بے ہوشی نہیں بلکہ موت کی بے خبری ہے۔ ورنہ اگر نیند

کی سی بے ہوشی ہوتی تو ہوش میں آجانے کے بعد پھر وہی پہلی سی (باخبری) کی حالت پیدا ہوجاتی۔ اس سے واضح ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے ضمن میں توفّی کے معنی وفات پاجانا ہیں، سوجانا نہیں۔ اس کی تائید سورۃ اَلصَّف کی اس مشہور آیت سے بھی واضح ہوتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ وَ مُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُہٗۤ اَحْمَدُ (۶۱/۶) (میں بشارت دیتا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آئے گا اور جس کا اسمِ گرامی احمد ہوگا)۔ "میرے بعد" کا مفہوم بالکل واضح ہے۔ اب اسے سورۃ مائدہ کی مندرجہ صدر آیت کے ساتھ ملا کر دیکھئے۔ آپ نے فرمایا کہ "جب تک میں ان میں رہا ان کی حالت سے باخبر رہا۔ پھر جب تُو نے مجھے وفات دے دی تو پھر تُو ہی ان کا نگہبان تھا۔" بات صاف ہے کہ اس وفات کے بعد آپ دنیا سے تشریف لے گئے (یعنی وفات پاگئے) اور پھر آپ کے بعد وہ رسولِ اکرمؐ تشریف لائے جن کی بشارت آپ نے دی تھی۔ ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے اب تک زندہ ہونے کی تائید قرآنِ کریم سے نہیں ملتی۔ قرآنِ کریم آپ کے وفات پاجانے کا بصراحت ذکر کرتا ہے۔

رفع الی السماء

اب دیکھئے رَفع (آسمان پر چڑھ جانے) کا مفہوم۔ اس کے لئے ایک تو سورۃ آلِ عمران کی اسی آیت کو سامنے رکھئے جسے اُوپر درج کیا جاچکا ہے (اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَ رَافِعُکَ اِلَیَّ) اور دوسرے سورۃ نساء کی یہ آیت بَلْ رَّفَعَہُ اللّٰہُ اِلَیْہِ (۴/۱۵۸)۔ حضرت عیسیٰؑ کے رَفع کا ذکر انہی دو آیات میں آیا ہے۔

رَفَعَ کے معنی ہیں اُوپر اٹھانا۔ بلند کرنا۔ سورۃ رعد میں ہے اَللّٰہُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَھَا (۱۳/۲) "اللہ وہ ہے جس نے بغیر ایسے ستونوں کے جنہیں تم دیکھ سکو، آسمانی کُرّوں کو بلند کیا۔" مثلاً وَ رَفَعْنَا فَوْقَکُمُ الطُّوْرَ (۲/۶۳) "ہم نے تمہارے اوپر طور کو بلند کیا۔" حضرت یوسفؑ کے تذکارِ جلیلہ میں ہے وَ رَفَعَ اَبَوَیْہِ عَلَی الْعَرْشِ (۱۲/۱۰۰)۔ اس نے اپنے والدین کو تخت پر اونچا بٹھایا۔ پھر درجات کی بلندی کے لئے بھی یہی لفظ آیا ہے۔ مثلاً وَ ھُوَ الَّذِیْ جَعَلَکُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَ رَفَعَ بَعْضَکُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ (۶/۱۶۶) اللہ وہ ہے جس نے تمہیں زمین میں جانشین بنایا اور تم میں ایک کو دوسرے سے درجات میں بلند کیا۔ اور اُس صدر نشینِ بزمِ کائنات (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے ذکر کی بلندی کے لئے بھی (وَ رَفَعْنَا

لَكَ ذِكْرَكَ ط (۴/۹۴) کے الفاظ آئے ہیں۔ ان آیات میں رَفَعَ کے ساتھ درجٰت یا ذکر کے الفاظ آئے ہیں۔ لیکن تنہا رَفَعَ کے معنی بھی بلندیٔ درجات و عروجِ مراتب کے ہیں۔ سورۂ اعراف میں ہے وَ لَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا (۷/۱۷۶) "اور اگر ہم چاہتے تو ان (قوانین) کے ذریعے ہم اس (کے مقام) کو بلند کر دیتے"۔ یہی وہ ارتفاعِ درجٰت و مراتب اور عروجِ مقامات و مناصب ہے جن کا ذکر حضرت ادریسؑ کے قصہ میں ان الفاظ میں آیا ہے۔ وَ رَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا (۱۹/۵۷) "اور ہم نے اسے ایک بلند مقام پر اٹھایا"۔ حضرت ادریسؑ کو "بڑے اونچے مقام تک اٹھانے" کا یہ مفہوم نہیں کہ انہیں بہ جسدِ عنصری اٹھا کر کسی اونچی جگہ پر بٹھا دیا گیا تھا۔ بلکہ (جیسا کہ عام محاورہ ہے) اس سے ان کے مقام و مدارج کی بلندی مفہوم ہے اور جب اس بلندیٔ مقام کا ذکر اللہ کے عباد صالحین کے متعلق ہوگا تو اس سے مطلب "قربِ الٰہی" ہوگا۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ "قربِ الٰھی" سے مفہوم یہ نہیں کہ انسان جسمانی طور پر "اللہ کے قریب" جا بیٹھتا ہے۔ بلکہ اس سے بھی مقصود بلندیٔ مدارج و علوِّ شرفِ انسانیت ہوتا ہے۔ یہی مطلب حضرت عیسیٰؑ کے تذکرہ میں "رَفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ" (اللہ نے اسے اپنی طرف بلند کیا) اور "رَافِعُكَ اِلَيَّ" (میں تجھے اپنی طرف بلند کروں گا) سے ہے۔ یعنی بلندیٔ مدارج و مراتب۔ مختلف انبیائے کرامؑ کے مختلف مقاماتِ مدارج و مناصب کا ذکر خود قرآنِ کریم میں موجود ہے۔ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ (۲/۲۵۳) "ان رسولوں میں سے ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے"۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے متعلق رَفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ اور رَافِعُكَ اِلَيَّ فرمایا گیا ہے (یعنی اللہ نے اپنی طرف بلند کیا) اور اس سے اس امر پر دلیل لائی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو زندہ آسمان پر اٹھا لیا۔ لیکن اگر (اِلَيْهِ اور اِلَيَّ سے) یہ مفہوم لیا جائے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ آسمان پر کسی خاص مقام میں متمکن ہے۔ اس مفہوم سے خود ذاتِ باری تعالیٰ کے متعلق جو تصور قائم ہوتا ہے وہ محتاجِ تشریح نہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ جہات و اطراف کی نسبتوں سے بلند اور مکان و زمان کی اضافتوں سے منزہ ہے۔ وہ ہر مقام پر ہے اور اس کے لئے کسی خاص مقام اور گوشہ کی تعیین یکسر غلط اور اس کی ذات کے متعلق قرآنی تعلیم کے قطعاً خلاف ہے جسے ایک ثانیہ کے لئے بھی دل میں جگہ نہیں دی جا سکتی۔ اس لئے جہاں حضرت عیسیٰؑ کے متعلق

یہ کہا گیا ہے کہ "رَفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ" تو اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی خاص جہت یا مقام میں ہے اور حضرت عیسیٰؑ اس جہت یا مقام (آسمان) کی طرف اٹھا لئے گئے ہیں۔ الیہ (اللہ کی طرف) کا لفظ صرف حضرت عیسیٰؑ کے متعلق ہی استعمال نہیں ہوا بلکہ متعدد دیگر مقامات پر بھی آیا ہے جہاں سے یہ حقیقت اور بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اس سے "آسمان کی طرف اٹھا لینا" مراد نہیں ہو سکتا۔ مثلاً اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ (۲/۱۵۶) "ہم اللہ کے لئے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔" اس سے یہ مُراد نہیں کہ اللہ کسی خاص مقام پر ہے اور ہم اس مقام کی طرف لوٹ کر جائیں گے۔

سورۃ الفرقان کی یہ آیات اس نکتہ کو بالکل واضح کر دیتی ہیں۔ فرمایا۔

اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ ۚ وَ لَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا ۚ ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيْلًا ۙ ثُمَّ قَبَضْنٰهُ اِلَيْنَا قَبْضًا يَّسِيْرًا ○ (۲۵/۴۵ — ۴۶)

تُو نے نہیں دیکھا اپنے رب کی طرف کیسے دراز کیا سایہ کو۔ اور اگر چاہتا تو اس کو ٹھہرا رکھتا۔ پھر ہم نے مقرر کیا سورج کو اس کا راہ بتانے والا۔ پھر کھینچ لیا ہم نے اس کو اپنی طرف سہج سہج سمیٹ کر۔ (ترجمہ مولانا محمود الحسن مرحوم)

آپ نے غور کیا کہ اس میں اِلَيْنَا سے مراد کوئی خاص مقام نہیں۔ اور آگے بڑھئے۔ تخلیقِ انسانی یا ارتقاء کے ضمن [ابلیس و آدم، عنوان "انسان"] میں سورۃ سجدہ کی وہ عظیم المرتبت آیات درج کی جا چکی ہیں جو تدابیرِ الہیہ کی ابتداء سے انتہا تک کے تمام ارتقائی مراحل کے متعلق بصیرت افروز حقائق اپنے اندر لئے ہوئے ہیں۔ اس سلسلہ کی عمودی آیت یہ ہے۔

يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ○ (۳۲/۵)

وہ (اللہ) آسمان (کی بلندیوں) سے زمین (کی پستی) کی طرف ایک امر (اسکیم) کی تدبیر کرتا ہے جو (اپنے ارتقائی مراحل طے کرتی ہوئی) اس کی طرف بلند ہوتی ہے، ایسے مراحل سے جن کا عرصہ تمہارے حساب و شمار سے ہزار ہزار برس کا ہو۔

"یَعۡرُجُ اِلَیۡہِ" وہی ہے جو رَفَعَہُ اللّٰہُ اِلَیۡہِ ہے. یہاں واضح ہے کہ "یعرج الیہ" (اس کی طرف بلند ہوتا ہے) سے یہ مفہوم نہیں کہ وہ امور کسی سمت کو (اوپر کی طرف) چڑھ جاتے ہیں بلکہ یہ کہ اپنی ابتدائی منازل سے رفتہ رفتہ بلند ہو کر پختگی تک جا پہنچتے ہیں. اسی حقیقت کو دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ اِلَیۡہِ یَصۡعَدُ الۡکَلِمُ الطَّیِّبُ وَ الۡعَمَلُ الصَّالِحُ یَرۡفَعُہٗ ؕ (۳۵/۱۰) "اُسی کی طرف پاکیزہ کلمات چڑھتے ہیں اور عملِ صالح اسے بلند کرتا ہے." یعنی وہ اعمال جن سے انسان میں آگے بڑھنے (ارتقائی منازل طے کرنے) کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے "بلند ہو کر" اس کی طرف چڑھتے ہیں؛ یعنی وہ انہیں مقاماتِ بلند عطا کرتا ہے. اس سے بھی واضح تر الفاظ میں دیکھئے. جب حضرت ابراہیمؑ نے بابل سے فلسطین کی طرف ہجرت کی ہے (جس کی تفصیل جوئے نور میں گذر چکی ہے) تو فرمایا، اِنِّیۡ مُہَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیۡ (۲۹/۲۶). میں اپنے رب کی طرف ہجرت کر رہا ہوں" سورۂ صٰفّٰت میں ہے قَالَ اِنِّیۡ ذَاہِبٌ اِلٰی رَبِّیۡ سَیَہۡدِیۡنِ (۳۷/۹۹) "کہا میں اپنے رب کی طرف جانے والا ہوں وہ مجھے راستہ دکھائے گا. ان مقامات میں اِلٰی رَبِّیۡ کے ٹکڑے پر غور فرمائیے. مطلب بالکل واضح ہے۔ حضرت ابراہیمؑ ہجرت کر کے آسمان کی طرف تشریف نہیں لے گئے تھے، بلکہ اس طاغوتی ماحول کو چھوڑ کر ایسے مقام کی طرف منتقل ہو گئے تھے جہاں انہیں اپنے اللہ کی حفاظت میسر تھی جہاں وہ اس کا نام آزادی سے لے سکتے اور اس کے پیغام کی تکمیل کر سکتے تھے.

ان تصریحات سے واضح ہے کہ یَعۡرُجُ اِلَیۡہِ اور اِلَیۡہِ یَصۡعَدُ اور مُہَاجِرٌ و ذَاہِبٌ اِلٰی رَبِّیۡ میں اِلٰی سے مراد کسی خاص مقام کی سمت نہیں بلکہ تکمیلِ مدارج ہے. اسی طرح قصۂ حضرت عیسیٰؑ میں رَفَعَہُ اللّٰہُ اِلَیۡہِ میں اِلَیۡہِ سے مفہوم کوئی خاص سمت نہیں، بلکہ بلندیٔ مدارج ہے. اور یہ لفظ ایک خاص مقصد کے پیشِ نظر استعمال کیا گیا ہے. یہودیوں کا زعم باطل تھا کہ انہوں نے حضرت مسیحؑ کو صلیب پر لٹکا دیا تھا جس سے آپ (معاذ اللہ) لعنت کی موت مرے تھے لعنت کے معنی ہیں دوری (انعاماتِ خداوندی سے دُوری یا محرومی). اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ حضرت عیسیٰؑ صلیب دیئے ہی نہیں گئے (ما صلبوہ) بلکہ وہ اپنی طبعی موت سے وفات پا گئے (متوفیك) اور انہیں انعاماتِ خداوندی سے دُوری نہیں بلکہ قُرب حاصل ہے (بَلۡ رَّفَعَہُ اللّٰہُ اِلَیۡہِ). اب سورۂ آلِ عمران کے ان الفاظ کو پھر سے سامنے لایئے. (اِنِّیۡ مُتَوَفِّیۡکَ وَ رَافِعُکَ اِلَیَّ)

(اے عیسیٰؑ میں تجھے وفات دینے والا اور بلند درجات عطا کرنے والا ہوں) وَ مُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا یعنی تجھے ان کفار کے اتہامات سے پاک اور صاف کرنے والا ہوں (۳/۵۳)۔

یہ تصوّر بعد کی پیداوار ہے

حقیقت یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے زندہ آسمان پر اُٹھا لئے جانے کا تصوّر مذہب عیسائیت میں بعد کی اختراع ہے۔ یہودیوں نے مشہور کر دیا (اور بظاہر نظر بھی ایسا ہی آتا تھا) کہ انہوں نے حضرت مسیحؑ کو صلیب پر قتل کر دیا ہے۔ حواریوں کو معلوم تھا کہ حقیقتِ حال یہ نہیں۔ لیکن وہ بھی بہ تقاضائے مصلحت اس کی تردید نہیں کر سکتے تھے (اور اصل تو یہ ہے کہ واقعۂ تصلیب کے بعد خود حواریوں کے متعلق بھی بالتحقیق معلوم نہیں کہ وہ کہاں رہے اور کیا کرتے رہے۔ کچھ عرصے کے بعد حالات نے پلٹا کھایا اور ان کا نام پھر سننے میں آیا) اس دوران میں یہ خیال عام ہو چکا اور پختگی حاصل کر چکا تھا کہ حضرت مسیحؑ مصلوب ہو چکے ہیں۔ جب حواریوں کو قدرے سکون حاصل ہؤا تو انہوں نے مختلف روایات کو یک جا کر کے اناجیل مرتب کیں (سب سے پہلی انجیل ۶۵ء میں مرتب ہوئی تھی)۔ اس وقت یہ کہنا کہ جس شخص کو صلیب دی گئی تھی وہ حضرت مسیحؑ نہیں کوئی اور تھا۔ ایک ایسا دعوےٰ تھا جس کی ہر طرف سے تردید (ہی نہیں بلکہ تضحیک) ہوتی۔ اس لئے اس عام خیال کی تردید کئے بغیر، حضرت مسیحؑ کی عظمت کو برقرار رکھنے کا ایک ہی طریق ہو سکتا تھا کہ ان کے متعلق یہ مشہور کر دیا جائے کہ وہ صلیب کے تیسرے دن جی اُٹھے اور پھر آسمان کی طرف اٹھائے گئے۔ اناجیل میں دیکھئے۔ متی اور یوحنا کی اناجیل میں آسمان کی طرف اٹھائے جانے کے واقعہ کا کوئی ذکر نہیں۔ مرقس اور لوقا میں اخیر میں صرف ایک فقرہ میں اس کا ذکر آیا ہے "غرض خداوند یسوع ان سے کلام کرنے کے بعد آسمان پر اٹھایا گیا" (مرقس ۱۶/۱۹، لوقا ۲۴/۵۱)۔ حتّٰی کہ حضرت مسیحؑ کے دوبارہ جی اُٹھنے کے متعلق بھی تمام اناجیل میں صرف مریم مگدلینی ہی عینی شاہد ہے (رینان صـ۲۹۶) اور مریم مگدلینی وہی ہے جس میں سے اناجیل کے بیان کے مطابق حضرت مسیحؑ نے سات بدروحوں کو نکالا تھا (متی ۱۶/۹) —

عیسائیوں نے رَفَعَ اِلَى السَّمَآءِ کا جو عقیدہ پھیلایا اس سے نہ صرف حضرت مسیحؑ کی عظمت اور بزرگی کو ہی مقامِ الوہیت تک پہنچا دیا بلکہ شکستہ خاطر، افسردہ اور پژمردہ جماعت کے لئے مایوسیوں کی تاریکی میں اُمید کی ایک کرن بھی پیدا کر دی کہ وہ آنیوالا آئے گا اور اس کے ساتھ ہی انہیں عظمت و اقتدار کی ایک نئی زندگی عطا کرے گا ("آنے والے" کے عقیدہ کے متعلق "ختمِ نبوت"

وہ آنے والا! کے عنوان کے تحت "معراجِ انسانیت" میں تفصیل سے لکھا گیا ہے، حالانکہ حضرت عیسیٰؑ نے اپنے آنے کے متعلق نہیں بلکہ اُس آنے والے کے متعلق کہا تھا جس کا اسمِ گرامی احمدؐ تھا۔ گرفتاری سے تھوڑی دیر پہلے (اناجیل کے بیان کے مطابق) حضرت مسیحؑ نے اپنے شاگردوں سے وعظ و نصیحت کے بعد فرمایا۔

لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لئے فائدہ مند ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار تمہارے پاس نہ آئے گا، لیکن اگر جاؤں گا تو اُسے تمہارے پاس بھیجدوں گا اور وہ آکر دنیا کو گناہ اور راستبازی اور عدالت کے بارے میں قصوروار ٹھہرائے گا گناہ کے بارے میں اسلئے کہ وہ مجھ پر ایمان نہیں لاتے o راستبازی کے بارے میں اس لئے کہ میں باپ کے پاس جاتا ہوں اور تم مجھے پھر نہ دیکھو گے o عدالت کے بارے میں اس لئے کہ دنیا کا سردار مجرم ٹھہرایا گیا ہے o مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنی ہیں مگر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے o لیکن جب وہ یعنی سچائی کی روح آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا۔ اس لئے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہے گا اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا o وہ میرا جلال ظاہر کرے گا۔ اس لئے کہ مجھ ہی سے حاصل کر کے تمہیں خبریں دے گا o (یوحنا ۱۶/۷ — ۱۴)

اور اس سے ذرا پہلے۔

لیکن جب وہ مددگار آئے گا جس کو میں تمہارے پاس باپ کی طرف سے بھیجوں گا یعنی سچائی کا روح جو باپ کی طرف سے نکلتا ہے تو وہ میری گواہی دے گا o اور تم بھی گواہ ہو کیونکہ شروع ہی سے میرے ساتھ ہو o

(یوحنا ۱۵/۲۶ — ۲۷)

حضرت مسیحؑ کی اس پیشگوئی کے متعلق دنیائے عیسائیت نے مختلف زمانوں میں جس قدر تحریف سے کام لیا ہے اُس کی تفصیل میں اُلجھے بغیر صرف اس ایک چیز سے اندازہ کر لیجئے کہ اس وقت ہمارے سامنے ۱۸۳۷ء کا شائع کردہ (انگریزی) بائیبل کا "مستند" نسخہ ہے جس میں اس آنے والے کے لئے COMFORTER کا لفظ لکھا ہے اور ۱۹۲۲ء کے اُردو ترجمہ میں (جو خود برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی کا شائع کردہ ہے) اسے "مددگار" لکھا ہے۔ COMFORTER اور "مددگار" میں

جس قدر فرق ہے اس سے انگریزی زبان کا ایک مبتدی بھی واقف ہے۔ اسی سے اندازہ لگا لیجئے کہ اصل انجیل اور آج کے مروّجہ نسخوں میں کس قدر اختلاف ہو چکا ہے۔ چنانچہ انجیل برناباس میں اس آنے والے کا نام تک بھی لکھا ہے اور ایک جگہ نہیں، کم از کم دس جگہ لکھا ہے[1]۔ آخری مرتبہ آپ نے اپنے شاگردوں سے فرمایا۔

> پس جبکہ آدمیوں نے مجھ کو اللہ اور اللہ کا بیٹا کہا تھا۔ مگر یہ کہ میں خود دنیا میں بے گناہ تھا اس لئے اللہ نے ارادہ کیا کہ اس دنیا میں آدمی یہوداہ کی موت سے مجھ سے ٹھٹھا کریں، یہ خیال کر کے کہ وہ میں ہی ہوں جو کہ صلیب پر مرا ہوں تاکہ قیامت کے دن میں شیطان مجھ سے ٹھٹھا نہ کریں اور یہ بدنامی اس وقت تک باقی رہے گی جبکہ محمد رسول اللہ آئے گا جو کہ آتے ہی اس فریب کو ان لوگوں پر کھول دے گا جو کہ اللہ کی شریعت پر ایمان لائیں گے۔
>
> (برناباس فصل ۲۲۴ : ص ۳۰۶)

فارقلیط

حضرت عیسیٰؑ کی زبان ارامی تھی لیکن چونکہ ارامی زبان میں انجیل کا کوئی نسخہ دنیا میں موجود نہیں، اس لئے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ آپ نے اس آنے والے کے لئے کیا لفظ استعمال کیا تھا۔ یونانی ترجمہ میں فارقلیط کا لفظ آیا ہے۔ قرآن کریم میں اس پیشگوئی کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے۔

وَإِذْ قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُم مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِن بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ ۖ فَلَمَّا جَاءَهُم بِالْبَيِّنَاتِ قَالُوا هَٰذَا سِحْرٌ مُّبِينٌ ﴿۶۱/۶﴾

اور یاد کرو جب مریم کے بیٹے عیسیٰؑ نے کہا تھا کہ اے بنی اسرائیل! میں تمہاری طرف خدا کا بھیجا ہوا رسول ہوں جو اس تورات کے دعاوی کو سچ کر کے دکھانے کے لئے آیا ہوں جو میرے سامنے موجود ہے اور ایک رسول کی خوشخبری دینے کے لئے آیا ہوں جس کا نام احمد

---

[1] دیکھئے برناباس صفحات ۲۲؛ ۶۶؛ ۹۹؛ ۱۱۰؛ ۱۲۴؛ ۱۴۶؛ ۱۴۷؛ ۲۴۳؛ ۲۹۴۔

ہوگا۔ مگر (دیکھو) جب وہ رسول (احمد) واضح دلائل و براہین کے ساتھ آگیا تو یہ لوگ کہنے
لگے کہ وہ تو (اپنے دعوائے نبوت میں) صاف صاف جھوٹا ہے۔

یہ ہیں تفاصیل حضرت عیسیٰؑ کی حیاتِ طیبہ کے آخری مراحل کے متعلق۔ وفاتِ حضرت مسیحؑ کے مسئلہ کو اتنی اہمیت کیوں حاصل ہے' اس کے متعلق ذرا آگے چل کر لکھا جائے گا۔

یہودیوں کی آخری تباہی

حضرت عیسیٰؑ بنی اسرائیل کی طرف' قانونِ خداوندی کی آخری حجت کے اتمام کے لئے آئے۔ قوم نے ان کے ساتھ جو کچھ کیا اس کے بعد کونسی چیز باقی رہ گئی تھی جو قانونِ مکافات کی نتیجہ خیزی میں تاخیر کا موجب ہوتی؟ ان کی سرکشی اور معصیت کوشی' قہرِ الٰہی کے گرجتے ہوئے بادلوں اور کڑکتی ہوئی بجلیوں کی صورت میں ان کے سر پر آ گئی جس سے اب نجات کی کوئی راہ نہ تھی۔ باہمی خانہ جنگیوں سے ملک خونخوار درندوں کا بھٹ بن گیا۔ قتل و غارت گری، سلب و نہب' لوٹ مار زندگی کا عام انداز ہوگیا۔ یہودیوں کو "ایک آنے والے" کا انتظار تو تھا ہی' ہر فریب کار نے اس عقیدہ سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور ان میں کتنے ہی جھوٹے نبی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ملک کی بدامنی اس درجہ بڑھ گئی کہ اس شورش کو فرو کرنے کے لئے شاہنشاہ یزد کو ایک خاص جرنیل متعین کرنا پڑا۔ اس سے بھی کام نہ چلا تو ایک دوسرے قہرمانی جرنیل کو بھیجا۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے الفاظ میں:

> سنہ۔ اب (مہینے) کی دسویں تاریخ کو' ایسے خوف و ہراس کے عالم میں جس کی نظیر دنیا میں کہیں نہیں ملتی، سقوطِ یروشلم عمل میں آیا۔ ہیکل کو جلا دیا گیا اور اس طرح یہودی سلطنت کا خاتمہ ہوگیا۔

اور یہ سب کچھ خدا کے مقرر کردہ قانونِ مکافات کے مطابق واقع ہوا جس کی خبر حضرت عیسیٰؑ نے پہلے ہی دے رکھی تھی۔

> اور یسوع ہیکل سے نکل کر جا رہا تھا کہ اس کے شاگرد اُس کے پاس آئے تاکہ اسے ہیکل کی عمارتیں دکھائیں۔ اس نے جواب میں اُن سے کہا کیا تم ان سب چیزوں کو نہیں دیکھتے؟ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ یہاں کسی پتھر پر پتھر باقی نہ رہے گا جو گرایا نہ جائے گا۔
> (متی ۱-۲/۲۴)

اس طرح، ڈیڑھ ہزار برس کے گہوارۂ عروج و زوال کے بعد، بنی اسرائیل کا نام زندہ قوموں کی فہرست سے مٹ گیا اور خدا کا وہ جلیل القدر عہد جو اس نے اپنے مخلص بندے (حضرت ابراہیمؑ) کے ساتھ کیا تھا، اسرائیل کے گھرانے سے شاخِ اسمٰعیلؑ کی طرف منتقل ہو گیا۔ وہ شاخ جسے حضور خاتم الانبیاءؐ کی شکل میں قیامت تک کے لئے سرسبز و شاداب رہنا تھا۔ كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ (۱۴/۲۴) اس شجرِ مقدّس کی طرح جس کی جڑیں پتال میں ہوں اور شاخیں جھوم جھوم کر آسمان کی پیشانی چوم رہی ہوں۔ اس آنے والے انقلاب کی خبر بھی حضرت عیسیٰؑ نے دیدی تھی جب آپ نے اپنے مخصوص تمثیلی انداز میں فرمایا تھا۔

شاخِ اسمٰعیلؑ

ایک اور تمثیل سنو۔ ایک گھر کا مالک تھا جس نے انگوری باغ لگایا اور اس کے چاروں طرف احاطہ گھیرا اور اس میں حوض کھودا اور برج بنایا اور اُسے باغبانوں کو ٹھیکے پر دیکر پردیس چلا گیا اور جب پھل کا موسم قریب آیا تو اس نے اپنے نوکروں کو باغبانوں کے پاس اپنا پھل لینے کو بھیجا۔ اور باغبانوں نے اس کے نوکروں کو پکڑ کر کسی کو پیٹا اور کسی کو قتل کیا اور کسی کو سنگسار کیا۔ پھر اس نے اور نوکروں کو بھیجا جو پہلوں سے زیادہ تھے اور انہوں نے ان کے ساتھ بھی اسی طرح کیا۔ آخر اس نے اپنے بیٹے کو ان کے پاس یہ کہہ کر بھیجا کہ وہ میرے بیٹے کا تو لحاظ کریں گے۔ جب باغبانوں نے بیٹے کو دیکھا تو آپس میں کہا کہ یہی وارث ہے۔ آؤ اسے قتل کر کے اس کی میراث پر قبضہ کر لیں؟ اور اسے پکڑ کر باغ سے نکالا اور قتل کر دیا۔ پس جب باغ کا مالک آئے گا تو ان باغبانوں کے ساتھ کیا کریگا؟ انہوں نے اُس سے کہا اُن بُرے آدمیوں کو بُری طرح ہلاک کرے گا اور باغ کا ٹھیکہ دوسرے باغبانوں کو دے گا جو موسم پر اس کو پھل دیں۔ یسوع نے ان سے کہا کیا تم نے کتابِ مقدس میں کبھی پڑھا کہ

"جس پتھر کو معماروں نے رد کیا، وہی کونے کے سرے کا پتھر ہو گیا۔ یہ خداوند کی طرف سے ہوا اور ہماری نظر میں عجیب ہے۔"

اس لئے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہت تم سے لے لی جائے گی اور اس قوم کو جو اُس کے پھل لائے، دیدی جائے گی۔ اور جو اس پتھر پر گرے گا اس کے ٹکڑے ٹکڑے

ہو جائیں گے مگر جس پر وہ گرے گا اُسے پیس ڈالے گا۔

اور جب سردار کاہنوں اور فریسیوں نے اُس سے تمثیلیں سُنیں تو سمجھ گئے کہ ہمارے حق میں کہتا ہے۔ (متی ۲۳ — ۲۱/۴۵)

اسی السّاعت کی نشانی حضرت عیسیٰؑ تھے

اور یہ انقلاب بنی اسرائیل کے لئے حادثۂ قیامت سے کم نہ تھا کہ ایسی عظیم الشّان قوم کا اس طرح مٹ جانا' قیامت نہیں تو اور کیا ہے؟ یہی وہ اَلسَّاعَۃ (موت کی گھڑی) تھی جس کے لئے حضرت عیسیٰؑ کو بطور نشانی بھیجا گیا تھا۔ وَ اِنَّہٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَۃِ[1] (۴۳/۶۱) اور یہ گھڑی اس طرح سر پر آپہنچی کہ انہیں خبر تک بھی نہ ہوئی۔

وَ لَمَّا جَآءَ عِیْسٰی بِالْبَیِّنٰتِ قَالَ قَدْ جِئْتُکُمْ بِالْحِکْمَۃِ وَلِاُبَیِّنَ لَکُمْ بَعْضَ الَّذِیْ تَخْتَلِفُوْنَ فِیْہِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوْنِ ۝ اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ رَبِّیْ وَ رَبُّکُمْ فَاعْبُدُوْہُ ۭ ھٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ ۝ فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَیْنِھِمْ ۚ فَوَیْلٌ لِّلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْ عَذَابِ یَوْمٍ اَلِیْمٍ ۝ ھَلْ یَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَۃَ اَنْ تَاْتِیَھُمْ بَغْتَۃً وَّ ھُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ ۝ (۴۳ — ۴۳/۶۶)

اور جب واضح دلائل کے ساتھ عیسیٰ (بنی اسرائیل کے پاس) آیا اور اُس نے کہا "میں تمہارے پاس حکمت (و عظمت کی باتیں) لایا ہوں (اور اس لئے آیا ہوں کہ) تاکہ تمہارے لئے وہ بعض باتیں واضح کردوں جن میں تم اختلاف کرتے رہے ہو۔ پس تم قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو اور میری اطاعت کرو۔ بلاشبہ اللہ ہی میرا اور تمہارا (سب کا) پروردگار ہے۔

---

[1] اس میں شبہ نہیں کہ قرآنِ کریم میں السّاعۃ قیامت کے لئے آیا ہے لیکن اس کے معنی انقلاب بھی ہیں اور جن اعمال کی سزا اس دنیا میں ملتی ہے ان کے ظہورِ نتائج کے لئے بھی السّاعۃ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ یہ السّاعۃ جس کی نشانی حضرت عیسیٰؑ تھے' وہ انقلابِ عظیم تھا جس نے دنیا بھر کی برکتیں بنی اسرائیل سے چھین کر اُمّتِ مسلمہ کے حوالے کردیں اور اس طرح یہ انقلاب نبیٔ اکرمؐ کے مقدس ہاتھوں سے عمل میں آیا۔

لہٰذا اُسی کی عبودیت (محکومیت واطاعت) اختیار کرو۔ یہی سیدھا راستہ ہے۔" (مگر اُن پر کوئی اثر نہ ہوا) چنانچہ وہ جماعتیں آپس میں اختلاف کرنے لگیں۔ بس دردناک دن کے عذاب کی وجہ سے ان لوگوں کے لئے بربادی ہے جنہوں نے (اپنی جانوں پر) ظلم کیا ہے۔ (معلوم ہوتا ہے کہ) وہ لوگ انتظار نہیں کر رہے ہیں مگر الساعۃ کا کہ وہ ان کے پاس اس طرح یکبارگی آپہنچے کہ انہیں پتہ بھی نہ چلے۔

انہوں نے اللہ کی اس گراں بہا نعمت کو ٹھکرا دیا جو حضرت عیسیٰؑ کی وساطت سے انہیں ملنے والی تھی اور تھوڑے ہی عرصہ میں خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ حضرت عیسیٰؑ کے وہی متبعین جو اس وقت کمزور و ناتواں نظر آتے تھے کس طرح ان پر غالب آگئے (پہلے عیسائی اور پھر حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم کے صحیح متبع' جماعت مؤمنین)۔

وَ جَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ○ فَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فِى الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ۫ وَ مَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ○ (۵۵-۵۶/۳)

اور جن لوگوں نے تیری پیروی کی ہے' انہیں قیامت تک تیرے منکروں پر برتری دوں گا اور بالآخر تم سب کو میری ہی طرف لوٹنا ہے۔ سو اُس دن ان باتوں کا فیصلہ کر دوں گا جن میں تم ایک دوسرے سے اختلاف کرتے رہے ہو!

پھر جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے' تو انہیں دنیا و آخرت' دونوں جگہ سخت عذاب دوں گا اور (عذابِ الٰہی سے بچانے میں) کوئی بھی ان کا مددگار نہ ہو گا۔"

"عَذَابًا شَدِيْدًا فِى الدُّنْيَا" کو سامنے رکھیئے اور پھر اللہ کے قانونِ مکافاتِ عمل کی جزرسی پر غور کیجئے کہ یہ شوریدہ بخت قوم' کس ذلت و رسوائی اور محکومی و بے کسی کے عذاب میں مبتلا ہوئی۔

حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

پیدائشِ حضرت عیسیٰؑ کے متعلق مزید تصریحات

حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کے متعلق اناجیل کا بیان اور قرآنِ کریم کی متعلقہ آیات شروع میں درج کی جاچکی ہیں. لیکن اس مسئلہ نے قلوب واذہان میں جس قدر اہمیت اختیار کر رکھی ہے وہ مزید تفصیلِ بحث کی متقاضی ہے. عیسائیوں کے ہاں اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگ سکتا ہے کہ ان کے مذہب کی تمام عمارت اسی بنیاد پر قائم ہے. ابنیت والوہیتِ مسیحؑ کے عقائد اسی بنا پر قائم ہیں کہ آپ کی پیدائش بغیر باپ کے ہوئی. لیکن خود ہمارے ہاں بھی اس کی اہمیت کچھ کم نہیں (اس کے وجوہات آگے چل کر ملیں گے). ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ قرآنِ کریم کا اس باب میں کیا ارشاد ہے. قرآن نے جن مقامات پر ولادتِ حضرت عیسیٰؑ کا ذکر کیا ہے انہیں غور سے دیکھئے اور جس نتیجہ پر وہ مقامات پہنچا دیں انہیں صحیح سمجھئے. یہ ہوسکتا ہے کہ بعض مقامات، کے یقینی مفہوم متعین کرنے میں ابھی زمانہ کی علمی سطح کے اور بلند ہونے کا انتظار کرنا پڑے تاآنکہ تاریخی انکشافات واثری تحقیقات ان متشابہ آیات کو محکمات میں بدل دیں. قرآن نے خود اپنے متعلق کہا ہے کہ جوں جوں "آیاتِ خداوندی" انفس وآفاق میں بے نقاب ہوتی جائیں گی قرآن کے دعاوی ثبت حقائق کی شکل میں سامنے آتے جائیں گے، یعنی اس کے حقائق انسانی علم کی سطح کی بلندی کے ساتھ ساتھ کھلتے جائیں گے. لہٰذا ہم ان حقائق کو اپنے زمانے کی علمی سطح کے مطابق ہی سمجھ سکتے ہیں. باقی رہا یہ کہ ہم اپنے ذہن میں پہلے ایک عقیدہ قائم کرلیں اور پھر اس کے تائیدی شواہد تلاش کرنے کے لئے قرآنِ کریم کی ورق گردانی کریں، تو یہ "تدبّر فی القرآن" کا ایسا غلط طریقہ ہے جسے درحقیقت تدبّر فی القرآن کہنا ہی غلط ہے. قرآنِ کریم کو اپنے خیالات وتصورات کے تابع لے آنا، بہت بڑی جسارت ہے. اس سے دلوں پر مہریں لگ جاتی ہیں اور آنکھوں پر پردے پڑجاتے ہیں. قرآنِ کریم کو خالی الذہن ہوکر سمجھنے کی کوشش کیجئے. اس کے بعد اگر ایسی باتیں سامنے آئیں جو سردست آپ کی سمجھ میں نہیں آتیں تو قرآنی حقائق کو کھینچ تان کر اپنی عقل کے قالب میں ڈھالنے کی سعیٔ ناکام نہ کیجئے بلکہ قرآنی حقائق کو اپنی جگہ محکم اور اٹل سمجھتے ہوئے انتظار کیجئے تاآنکہ مزید تحقیق وتدبّر آپ کی عقل میں اتنی وسعت پیدا کردے کہ اس میں قرآنی حقائق سما سکیں. اگر قرآنِ کریم کا یہ ارشاد ہو کہ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش بغیر باپ کے ظہور میں آئی تھی تو بلا ادنیٰ تأمل ہمارا اس پر ایمان ہے. ہم ہر لحظہ بدلنے والی عقل کی خاطر، نہ بدلنے والے

حقائق کو رکیک تاویلات سے موڑ توڑ نہیں سکتے، اور اگر قرآن کریم اس طرف لے جائے کہ آپ کی پیدائش عام انداز کے مطابق ہوئی تھی تو محض اس لئے کہ اس سے ایک ایسے عقیدہ کی تردید ہوتی ہے جو ہم میں ایک عرصہ سے متوارث چلا آرہا ہے، بے معنی نکتہ آفرینیوں اور دور از کار موشگافیوں کی سعیٔ لاحاصل بھی خود فریبی سے زیادہ نہیں۔ ہمارے تمام رجحانات و معتقدات، قرآن کے تابع ہونے چاہئیں اور بس!

اناجیل کا بیان

قرآن کریم تک آنے سے پیشتر ہمیں ایک بار پھر اناجیل پر غور کر لینا چاہیئے۔ اناجیل جیسی کچھ بھی آج ہیں، بہرحال انہی کے بیانات کو سامنے رکھا جائے گا (اس کے سوا چارہ ہی کیا ہے)۔ حضرت عیسیٰؑ کی مافوق الفطرت پیدائش کا ذکر متی اور لوقا کی اناجیل میں ہے۔ مرقس اور یوحنا کی اناجیل میں اس کا ذکر کہیں نہیں آیا۔ حالانکہ مرقس (تاریخی تحقیق کی رُو سے) اناجیلِ اربعہ میں سب سے پہلی اور باقی اناجیل کی ماخذ ہے۔ اور یوحنا حواری عیسائیوں کے نزدیک بہت برگزیدہ اور حضرت مسیحؑ کے خاص معتمد علیہ تھے۔

ہرچند متی اور لوقا کے متعلقہ اقتباسات پہلے بھی گذر چکے ہیں لیکن موضوع کو بیک وقت سامنے لانے کے لئے ان اقتباسات کا دوبارہ نقل کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ انجیل متی میں ہے۔

> اب یسوع مسیح کی پیدائش اس طرح ہوئی کہ جب اس کی ماں مریم کی منگنی یوسف کے ساتھ ہوگئی تو ان کے اکٹھے ہونے سے پہلے وہ روح القدس کی قدرت سے حاملہ ہوگئی۔ پس اُس کے شوہر یوسف نے جو راستباز تھا اور اسے بدنام کرنا نہیں چاہتا تھا چپکے سے اس کے چھوڑ دینے کا ارادہ کیا۔ وہ ان باتوں کو سوچ ہی رہا تھا کہ خداوند کے فرشتے نے اسے خواب میں دکھائی دے کر کہا اے یوسف ابن داؤد، اپنی بیوی مریم کو اپنے ہاں لے آنے سے نہ ڈر کیونکہ جو اُس کے پیٹ میں ہے وہ روح القدس کی قدرت سے ہے۔ وہ بیٹا جنے گی اور تُو اس کا نام یسوع رکھنا کیونکہ وہی اپنے لوگوں کو انکے گناہوں سے نجات دیگا۔ یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ جو خداوند نے نبی کی معرفت کہا تھا وہ پورا ہو کہ دیکھو ایک کنواری حاملہ ہوگی اور بیٹا جنے گی اور اس کا نام عمانوایل رکھیں گے۔
>
> (متی ۱۸ــ ۱/۲۳)

اس سے ظاہر ہے کہ (متیٰ کے بیان کے مطابق) حضرت مسیحؑ کی پیدائش بغیر باپ کے ہوئی تھی اور اس پیشگوئی کے مطابق جو اس سے پیشتر کی گئی تھی، یہ پیشگوئی تورات میں یوں مذکور ہے:۔

تب نبی نے کہا اے داؤد کے خاندان اب سنو۔ انسان کو تھکانا تمہارے آگے نہایت چھوٹی بات ہے۔ سو کیا تم میرے خدا کو بھی تھکاؤ گے؟ باوجود اس کے خداوند آپ تم کو ایک نشان دیگا۔ دیکھو ایک کنواری حاملہ ہوگی اور بیٹا جنے گی اور اس کا نام عمانوایل رکھے گی۔ وہ شہد اور دہی کھائے گا۔ جس وقت کہ وہ بُرا ترک کرنے کا اور بھلا پسند کرنے کا امتیاز پائے۔ پر اُس سے آگے کہ یہ لڑکا بد ترک کرنے کا اور نیک پسند کرنے کا امتیاز پائے یہ سرزمین جسے تو برباد کرتا ہے اپنے دونوں بادشاہوں سے چھوڑی جائے گی۔

(یسعیاہ ۱۳ــــ ۷/۱۶)

اس پیشگوئی کے متعلق خود عیسائیوں میں عجیب و غریب اختلافات ہیں۔ ایک عیسائی محقق (ڈاکٹر ڈیوڈسن) نے (کتاب یسعیاہ کی شرح میں) لکھا ہے کہ یسعیاہ نبی نے درحقیقت جو کچھ فرمایا تھا وہ اتنا ہی تھا کہ "ایک نوجوان لڑکی جو شادی کے قابل ہوگی، بیٹا جنے گی"۔ لیکن جب اس کتاب (یسعیاہ) کا یونانی میں ترجمہ ہوا تو اس کے بجائے "کنواری" کا لفظ لکھ دیا گیا۔ دوسرے محققین کا خیال ہے کہ اس پیشگوئی کا تعلق حضرت مسیحؑ سے ہے ہی نہیں۔ یسعیاہ نبی کا زمانہ حضرت مسیحؑ سے قریب ۷۵۰ برس پیشتر کا ہے اور انہوں نے اس پیشگوئی میں اپنے زمانہ کے بادشاہ کو تسلی دی ہے۔ لہٰذا یہ واقعہ اسی زمانے میں ظہور پذیر ہو جانا چاہیئے تھا۔

یہ تھا بہرحال انجیل متیٰ کا بیان۔ اب انجیل لوقا کا بیان ملاحظہ فرمایئے۔

چھٹے مہینے جبرائیل فرشتہ خدا کی طرف سے گلیل کے ایک شہر میں جس کا نام ناصرہ تھا ایک کنواری کے پاس بھیجا گیا جس کی منگنی داؤد کے گھرانے کے ایک مرد یوسف نام سے ہوئی تھی اور اس کنواری کا نام مریم تھا اور فرشتے نے اس کے پاس اندر آکر کہا سلام تجھ کو جس پر فضل ہوا ہے! خداوند تیرے ساتھ ہے۔ وہ اس کلام سے بہت گھبرا گئی اور سوچنے لگی کہ یہ کیسا سلام ہے۔ فرشتے نے اس سے کہا اے مریم! خوف نہ کر کیونکہ خدا کی طرف سے تجھ پر فضل ہوا ہے اور دیکھ تو حاملہ ہوگی اور بیٹا جنے گی۔ اس کا نام یسوع رکھنا۔ وہ بزرگ ہوگا

اور خدا تعالیٰ کا بیٹا کہلائے گا اور خداوند خدا اس کے باپ داؤد کا تخت اسے دے گا٥
اور وہ یعقوب کے گھرانے پر ابد تک بادشاہی کرے گا اور اس کی بادشاہی کا آخر نہ ہوگا٥
مریم نے فرشتے سے کہا یہ کیونکر ہوگا جس حال میں کہ میں مرد کو نہیں جانتی ؟٥ اور فرشتے نے
جواب میں اُس سے کہا کہ رُوح القدس تجھ پر نازل ہوگا اور خدا تعالیٰ کی قدرت تجھ پر سایہ
ڈالے گی اور اس سبب سے وہ پاکیزہ جو پیدا ہونے والا ہے خدا کا بیٹا کہلائے گا٥
(لوقا ۲۶ـــ۱/۳۵)

دیکھئے! خود متی اور لوقا کے بیانات میں بھی کس قدر اختلاف ہے۔

ابن یوسف

اب اس سے آگے بڑھئے۔ خود لوقا نے حضرت مسیحؑ کو یوسف کا بیٹا لکھا ہے۔
وہ اسے دیکھ کر حیران ہوئے اور اس کی ماں نے اُس سے کہا بیٹا! تُو نے
کیوں ہم سے ایسا کیا ؟ دیکھ تیرا باپ اور میں کڑھتے ہوئے تجھے ڈھونڈتے تھے٥
(لوقا ۲/۴۸)

دوسری جگہ ہے۔
اور اُس کا باپ اور اس کی ماں ان باتوں پر جو اس کے حق میں کہی جاتی تھیں، تعجب کرتے
تھے٥ (لوقا ۲/۳۳)

یوحنا کی انجیل میں بھی اسی طرح حضرت عیسیٰؑ کو یوسف کا بیٹا کہا ہے۔
فلپّس نے نتن ایل سے مل کر اُس سے کہا کہ جس کا ذکر موسیٰ نے توریت میں اور نبیوں نے
کیا ہے وہ ہم کو مل گیا۔ وہ یوسف کا بیٹا یسوع ناصری ہے٥ (یوحنا ۱/۴۵)

دوسری جگہ ہے۔
اور انہوں نے کہا کیا یوسف کا بیٹا یسوع نہیں ہے جس کے باپ اور ماں کو ہم جانتے
ہیں، اب یہ کیونکر کہتا ہے کہ میں آسمان سے اُترا ہوں ؟٥ (یوحنا ۶/۴۲)

متی کی انجیل میں ہے۔
جب یسوع یہ تمثیلیں ختم کر چکا تو ایسا ہوا کہ وہاں سے روانہ ہوگیا اور اپنے وطن میں آکر
ان کے عبادت خانے میں انہیں ایسی تعلیم دینے لگا کہ وہ حیران ہو کر بولے کہ اس کو یہ حکمت

اور معجزے کہاں سے مل گئے ؟ کیا یہ بڑھئی کا بیٹا نہیں ؟ اور اس کی ماں کا نام مریم اور اس
کے بھائی یعقوب اور یوسف اور شمعون اور یہوداہ نہیں ؟ (متی ۵۳ ـ ۱۳/۵۵)

پھر اناجیل میں یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ حضرت داؤدؑ کی نسل سے تھے اور لوقا اور متی میں حضرت مسیحؑ کا جو نسب نامہ دیا گیا ہے (وہ اگرچہ ایک دوسرے سے مختلف ہے) وہ یوسف نجار ہی سے حضرت داؤدؑ تک پہنچتا ہے ۔ متی کی انجیل (باب اوّل) میں یہ نسب نامہ حضرت ابراہیمؑ سے نیچے کی طرف آتا ہے۔ اور اخیر میں لکھا ہے " اور متان سے یعقوب پیدا ہوا اور یعقوب سے یوسف پیدا ہوا جو اس مریم کا شوہر تھا جس سے یسوع پیدا ہوا جو مسیحؑ کہلاتا ہے " (متی ۱/۱۶) ۔ لوقا کی انجیل میں یہ نسب نامہ حضرت مسیحؑ سے اوپر کو آدم تک گیا ہے ۔ اس طرح کہ " جب یسوع خود تعلیم دینے لگا تو تئیس برس کا تھا اور (جیسا کہ سمجھا جاتا تھا) یوسف کا بیٹا تھا اور وہ عیلی کا اور وہ متات کا .... اور وہ سیت کا اور وہ آدم کا اور وہ خدا کا تھا " (لوقا ۳۸ ـ ۳/۲۳) ۔ غور فرمایا آپ نے کہ حضرت مسیحؑ کے متعلق اناجیل میں مذکور ہے کہ وہ حضرت داؤدؑ کی نسل سے تھا اور یہ سلسلہ یوسف نجار کی وساطت سے حضرت داؤدؑ تک پہنچتا ہے ۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ان نسب ناموں کی رُو سے بھی حضرت مسیحؑ ، یوسف کے بیٹے ہی قرار پاتے ہیں اور ، جیسا کہ لوقا کی انجیل میں لکھا ہے ، آپ کو ایسا ہی سمجھا جاتا تھا ۔ ابن اللہ (یا بغیر باپ کے پیدائش) کا عقیدہ بہت بعد کی پیداوار ہے ، یعنی جب مسیحیت پر سینٹ پال[1] کے معتقدات کا رنگ غالب آ گیا تو اُس وقت ابنیت کا عقیدہ بھی مذہبِ عیسوی میں داخل ہو گیا ۔

عقیدۂ ابنیت

رومیوں کے نام سینٹ پال کے خط میں مذکور ہے ۔

مسیح جسم کے اعتبار سے تو داؤدؑ کی نسل سے پیدا ہوا لیکن پاکیزگی کی روح کے اعتبار
اور مُردوں میں سے جی اُٹھنے کے سبب سے قدرت کے ساتھ خدا کا بیٹا ٹھہرا ۔
(رومیوں کے نام ۱/۴)

---

[1] سینٹ پال روما کا ایک متشدد یہودی تھا جس نے حضرت عیسیٰؑ کے متبعین کی مخالفت اور تعذیب میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی ۔ ازاں بعد وہ خود عیسائی ہو گیا اور اس نے ایک ایسا مذہب ایجاد کیا جسے اصل عیسائیت سے دور کا بھی علاقہ نہ تھا ۔ ابنیت ، الوہیت ، تثلیث ، کفارہ وغیرہ کے عقائد اسی کے مفتریات سے ہیں ۔

یہاں سے عقیدۂ ابنیت کی پہلی اینٹ رکھی گئی۔ اور اگرچہ اس میں جسمانی اور روحانی کا فرق ملحوظ رکھا گیا، لیکن جب ذرا آگے چل کر مذہب میں اور غلو ہوا تو یہ فرق بھی مٹ گیا۔ چنانچہ جب (۳۲۵ئہ میں) نیقیہ کی مشہور کونسل منعقد ہوئی ہے تو اس میں اس سوال نے بڑی اہمیت حاصل کر لی کہ اقانیم ثلاثہ (باپ، بیٹا، روح القدس) میں حضرت مسیحؑ کا درجہ کیا ہے؟ بعض کی رائے تھی کہ بیٹا، باپ کے مقابلہ میں ازلی نہیں ہو سکتا لیکن کونسل نے اس عقیدہ کو کفر قرار دیا اور فیصلہ کر دیا کہ

> جو شخص یہ دعوےٰ کرے کہ کسی وقت میں خدا کے فرزند کا وجود نہ تھا یا پیدا ہونے سے قبل وہ موجود نہ تھا یا وہ نیست سے ہست کیا گیا یا کسی ایسے مادّہ یا جوہر سے اس کی تخلیق ہوئی جو ربّانی نہیں ہے یا وہ مخلوق یا متغیّر ہے، ایسے شخص کو کلیسائے مقدّس ملعون قرار دیتا ہے۔

اس فتوے کو قسطنطین نے بزورِ حکومت نافذ کر دیا (ملاحظہ ہو "معرکۂ مذہب و سائنس" از ڈریپر[1])۔

اب ظاہر ہے کہ اس قسم کے "خدا کے بیٹے" کو یوسف کا بیٹا کیسے سمجھا جا سکتا تھا۔ اس لئے لامحالہ یہ ماننا پڑا کہ حضرت مسیحؑ کی پیدائش بلا زہنی باپ کے ہوئی ہے۔ یہ ہیں مذہب عیسائیت میں "ابن باپ" کے عقیدہ کے ارتقائی مراحل۔ چنانچہ شروع شروع میں خود عیسائیوں میں ایسے فرقے موجود تھے جو اس عقیدہ کے خلاف تھے، بالخصوص ابیانی فرقہ، جو سینٹ پال سے سخت نفرت کرتا تھا۔ یہ فرقہ چوتھی صدی عیسوی تک موجود تھا لیکن جب مذکورہ صدر فتوے حکومت کے زور پر نافذ ہوا ہے تو یہ فرقہ یا تو رفتہ رفتہ دوسرے عیسائیوں میں جذب ہو گیا یا یہودیوں میں مدغم۔ اس باب میں رینان کی تحقیق بھی قابلِ غور ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

رینان کا بیان

> یہ چیز کہ مسیح کو اس بات کا خواب و خیال تک بھی نہ تھا کہ وہ خدا کے اوتار ہیں، ایک ایسی حقیقت ہے جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ یہ تصور، یہودی ذہنیت تک کے لئے بھی اجنبی تھا اور مختلف اناجیل میں اس کا کہیں سراغ نہیں ملتا۔ ہم اسے صرف یوحنا کی انجیل میں دیکھتے ہیں۔ لیکن یہ مسیح کے خیالات کی ترجمان نہیں کہلا سکتی..... (لیکن تماشا یہ کہ خود انجیل یوحنا میں یہ چیز بھی موجود ہے کہ یہ بہتان کہ مسیح اپنے آپ کو خدا

---

[1] ایڈیشن دوم، ۱۹۹۲ئہ، صفحہ ۴۷۔

یا خدا کا ہمسر کہتا ہے، یہودیوں کا تراشیدہ ہے (دیکھئے یوحنا ۵/۱۸ ; ۱۰/۳۳)۔ اسی انجیل میں مسیح اپنے آپ کو خدا سے کمتر بھی بتاتا ہے (یوحنا ۱۴/۲۸)...... وہ اپنے آپ کو عام آدمیوں سے بلند تر ضرور سمجھتا ہے لیکن اپنے آپ کو خدا سے ایک غیر محدود فاصلہ پر الگ قرار دیتا ہے۔ وہ "خدا کا بیٹا" ہے لیکن سب انسان "خدا کے بیٹے" ہیں یا مختلف طرح کے اعتبار سے "خدا کے بیٹے" بن سکتے ہیں۔ (دیکھئے متی ۵/۹، ۴۵ ; لوقا ۲/۳۸ ; ۶/۳۵، ۲۰/۳۶، یوحنا ۱/۱۲-۱۳ ; ۴/۳۴-۳۳/۱۰، اعمال ۲۹-۱۷/۲۸)...... سامی زبان میں (اور تورات میں) لفظ "بیٹا" کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ (صفحہ ۱۸۱)

عقیدۂ ابنیت کے وضع کرنے کے بعد، عیسائی پیشوائیت ایک عجیب کشمکش میں گرفتار ہوگئی۔ اناجیل میں یہ تصریح موجود تھی کہ یوسف نجار کی شادی حضرت مریمؑ کے ساتھ ہوئی تھی۔ اس بیان کی موجودگی میں یہ ثابت کرنا مشکل تھا کہ حضرت مسیحؑ، یوسف کے بیٹے نہیں تھے، یا اس مشکل کا حل دریافت کرنے کے سلسلہ میں بڑی کدو کاوش سے کام لینا پڑا۔ اٹلی کے مشہور مصنف Marcello Graveri نے "حیاتِ مسیح" کے عنوان سے ایک بڑی دلچسپ اور پُراز معلومات کتاب لکھی ہے جس میں تاریخی اور اثری تحقیقات کی روشنی میں عجیب و غریب انکشافات کئے گئے ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ عیسائی پیشوائیت نے یوسف اور مریم کے تعلقات کی گتھی سلجھانے کے لئے یہ عقیدہ وضع کیا کہ ان کی باہمی شادی تو ہوگئی — لیکن

مریم، یوسف سے بالکل اپنے بھائیوں کی طرح محبت کرتی تھی — فرشتوں کی سی محبت۔ اور یوسف بھی مریم کو باعصمت نگاہوں سے دیکھتا تھا — یہ جوڑا کیا تھا؟ ایک کنواری بیوی کا کنوارا خاوند۔ (صفحہ ۳۸)

لیکن اس سلسلہ میں ابھی ایک اور دشوار گذار مرحلہ باقی تھا۔ اناجیل میں یہ بھی مذکور تھا کہ حضرت عیسیٰؑ کے بہن بھائی بھی تھے۔ اس سے حضرت مریم اور یوسف کے زناشوئی کے تعلقات کا ثبوت ملتا تھا اور عیسائیت اس تصور کو برداشت نہیں کرسکتی تھی کہ وہ اپنے "خدا کی والدہ" کو جنسی کثافتوں میں ملوث دیکھے۔ اس مشکل کے حل کے لئے کبھی یہ کہا گیا کہ وہ بچے، یوسف کی پہلی بیوی کے بطن سے پیدا ہوئے تھے اس لئے حضرت عیسیٰؑ کے سوتیلے بہن بھائی تھے اور کبھی یہ کہ وہ حضرت عیسیٰؑ کے خالہ زاد بھائی بہن تھے (صفحہ ۳۹)۔

لیکن ان تمام توضیحات کے باوجود اس اعتراض کا جواب کسی سے بن نہیں پڑتا کہ

خدا کی پیدائش بہ سلسلہ تولید کیسے ہوسکتی ہے؟ سوچیئے کہ وہ خدا جس نے ابتدا کے زمانی تصور سے بلند اپنی نمود آپ کی، اپنی پیدائش کے لئے عورت کا رہین منت ہوگیا!

(صفحہ ۳۹)

تورات میں بیٹے کا لفظ

جہاں تک لفظ ابنؔ (بیٹے) کا تعلق ہے، تورات میں یہ لفظ عام آدمیوں کے لئے استعمال ہوا ہے۔ سب سے پہلی کتاب، پیدائش میں ہے:

> جب روئے زمین پر بہت آدمی ہونے لگے اور ان سے بیٹیاں پیدا ہونے لگیں تو خدا کے بیٹوں نے آدمیوں کی بیٹیوں کو دیکھا...... (پیدائش ۲–۶/۱)

قرب کے لئے بھی اس کا استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ حضرت یعقوبؑ کے متعلق حضرت موسیٰؑ کی زبان سے کہلایا گیا ہے:

> تب فرعون سے یوں کہیو کہ خداوند نے یوں فرمایا ہے کہ اسرائیل (یعقوب) میرا بیٹا بلکہ پہلوٹھا ہے۔ سو میں کہتا ہوں کہ میرے بیٹے (بنی اسرائیل) کو جانے دے تاکہ وہ میری عبادت کرے۔ (خروج ۲۳–۲۲/۴)

بنی اسرائیل کے متعلق دوسری جگہ ہے۔

> بنی اسرائیل شمار میں دریا کی ریت کے ذرّوں کی مانند ہوں گے جو ماپے نہیں جاتے اور گنے نہیں جاتے اور ایسا واقعہ ہوگا کہ اس جگہ جہاں انہیں کہا گیا ہے کہ تم میرے لوگ نہیں ہو اس کے عوض میں اُن سے کہا جائے گا کہ تم زندہ خدا کے زندہ فرزند ہو۔
>
> (ہوسیع نبی کی کتاب ۱/۱۰)

ان تصریحات سے واضح ہے کہ حضرت مسیحؑ کے زمانے میں آپ کے متعلق بیٹے کا لفظ استعمال بھی ہوا ہوگا تو اس کا کیا مفہوم ہوگا۔ لیکن بعد میں جب مذہب میں غلوّ و تشدد کا دور آیا تو اُسے کچھ سے کچھ معانی پہنا دیئے گئے اور پھر اناجیل میں بھی انہی معانی کے اعتبار سے تحریف کردی گئی۔ چنانچہ خود اناجیل کا اختلاف و تضاد اس باب میں شاہد ہے۔ انجیل متی میں حضرت مسیحؑ اور پطرس کے ایک مکالمہ کے ضمن میں لکھا ہے:-

شمعون پطرس نے جواب میں کہا تو زندہ خدا کا بیٹا مسیح ہے۔ یسوع نے جواب میں اس سے کہا مبارک ہے تو شمعون بریوناہ کیونکہ یہ بات گوشت اور خون نے نہیں بلکہ میرے باپ نے جو آسمان پر ہے تجھ پر ظاہر کی ہے۔ اور میں بھی تجھ سے کہتا ہوں کہ تو پطرس ہے اور میں اس پتھر پر اپنی کلیسا بناؤں گا اور عالمِ ارواح کے دروازے اُس پر غالب نہ آئینگے۔

(متی ۱۶ — ۱۸/۱۶)

لیکن برناباس میں یہی مکالمہ ان الفاظ میں آیا ہے۔

یسوع نے جواب میں کہا "اور خود تمہارا میرے بارے میں کیا قول ہے؟" پطرس نے جواب دیا کہ "تو مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔" تب اس وقت یسوع برہم ہوا اور اُس کو غصہ کے ساتھ یہ کہتے ہوئے جھڑکا "میرے پاس سے چلا جا اس لئے کہ تو شیطان ہے اور مجھ سے بُرا سلوک کرنے کا قصد کرتا ہے۔" (برناباس ص ۱۰۶)

اور دوسری جگہ حضرت مسیحؑ کا یہ قول بھی برناباس میں مذکور ہے۔

اور جبکہ یسوع نے یہ کہا اُس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنے مُنہ پر مارا۔ پھر زمین پر سَر دے پٹکا اور کہا "ہر وہ شخص ملعون ہو جو کہ میرے اقوال میں اس بات کو درج کرے کہ میں اللہ کا بیٹا ہوں۔" پس شاگرد ان باتوں کے سنتے وقت مُردوں کی طرح (بے جان ہو کر) گر پڑے۔ تب یسوع نے یہ کہتے ہوئے اٹھایا "ہمیں اس وقت خدا سے ڈرنا چاہیئے اگر ہم یہ ارادہ کریں کہ اُس دن میں خوف نہ کھائیں۔" (برناباس ص ۸۴)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیحؑ نے اس لفظ کا استعمال مجازاً بھی جائز قرار نہیں دیا تھا کہ بعد میں اس پر حقیقت کی عمارت نہ استوار کر لی جائے۔

بہرحال یہ ہیں اناجیل کے بیانات۔ اس باب میں دورِ حاضر کی تحقیق کس نتیجہ پر پہنچی ہے اور اب متوسط الخیال عیسائیوں کا اس ضمن میں کیا عقیدہ ہے، اس کی تصریح آگے چل کر ملے گی۔

قرآنِ کریم کا بیان

اب آیئے قرآنِ کی طرف۔ اس میں بالتصریح کہیں نہیں لکھا کہ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش بغیر باپ کے ہوئی تھی، نہ ہی یہ لکھا ہے کہ آپ یوسف کے بیٹے تھے۔ (قرآنِ کریم میں کئی ایک انبیاء کرامؑ ایسے ہیں جن کے والد کا کوئی ذکر نہیں آیا۔

حضرت موسیٰؑ کے والد کا نام بھی مذکور نہیں، والدہ ہی کا ذکر ہے)۔ جیسا کہ ہم ابھی ابھی دیکھ چکے ہیں، عیسائیوں کے نزدیک ولادتِ حضرت مسیحؑ کے مسئلہ کی اہمیت اس لئے تھی کہ یہ چیز بنیاد تھی الوہیتِ مسیح، تثلیث اور کفارہ کے عقیدہ کی۔ قرآنِ کریم کو ان باطل عقائد کی تغلیط و تردید مقصود تھی، اس لئے اس میں ولادتِ حضرت مسیحؑ کا ذکر اس انداز سے آیا ہے کہ اس سے ان عقائدِ باطلہ کی تردید ہوجائے۔ ان مباد بات کو پیشِ نظر رکھ کر قرآنِ کریم کی آیات کو دیکھئے۔ ولادتِ حضرت مسیحؑ کا تفصیلی تذکرہ سورۃ آلِ عمران اور سورۃ مریم میں آیا ہے۔ ان کی متعلقہ آیات پہلے بھی گزر چکی ہیں لیکن توضیحِ مطلب کے لئے انہیں پھر درج کر دیا جاتا ہے۔ ان ہر دو مقامات میں ولادتِ حضرت مسیحؑ کی خوشخبری سے پہلے حضرت یحییٰؑ کی پیدائش کا ذکر آیا ہے۔ سورہ آلِ عمران میں حضرت زکریاؑ کی دعا کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے:۔

فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ هُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًۢا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ سَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّ قَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَ امْرَاَتِيْ عَاقِرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ۝ (۳۸ـــ ۳/۳۹)

وہ ابھی قربان گاہ میں کھڑا محوِ دعا تھا کہ ملائکہ نے اسے آواز دی اور کہا کہ اللہ تمہیں (ایک بیٹے) یحییٰ کی بشارت دیتا ہے۔ وہ قانونِ خداوندی کو سچ کر دکھانے والا ہوگا، ایک بڑی جماعت کا لیڈر، صاحبِ نظم و ضبط اور بلند ترین صلاحیتوں کا مالک۔

(زکریاؑ اس خوشخبری سے خوش تو ہوگیا، لیکن جب اُسے اپنے طبیعی موانعات کا خیال آیا تو اُس نے کہا کہ) اے میرے پروردگار! میرے ہاں اب لڑکا پیدا ہونیکا کونسا وقت ہے، جبکہ میں اس قدر بوڑھا ہو چکا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے۔ (کیا مجھے وہ بیٹا اس طرح ملے گا جس طرح یہ بیٹی مریم مل گئی ہے یا وہ میرے اپنے ہاں پیدا ہوگا؟) اللہ نے کہا (نہیں، مریم کی طرح نہیں بلکہ) اسی طرح جیسے میرے قانونِ مشیت کے مطابق اولاد پیدا ہوا کرتی ہے۔ (بوڑھے مرد اور عقیم عورت میں اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت کا بیدار ہو جانا ناممکنات میں سے نہیں، چنانچہ ان کی صورت میں یہی ہوا تھا (۲۱/۹۰)۔

اس کے بعد حضرت مسیحؑ کے متعلق ہے۔

إِذْ قَالَتِ الْمَلَٰٓئِكَةُ يَٰمَرْيَمُ إِنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ ۝ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَمِنَ الصَّٰلِحِينَ ۝ قَالَتْ رَبِّ أَنَّىٰ يَكُونُ لِي وَلَدٌ وَلَمْ يَمْسَسْنِي بَشَرٌ ط قَالَ كَذَٰلِكِ اللَّهُ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ ط إِذَا قَضَىٰ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُن فَيَكُونُ ۝ (۴۴ — ۴۶/۳)

اسی سلسلہ میں، ملائکہ نے مریم سے کہا تھا کہ خدا تمہیں، اپنی طرف سے، ایک بات کی خوشخبری دیتا ہے، یعنی ایک بیٹے کی جس کا نام مسیحؑ (اور) عیسیٰ ابن مریم ہوگا، دنیا میں صاحبِ وجاہت اور آخرت میں خدا کے مقربین میں سے۔

تندرست و توانا، چھوٹی عمر میں خوب باتیں کرنے والا اور پختہ عمر تک پہنچنے والا (۵/۱۱۰)، نہایت عمدہ صلاحیتوں کا مالک، پاکباز انسان۔ (اس سے ان توہمات کا دور کرنا مقصود تھا جو ایک راہبہ کے دل میں اس خیال سے پیدا ہو سکتے ہیں کہ وہ، خانقاہیت کی شریعت کے علی الرغم، متاہل زندگی اختیار کر رہی ہے۔ اس سے کہیں وہ یا اس کا بچہ کسی آفت میں مبتلا نہ ہو جائے۔ بعض اوقات اس قسم کے توہمات کا ایسا نفسیاتی اثر ہوتا ہے کہ سچ مچ ایسا ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اُس کے دل سے ان خیالات کا دُور کرنا ضروری تھا)۔

اس پر مریمؑ نے (زکریاؑ کی طرح ۳/۳۹) تعجب سے کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے جبکہ میں ایک کنواری راہبہ ہوں ـــــ راہبہ کے ہاں اولاد کا کیا سوال؟ ـــــ اس کے جواب میں اس سے وہی کچھ کہا گیا جو زکریا سے کہا تھا (۳/۳۹) کہ یہ خدا کے اُس قانونِ مشیئت کے مطابق ہوگا جس کی رُو سے عام تخلیق ہوتی ہے ـــــ وہ قانون جو اس اصول پر مبنی ہے کہ خدا جب کسی بات کا فیصلہ کرتا ہے تو اس کے ساتھ ہی اس اسکیم کا آغاز ہو جاتا ہے (۲/۱۱۷)۔

اسی طرح سورۂ مریم میں پہلے حضرت یحییٰؑ کی بشارت کا ذکر ہے۔

يَٰزَكَرِيَّآ إِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلَٰمٍ اسْمُهُ يَحْيَىٰ لَمْ نَجْعَل لَّهُ

مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا ○ قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِىْ غُلٰمٌ وَّ كَانَتِ امْرَاَتِىْ عَاقِرًا وَّ قَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا ○ قَالَ كَذٰلِكَ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَىَّ هَيِّنٌ وَّ قَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَيْئًا ○ (۷ — ۱۹/۹)

(ہم نے اس کی دعا سُن لی اور کہا کہ) اے زکریا! ہم تمہیں ایک بیٹے کی پیدائش کی خوشخبری دیتے ہیں. جب وہ پیدا ہو تو اس کا نام یحییٰ رکھنا. یہ ایسا لڑکا ہوگا جس کی نظیر (تمہارے خاندان میں) نہیں ملے گی (۱۹/۶۵)۔

(زکریا اس خوشخبری سے خوش تو ہوگیا، لیکن جب اسے اپنے طبعی موانعات کا خیال آیا تو اپنے اطمینان کی خاطر کہا کہ) اے میرے نشوونما دینے والے! میرے ہاں اب لڑکا کس طرح پیدا ہوگا جبکہ میں بہت زیادہ عمر رسیدہ ہو چکا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے۔ (کیا وہ بیٹا خود میرے ہاں پیدا ہوگا یا کسی اور کا لڑکا مجھے مل جائے گا جسے میں اپنا بیٹا بنا لوں گا، جس طرح مریم بچی، میری کفالت میں دے دی گئی ہے ۳/۳۹)۔

خدا نے کہا کہ (نہیں، خود تیرے ہاں بیٹا پیدا ہوگا اور) اسی طرح ہوگا جس طرح لوگوں کے ہاں بچے پیدا ہوتے ہیں. تیرے پروردگار کا ارشاد ہے کہ بڑھاپے میں اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت کا بیدار ہو جانا ہمارے قانون کی رُو سے مستبعد نہیں. ہمارے جس قانون نے اس سے پہلے خود تجھے پیدا کیا، حالانکہ تیری ہستی کا نام و نشان بھی نہیں تھا (وہ بڑھاپے میں کسی کو صاحبِ اولاد کیوں نہیں کر سکتا)۔

اس کے بعد حضرت عیسیٰؑ کے متعلق ہے۔

وَاذْكُرْ فِى الْكِتٰبِ مَرْيَمَ ۘ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا ۙ فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا ۛ فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ[1] لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ○ قَالَتْ اِنِّىْٓ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ

---

[1] فَتَمَثَّلَ کا ایک مفہوم ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں اسے پیشِ نظر رکھئے۔

مِنۡكَ اِنۡ كُنۡتَ تَقِيًّا ۝ قَالَ اِنَّمَاۤ اَنَا رَسُوۡلُ رَبِّكِ ‌ۖ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا ۝ قَالَتۡ اَنّٰى يَكُوۡنُ لِىۡ غُلٰمٌ وَّلَمۡ يَمۡسَسۡنِىۡ بَشَرٌ وَّلَمۡ اَكُ بَغِيًّا ۝ قَالَ كَذٰلِكِ‌ ۚ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَىَّ هَيِّنٌ‌ ۚ وَلِنَجۡعَلَهٗۤ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحۡمَةً مِّنَّا‌ ۚ وَكَانَ اَمۡرًا مَّقۡضِيًّا ۝

(۱۶ — ۱۹/۲۱)

اے رسول! اب تو اس کتاب (قرآن) میں، لوگوں سے، مریم کا قصہ بیان کر اور سلسلۂ کلام کا آغاز اُس وقت سے کر جب وہ خانقاہیت کی زندگی کو چھوڑ کر (اپنے گاؤں، ناصرہ میں) چلی گئی تھی جو (وہاں سے) مشرق کی سمت واقع تھا۔

(خانقاہیت کی زندگی اور وہاں کے ناخوش آیند واقعات نے اس کے دل پر ایسا اثر چھوڑا تھا کہ وہ) وہاں بھی لوگوں سے الگ تھلگ رہتی تھی۔ ہم نے (ان اثرات کو مٹانے کے لئے اسے زندگی کے خوشگوار پہلوؤں کے متعلق) تقویت بخش اشارہ کیا (جو اس کے خواب میں) ایک اچھے بھلے انسان کی شکل میں سامنے آیا۔

(مریم اسے دیکھ کر گھبرائی اور اس سے کہا)..... کہ اگر تو خدا کے قانون کا احترام کرتا ہے تو میں تجھ سے، خدائے رحمان کی پناہ میں آجانا چاہتی ہوں۔

اس نے کہا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ میں تو تیرے نشوونما دینے والے کی طرف سے ایک پیغام لے کر آیا ہوں (۳/۴۴) اور وہ پیغام یہ ہے کہ وہ تجھے نہایت عمدہ نشوونما یافتہ بچہ عطا کرے گا۔

اس پر مریم نے کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ جب تک میں ہیکل میں رہی، پاکباز راہبہ کی زندگی بسر کی۔ وہاں کسی انسان نے مجھے چھوا تک نہیں..... وہاں سے نکلی ہوں تو میں نے شادی نہیں کی کیونکہ یہ چیز ضابطۂ خانقاہیت کے خلاف ہے (۳/۴۶؛ ۱۹/۲۸)۔

اس نے کہا کہ میں نے جو کچھ کہا ہے وہ قانونِ تخلیق کے مطابق ہی ہوگا (۳/۴۶)۔ یہ اس کے نزدیک کچھ بھی مشکل نہیں (کہ جو موانعات تیرے ذہن میں ہیں اور تمہیں اس طرح پریشان کر رہے ہیں، انہیں دُور کر دے ۱۹/۹)۔ خدا نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ بچہ عام

بچوں جیسا نہیں ہوگا۔ وہ ہماری طرف سے لوگوں کے لئے موجب رحمت اور حق و باطل
کے پرکھنے کی نشانی ہوگا۔ (جو شخص اس کی نبوت پر ایمان لائے گا، وہ حق پر سمجھا جائے گا
جو اس سے انکار کرے گا وہ باطل پر ہوگا) اور یہ بات طے شدہ ہے کہ وہ بچہ ہمارا پیغمبر
بنے گا (۳/۴۷)۔

پہلے سورۂ آلِ عمران کی متذکرہ صدر آیات پر نگاہ ڈالئے۔ جب حضرت زکریاؑ کو بیٹے کی بشارت ملی ہے
تو آپ نے تعجب سے کہا کہ رَبِّ اَنّٰى یَكُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ وَّ قَدْ بَلَغَنِیَ الْكِبَرُ وَ امْرَاَتِیْ
عَاقِرٌ (۳/۴۰) (اے میرے پروردگار! میرے ہاں بیٹا کیسے ہوسکتا ہے کہ میں سن رسیدہ ہوں اور
میری بیوی بانجھ ہے؟)۔ اس آیت میں دو باتوں کا ذکر ہے جنہیں حضرت زکریاؑ نے ولادتِ فرزند کے لئے
بطور موانع پیش کیا ہے۔ ایک اپنی سن رسیدگی اور دوسرے اپنی بیوی کا بانجھ پن۔ اللہ تعالیٰ نے ان
موانع کو دُور کردیا اور حضرت یحییٰؑ کی پیدائش عام انسانی بچوں کی طرح ظہور پذیر ہوئی۔ دیکھئے حضرت
زکریاؑ نے استعجاباً عرض کیا تھا کہ اَنّٰى یَكُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ (میرے یہاں کس طرح لڑکا پیدا ہوسکتا
ہے!) اس کے جواب میں فرمایا كَذٰلِكَ اللّٰهُ یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ (۳/۳۹) (اسی طرح ہوگا جس طرح ہوتا
ہے۔ اللہ اپنے قانونِ مشیّت کے ماتحت جو چاہتا ہے کرتا ہے) یعنی اسی طرح ہوگا (كَذٰلِكَ)
جس طرح مشیّت کے کام ہوتے ہیں۔ جو کچھ مشیّت کے تابع ہونا ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لئے
اسباب پیدا کردیتا ہے اور اس طرح رکاوٹیں دور ہوجاتی ہیں۔ حضرت زکریاؑ کے سلسلہ میں یہ رکاوٹیں کس
طرح دُور ہوئیں، اس کے متعلق سورۂ انبیاء میں فرمایا کہ وَ اَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ (۲۱/۹۰) ہم نے
زکریاؑ کے لئے اس کی بیوی میں (حمل کی) صلاحیت پیدا کردی۔ "لَهٗ" سے مترشح ہے کہ حضرت زکریاؑ
میں باوجود کبر سنی، اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت موجود تھی۔ آپ کی بیوی عقیم تھیں سو وہ نقص دور کردیا گیا۔
كَذٰلِكَ اللّٰهُ یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ اس طرح اللہ تعالیٰ اپنی مشیّت کو بروئے کار لانے کے لئے
سامان پیدا کردیتا ہے۔

جب حضرت مریمؑ کو بیٹے کی بشارت ملتی ہے تو آپ ہیکل میں راہبانہ زندگی بسر کررہی تھیں
اور ضابطۂ خانقاہی کی رُو سے جن راہبوں میں سے کسی ایک کے ساتھ اس کی شادی ہوسکتی تھی، اُن
کی حرکات و افعال سے وہ دل برداشتہ ہوچکی تھی۔ ان حالات میں اس کے لئے عائلی زندگی کا

تصور بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لئے حضرت مریم نے عرض کیا کہ رَبِّ اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ وَلَدٌ وَّ لَمْ یَمْسَسْنِیْ بَشَرٌ (۳/۴۷) "اے میرے پروردگار! میرے ہاں کیسے بیٹا پیدا ہوگا؟ اس کے جواب میں فرمایا کہ اسی طرح جس طرح مشیت کے ماتحت تخلیق ہوا کرتی ہے۔ اِذَا قَضٰۤی اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ ۝ (۳/۴۶) "جب وہ کسی معاملہ کا فیصلہ کر دیتا ہے تو اس کے لئے پھر اتنا ہی کافی ہوتا ہے کہ وہ کہہ دے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتا ہے۔" واضح رہے کہ "کُنْ فَیَکُوْنُ" کے معنی یہ نہیں کہ ایسا کہنے سے شئے مطلوبہ خود بخود زمین سے پھوٹ کر باہر نکل آتی ہے۔ بلکہ مفہوم یہ ہے کہ اس سے اس شے کی تخلیقی ابتدا ہو جاتی ہے اور وہ پھر ضروری مراحل طے کرنے کے بعد اپنی تکمیل تک جا پہنچتی ہے۔

اسی طرح سورۂ مریم کی مندرجہ صدر آیت کو دیکھئے۔ بشارتِ حضرت عیسیٰؑ پر حضرت زکریاؑ نے عرض کیا۔

رَبِّ اَنّٰی یَكُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ وَّ كَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا وَّ قَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِیًّا ۝ (۱۹/۸)

اے میرے پروردگار! میرے کیسے لڑکا ہوگا کہ میری بیوی بانجھ ہے اور میں بڑھاپے میں بہت آگے بڑھ چکا ہوں۔

جواب میں ارشاد ہوا قَالَ كَذٰلِكَ ۚ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَیَّ هَیِّنٌ وَّ قَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَ لَمْ تَكُ شَیْـًٔا ۝ (۱۹/۹) "کہا، ایسا ہی ہوگا۔ تیرا رب کہتا ہے کہ یہ مجھ پر آسان ہے اور اس سے قبل میں نے تجھے پیدا کیا جب تو کوئی شے نہ تھا۔" یعنی جو موانع تم نے بیان کئے ہیں وہ بجا اور درست! لیکن یہ چیز اللہ کے لئے کچھ مشکل نہیں کہ وہ ان موانع کو دور کر دے۔ تم ان موانع پر ہی متعجب ہوتے ہو لیکن کیا یہ نہیں سوچتے کہ خود تمہاری (یعنی ایک انسان کی) تخلیق کس طرح عمل میں آئی ہے۔

اس کے بعد حضرت عیسیٰؑ کی بشارت کا ذکر ہے جسے سنکر حضرت مریمؑ نے عرض کیا۔

قَالَتْ اَنّٰی یَكُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ وَّ لَمْ یَمْسَسْنِیْ بَشَرٌ وَّ لَمْ اَكُ بَغِیًّا ۝ (۱۹/۲۰)

مریم بولی "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میرے لڑکا ہو، حالانکہ کسی مرد نے مجھے چھوا نہیں
اور نہ میں سرکش ہوں؟"

اس کے جواب میں فرمایا۔

قَالَ كَذٰلِكِ ۚ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ ۚ وَلِنَجْعَلَهُۥٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا ۚ وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا ○ (۱۹/۲۱)

پیغامبر نے کہا "ہوگا ایسا ہی۔ تیرے پروردگار نے فرمایا کہ یہ میرے لئے کچھ مشکل نہیں۔ وہ کہتا ہے، یہ اس لئے ہوگا کہ اسے لوگوں کے لئے حق و باطل کے پرکھنے کی نشانی بنا دوں اور میری رحمت کا اس کے توسط سے ظہور ہو اور یہ ایسی بات ہے جس کا ہونا طے پا چکا۔

یعنی یہاں بھی وہی الفاظ آئے ہیں جو حضرت زکریاؑ کے استعجاب کے جواب میں ارشاد ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ فرمایا کہ وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا یعنی یہ ایک طے شدہ امر ہے اور طے شدہ امر کے ظہور پذیر ہونے کے لئے سنت اللہ کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ كُنْ فَيَكُوْن یعنی اس شے کا ابتدا سے انتہا تک مختلف مراحل طے کرنا۔ چنانچہ اگلی آیت میں ان مراحل کی تشریح فرما دی۔

فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا ○ (۱۹/۲۲)

پھر اس ہونے والے فرزند کا حمل ٹھہر گیا۔ وہ لوگوں سے الگ ہو کر دُور چلی گئی۔

حضرت مریمؑ کو اپنے وقت پر حمل قرار پا گیا جس طرح حمل قرار پایا کرتا ہے۔ اس کی تفصیل بیان کرنے کی قرآن کریم کو ضرورت نہ تھی۔ ہر شخص جانتا ہے کہ حمل کس طرح قرار پایا کرتا ہے۔ كَذٰلِكِ اسی طرح جس طرح ہر شخص جانتا ہے جس طرح خود حضرت مریمؑ کے دل میں خیال گذرا تھا کہ اس کے لئے بشر کے ساتھ تمسک کی ضرورت ہے۔

ان مقامات کے علاوہ، اجمالی طور پر، سورۂ انبیاء میں بھی حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کا ذکر آیا ہے اور وہاں بھی اس ذکر سے پہلے پیدائش حضرت یحییٰؑ کا ذکر موجود ہے جہاں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت زکریاؑ کی بیوی میں (بانجھ پن دُور کر کے) اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت پیدا کر دی تھی۔

فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۫ وَوَهَبْنَا لَهٗ يَحْيٰى وَاَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا ۭ

وَ كَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ ○ (۲۱/۹۰)

ہم نے اس کی پکار سن لی اور اس کی بیوی میں اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت پیدا کر کے اسے یحییٰ جیسا بیٹا عطا کر دیا۔

یہ تمام انبیاء نوعِ انسان کی بھلائی کے کاموں میں نہایت تیزی سے آگے بڑھتے تھے اور زندگی کے ہر گوشے میں ـــ خواہ وہ امید افزا ہو یا یاس انگیز ـــ ہم سے پوچھتے تھے کہ انہیں کیا کرنا چاہیئے۔ (وہ ہر معاملہ میں، ہمارے حکم کا انتظار کرتے تھے) اور اسی کے سامنے جھکتے تھے، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ قوانینِ خداوندی کے خلاف قدم اٹھانے میں کس قدر خطرات پنہاں ہیں۔ وہ ان کی خلاف ورزی سے ہمیشہ ترساں و لرزاں رہتے تھے۔

اس کے بعد حضرت مریمؑ کا ذکر ہے۔

وَالَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا وَ جَعَلْنٰهَا وَ ابْنَهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ○ (۲۱/۹۱)

اور ان کے ساتھ ہی اس عفت مآب خاتون کا معاملہ بھی یاد کرو، جسے ہم نے (یہودیوں کی خودساختہ شریعت کے علی الرغم) عیسیٰؑ جیسا بیٹا عطا کیا اور جس طرح ہر انسانی بچے میں خدائی توانائی کا شمہ ڈال کر اسے صاحبِ اختیار و ارادہ انسان بنا دیا جاتا ہے، اسے بھی ایسا ہی بنایا (۲/۴۴؛ ۱۹/۱۶؛ ۳۲/۹)۔ وہ دونوں، اقوامِ عالم کے لئے اس بات کی نشانی تھے کہ احکامِ خداوندی اور انسانوں کی خودساختہ شریعت کے فیصلوں میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ (یہودیوں کی خودساختہ شریعت نے انہیں ـــ معاذ اللہ ـــ مردود و ملعون قرار دیا اور خدا کی شریعت نے انہیں مقرب و مقبول ٹھہرایا)۔

حضرت زکریاؑ کے علاوہ حضرت ابراہیمؑ کے ہاں بھی کبرسنی میں اولاد ہوئی تھی اور اس کے لئے بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے بشارت ملی تھی (تفصیلی تذکرہ جوئے نور میں گذر چکا ہے)، جب آپ کی بیوی نے اس پر تعجب کا اظہار کیا کہ (اس سن رسیدگی میں ان کے ہاں اولاد)، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ (۱۱/۷۳) "کیا تم اللہ کے امر پر تعجب کرتی ہو؟" دیکھئے یہاں بھی اسی طرح اَمْرِ اللّٰهِ

کہا گیا ہے جس طرح حضرت عیسیٰ کے ضمن میں فرمایا کہ وہ اَمْرًا مَّقْضِيًّا (۱۹/۲۱) (یعنی ایک طے شدہ امر تھا)۔

طعن و تشنیع کیوں؟

جیسا کہ شروع میں لکھا جا چکا ہے، حضرت مریم ایک راہبہ کی زندگی بسر کر رہی تھیں جسے دنیاوی علائق سے کچھ واسطہ نہیں ہونا چاہیئے، بلکہ ساری عمر تجرّد میں گذار دینی چاہیئے۔ آپ کو خدا کی طرف سے اشارہ ملا کہ انہیں متاہل زندگی بسر کرنی ہوگی کیونکہ انہیں ایک عظیم الشان رسول کی امین بننا ہے۔ اس طے شدہ امر (اَمْرًا مَّقْضِيًّا) کے مطابق حضرت مریمؑ نے خانقاہ کی زندگی چھوڑ کر عائلی زندگی اختیار کی۔ لیکن یہودیوں کے نزدیک یہ کوئی چھوٹا جرم نہ تھا۔ ایک راہبہ کی زندگی چھوڑ کر متاہل زندگی اختیار کر لینا، مشربِ خانقہیت میں ارتداد سے کم نہ تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس جذبۂ انتقام اور شکستِ پندار کو بھی ملحوظ رکھئے جو حضرت مریمؑ کی اس روش سے ان کے دل میں پیدا ہوا تھا کہ انہوں نے ہیکل کے پجاریوں میں سے کسی کے ساتھ شادی نہیں کی، اور ہیکل سے باہر، ایک دوسرے شخص سے شادی کر لی۔ ان وجوہات کی بنا پر انہوں نے حضرت مریم کو موردِ طعن و تشنیع بنایا

لہ خانقاہیت MONASTICISM کی زندگی مذہبِ عیسویت کی ایجاد نہیں۔ اس کے آثار اس سے پہلے یہودیوں کے ہاں بھی موجود تھے اور مصریوں میں بھی۔ خود حضرت مریمؑ کی ابتدائی زندگی کے حالات اس پر شاہد ہیں کہ یروشلم کے ہیکل (خانقاہ) میں راہب اور راہبات ہوتی تھیں۔ یہ تارک الدنیا لوگ، عبادات میں مصروف رہتے اور انبیائے یہود کی پیشگوئیوں کے ماتحت ایک آنے والے مسیح کا انتظار کرتے۔ تفاصیل کے لئے دیکھئے۔

SPIRIT AND ORIGIN OF CHRISTIAN MONASTICIASM BY J.O. HANNAY

BENEDICTIVE MONASTICISM BY E.L. BUTLER

اور انسائیکلوپیڈیا اوف ریلیجنز اینڈ ایتھکس میں صراحت سے لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے قبل، یہودیوں میں (بالخصوص) ایسینی (فرقہ میں) رہبانیت کی زندگی آچکی تھی اور انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں حضرت مریمؑ کے متعلق لکھا ہے کہ وہ بارہ برس کی عمر تک بطور راہبہ ہیکل میں رہی تھیں۔ اس کے بعد ہیکل کے پجاریوں کو اس کی تلاش ہوئی کہ اسے کسی معمر یہودی کی کفالت میں دیدیا جائے جو رنڈوا ہو تاکہ وہ (حضرت مریم) تجرّد کی زندگی بھی بسر کرے اور ہیکل کا تقدس بھی داغدار نہ ہو۔

اور اپنے جوشِ انتقام میں اس پیکرِ عفت و ناموس کے خلاف طرح طرح کے الزام تراشے۔ وَ قَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا ۝ (۴/۱۵۶) یعنی ان کے نزدیک ایک راہبہ کا اس طرح کا نکاح، نکاح ہی نہیں قرار پا سکتا تھا۔ اس لئے اس کی اولاد کس طرح مستحسن نگاہوں سے دیکھی جا سکتی تھی؛ لہٰذا ان کی نظروں میں یہ فعل نہایت شنیع اور یہ امر (معاذ اللہ) موجبِ ہزار نفرین تھا۔ یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ حضرت مریمؑ (اور ان کے شوہر) بچے کو لے کر مصر (یا رینان کی تصریح کے مطابق، قانا کی بستی) کی طرف چلی گئی تھیں۔ اناجیل کے بیان کے مطابق، وہاں سے واپسی کے بعد جب حضرت عیسیٰؑ قریب بارہ سال کے ہوئے تو انہوں نے ہیکل کے احبار و رہبان کی دسیسہ کاریوں کے خلاف آواز بلند کرنی شروع کر دی (اگرچہ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ حضرت عیسیٰؑ کو نبوت ملنے کے بعد کا ہے)۔ آپ کی یہ تنقید جس قدر سخت ہوتی تھی اس کا اندازہ اناجیل کے بیانات سے لگایا جا سکتا ہے۔ مثلاً متی کی انجیل میں ہے۔

> اس وقت یسوعؑ نے بھیڑ سے اور اپنے شاگردوں سے یہ باتیں کہیں کہ فقیہہ اور فریسی موسیٰؑ کی گدی پر بیٹھے ہیں ۝ پس جو کچھ وہ تمہیں بتائیں وہ سب کرو اور مانو لیکن ان کے سے کام نہ کرو کیونکہ وہ کہتے ہیں اور کرتے نہیں ۝ وہ ایسے بھاری بوجھ جن کا اٹھانا مشکل ہے باندھ کر لوگوں کے کندھوں پر رکھتے ہیں مگر آپ انہیں اپنی انگلی سے بھی ہلانا نہیں چاہتے ۝ وہ اپنے سب کام لوگوں کے دکھانے کو کرتے ہیں کیونکہ اپنے تعویذ بڑے بناتے اور اپنی پوشاک کے کنارے چوڑے رکھتے ہیں ۝ اور ضیافتوں میں صدر نشینی اور عبادت خانوں میں اعلیٰ درجے کی کرسیاں ۝ اور بازاروں میں سلام اور آدمیوں سے ربی کہلانا پسند کرتے ہیں ۝ مگر تم ربی نہ کہلاؤ کیونکہ تمہارا استاد ایک ہی ہے اور تم سب بھائی ہو ۝ اور زمین پر کسی کو اپنا باپ نہ کہو کیونکہ تمہارا باپ ایک ہی ہے جو آسمانی ہے ۝ اور نہ تم ہادی کہلاؤ کیونکہ تمہارا ہادی ایک ہی ہے یعنی مسیح ۝ لیکن جو تم میں بڑا ہے وہ تمہارا خادم بنے ۝ اور جو کوئی اپنے آپ کو بڑا بنائے گا وہ چھوٹا کیا جائے گا اور جو اپنے آپ کو چھوٹا بنائے گا وہ بڑا کیا جائے گا
>
> اے ریاکار فقیہو اور فریسیو تم پر افسوس! کہ آسمان کی بادشاہت لوگوں پر بند کرتے ہو کیونکہ نہ تو آپ داخل ہوتے ہو اور نہ داخل ہونے والوں کو داخل ہونے دیتے ہو ۝

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو تم پر افسوس! کہ ایک مرید کرنے کے لئے تری اور خشکی کا دورہ کرتے ہو اور جب وہ مرید ہو چکتا ہے تو اسے اپنے سے دونا جہنم کا فرزند بنا دیتے ہو ٥

اے اندھے راہ بتانے والو تم پر افسوس! جو کہتے ہو کہ اگر کوئی مقدس کی قسم کھائے تو کچھ بات نہیں لیکن اگر مقدس کے سونے کی قسم کھائے تو اس کا پابند ہوگا ٥ اے احمقو اور اندھو کونسا بڑا ہے؟ سونا یا مقدس جس نے سونے کو مقدس کیا؟ اور پھر کہتے ہو کہ اگر کوئی قربان گاہ کی قسم کھائے تو کچھ بات نہیں لیکن جو نذر اس پر چڑھی ہو اگر اس کی قسم کھائے تو اس کا پابند ہوگا ٥ اے اندھو! کونسی بڑی ہے؟ نذر یا قربان گاہ جو نذر کو مقدس کرتی ہے ٥ پس جو قربان گاہ کی قسم کھاتا ہے وہ اس کی اور سب چیزوں کی جو اس پر ہیں قسم کھاتا ہے ٥ اور جو مقدس کی قسم کھاتا ہے وہ اس کی اور اس کے رہنے والے کی قسم کھاتا ہے ٥ اور جو آسمان کی قسم کھاتا ہے وہ خدا کے تخت کی اور اس پر بیٹھنے والے کی قسم کھاتا ہے ٥

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو تم پر افسوس! کہ پودینے اور سونف اور زیرے کا تو دہ یکی دیتے ہو اور تم نے شریعت کی زیادہ بھاری باتوں یعنی انصاف اور رحم اور ایمان کو چھوڑ دیا ہے۔ لازم تھا کہ یہ بھی کرتے اور وہ بھی نہ چھوڑتے ٥ اے اندھے راہ بتانے والو جو مچھر کو تو چھانتے ہو اور اونٹ کو نگل جاتے ہو۔

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو تم پر افسوس! کہ پیالے اور رکابی کو اوپر سے صاف کرتے ہو مگر وہ اندر لوٹ اور ناپرہیزگاری سے بھرے ہیں ٥ اے اندھے فریسی! پہلے پیالے اور رکابی کو اندر سے صاف کر تاکہ اوپر سے بھی صاف ہو جائیں ٥

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو تم پر افسوس! کہ تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کی مانند ہو جو اوپر سے تو خوبصورت دکھائی دیتی ہیں مگر اندر مُردوں کی ہڈیوں اور ہر طرح کی نجاست سے بھری ہوئی ہیں ٥ اسی طرح تم بھی ظاہر میں تو لوگوں کو راستباز دکھائی دیتے ہو مگر باطن میں ریاکاری اور بے دینی سے بھرے ہوتے ہو ٥

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو تم پر افسوس! کہ نبیوں کی قبریں بناتے اور راستبازوں کے مقبرے آراستہ کرتے ہو ٥ اور کہتے ہو کہ اگر ہم اپنے باپ دادوں کے زمانے میں ہوتے تو نبیوں کے خون میں ان کے شریک نہ ہوتے ٥ اس طرح تم اپنی نسبت گواہی دیتے ہو

کہ تم نبیوں کے قاتلوں کے فرزند ہو۔ غرض اپنے باپ دادوں کا پیمانہ بھر دو۔ اے سانپو! اے افعی کے بچو! تم جہنم کی سزا سے کیونکر بچو گے؟ اس لئے دیکھو میں نبیوں اور داناؤں اور فقیہوں کو تمہارے پاس بھیجتا ہوں۔ ان میں سے تم بعض کو قتل کرو گے اور صلیب پر چڑھاؤ گے اور بعض کو اپنے عبادت خانوں میں کوڑے مارو گے اور شہر بشہر ستاتے پھرو گے۔ تاکہ سب راستبازوں کا خون جو زمین پر بہایا گیا تم پر آئے۔ راستباز ہابیل کے خون سے لے کر برکیاہ کے بیٹے زکریاہ کے خون تک جسے تم نے مقدس اور قربان گاہ کے درمیان قتل کیا۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ یہ سب کچھ اس زمانے کے لوگوں پر آئے گا۔

(متی ۱ — ۳۶/۲۳)

آپ اندازہ لگائیے کہ اس سے ان مقدسین کے طائفہ کے دل پر کیا گزرتی ہوگی؟ انہیں پہلے (حضرت) مریمؑ کے خلاف شکایت تھی کہ اس نے رسومِ خانقاہی کو اس طرح سے توڑا۔ اس کے بعد یہ زخمِ کاری کہ اس کے ہاں جو بیٹا پیدا ہوا وہ اس انداز کا! یہ ہے وہ پس منظر جس میں قرآن نے کہا ہے کہ

يٰۤاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّ مَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا ۝ (۱۹/۲۸)

وہ اس سے کہتے کہ اے اختِ ہارون! نہ تو تیرا باپ بُرا آدمی تھا، نہ ہی تیری ماں نے ہیکل کے قوانین وضوابط سے سرکشی اختیار کی تھی۔ (تم تو ایک شریف، مذہب پرست، پابندِ شریعت گھرانے کی لڑکی تھیں۔ تم نے یہ کیا کیا اور اپنے بیٹے کو کس قسم کی تعلیم دلائی؟

یعنی انہوں نے کہا" تمہارا گھرانا بڑا مذہب پرست تھا۔ تیرے ماں باپ، خانقاہ کے آئین وضوابط کی بڑی پابندی کرتے تھے۔ ان کے دل میں ان مقدس قوانین ودساتیر کی بڑی عظمت تھی۔ تیری ماں نے تجھے ہیکل کی نذر کر دیا تھا۔ اس سے بڑھ کر عقیدت مندی اور کیا ہو سکتی ہے؟ لیکن تُو نے ان تمام آئین وضوابط

کو توڑ کر ہیکل کی عظمت کو برباد کر دیا۔ اپنے ماں باپ کی عقیدت مندی کو خاک میں ملا دیا۔ خانقاہ میں راہبہ بنی تھی تو ضبطِ نفس کے انداز بھی سیکھتی۔ اگر اس طرح کی (متاہل) زندگی بسر کرنی تھی تو خانقاہ میں معتکف کیوں ہوئی تھی؟ یہ تو رہی تمہاری اپنی حالت۔ اس کے بعد تُو نے جو بچہ جنا اس کی حالت یہ ہے کہ وہ قوم کے ایسے واجب الاحترام بزرگوں کے ساتھ ایسی گستاخی سے پیش آتا ہے اور ہیکل کے آئین و رسوم کے خلاف اس جرأت سے لب کشائی کرتا ہے؟ بالآخر تمہارا اور تمہارے اس بچے کا مطلب کیا ہے؟ کیا تمہارے دل میں ہیکل اور اپنے آباء و اجداد کے مذہب کا کچھ احترام باقی نہیں رہا؟ وغیرہ وغیرہ۔
اب ذرا تصور میں لائیے اس الم انگیز واقعہ کو قوم کے بڑے بوڑھے خانقاہ کے عمائد اور اراکین اس طرح بپھرے ہوئے درندوں کی طرح چاروں طرف اُمنڈ پڑے ہیں اور ان کے درمیان حضرت مریمؑ ساکت و صامت کھڑی ہیں۔ ہر طرف سے طعن و تشنیع کی بوچھاڑ ہو رہی ہے لیکن وجۂ تشنیع وہ واقعہ ہے جو اللہ کی مشیّت کے ماتحت، اس کے حکم کے مطابق، ایک طے شدہ فیصلہ (أَمْرًا مَّقْضِيًّا) کو پورا کرنے کے لئے عمل میں آیا تھا، یعنی مذہبی پیشوائیت کی خود ساختہ شریعت کے خلاف عملی احتجاج۔ اس کے ساتھ ہی وہ ان کے بیٹے کے خلاف بھی اس قسم کے غم و غصّہ کا اظہار کر رہے تھے۔ چنانچہ جب انہوں نے حضرت مریمؑ سے بار بار اصرار کیا کہ بتاؤ کہ یہ سارا ماجرا کیا ہے تو بجائے اس کے کہ وہ خود کچھ جواب دیتیں، انہوں نے بیٹے کی طرف اشارہ کر دیا کہ اس سے پوچھو۔ یہ تمہارے اعتراضات کا جواب دے گا۔

فَأَشَارَتْ إِلَيْهِ (۱۹/۲۹)

اس پر مریم نے بیٹے کی طرف اشارہ کر دیا۔

اس جواب پر اُن کے غصّہ کی آگ اور بھی زیادہ بھڑک اٹھی۔ انہوں نے جوشِ غضب سے کہا کہ تم کیا کہتی ہو؟ سوال ہم نے تم سے کیا ہے۔ بجائے اس کے کہ اس کا کوئی جواب دو۔ ہمیں کہہ رہی ہو کہ ہم اس بچے سے پوچھیں؟ تم نے اس کا اندازہ ہی نہیں لگایا کہ اس سے تم نے ہماری کس قدر توہین کی ہے۔

قَالُوا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَن كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا ۝ (۱۹/۲۹)

انہوں نے کہا" بھلا اس سے ہم کیا بات کریں جو ابھی کل تک جھولے میں تھا۔

آپ دیکھئے کہ ان کے اس جواب میں کتنا گہرا طنز ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جو بچہ ابھی کل ہمارے ہاتھوں میں پیدا ہوا، اس سے ہم کیا بات کریں؟ حضرت عیسیٰؑ نے ان کی اس بات کو قابلِ اعتنا نہ سمجھا اور خود

ہی جواب دیا کہ

قَالَ اِنِّیۡ عَبۡدُ اللّٰہِ ۟ؕ اٰتٰنِیَ الۡکِتٰبَ وَ جَعَلَنِیۡ نَبِیًّا ۙ۝ وَّ جَعَلَنِیۡ مُبٰرَکًا اَیۡنَ مَا کُنۡتُ ۪ وَ اَوۡصٰنِیۡ بِالصَّلٰوۃِ وَ الزَّکٰوۃِ مَا دُمۡتُ حَیًّا ۝ۖ وَّ بَرًّۢا بِوَالِدَتِیۡ ۫ وَ لَمۡ یَجۡعَلۡنِیۡ جَبَّارًا شَقِیًّا ۝ وَ السَّلٰمُ عَلَیَّ یَوۡمَ وُلِدۡتُّ وَ یَوۡمَ اَمُوۡتُ وَ یَوۡمَ اُبۡعَثُ حَیًّا ۝ (۱۹/۳۳ — ۳۰)

اس پر عیسیٰؑ ان سے کہتے کہ (یہ بھی کوئی انصاف کی بات ہے کہ چونکہ تم عمر میں بڑے ہو اس لئے تمہاری ہر بات کو سند تسلیم کر لیا جائے اور میں عمر میں چھوٹا ہوں اس لئے تم مجھ سے بات کرنا بھی پسند نہ کرو۔ جو کچھ میں کہتا ہوں اسے بگوشِ ہوش سنو) میں خدا کا بندہ ہوں۔ اس نے مجھے کتاب دی ہے اور منصبِ نبوت پر سرفراز فرمایا ہے۔

اس نے مجھے زندگی کے ہر گوشے میں بابرکت بنایا ہے۔ اس نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں (تمہاری خود ساختہ شریعت کی جگہ) صلوٰۃ و زکوٰۃ کا صحیح نظام قائم کروں اور عمر بھر میرا یہی شعار ہے۔

(تم میری والدہ کے خلاف اس طرح زبان درازی کرتے ہو؟ اس نے جو کچھ کیا ہے خدا کی سچی شریعت کے عین مطابق کیا ہے۔ اس لئے) میں اس سے ہمیشہ حسنِ سلوک سے پیش آؤں گا۔ میں (معاذ اللہ) ایسا شقی و بدبخت نہیں (کہ تمہارے پیچھے لگ کر ایک بے گناہ خاتون سے سختی سے پیش آؤں)۔

(تم میری پیدائش کو بھی قابلِ اعتراض قرار دیتے ہو! یہ تمہاری خود ساختہ شریعت کا فیصلہ ہے۔ میں جس خدا کا پیغام لے کر آیا ہوں، اس کے نزدیک) میری پیدائش بھی سلامتی کی مظہر ہے۔ میری ساری زندگی آخری دم تک سلامتی کی حامل ہوگی اور حیاتِ اُخروی میں بھی امن و سلامتی میں ہوں گا۔

اس جواب پر غور کیجئے۔ اس میں حضرت عیسیٰؑ نے اپنی پیدائش کے متعلق ایک حرف تک نہیں کہا! اس لئے کہ سوال (کسی غیر معمولی طور پر سا) پیدائش کا نہیں تھا بلکہ اُن کا اعتراض یہ تھا کہ حضرت مریمؑ نے رسم درہ

خانقہی چھوڑ کر عائلی زندگی کیوں اختیار کی؟ اس کے جواب میں حضرت عیسیٰؑ نے اپنی نبوت اور کتاب کی طرف اشارہ کر کے یہ بتا دیا کہ اس حقیقت کو اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ ان رسومِ خانقہیت کو دینِ خداوندی سے کیا تعلق ہے؟ یہ سب تمہاری اختراعات ہیں. انہیں اس دین سے کچھ واسطہ نہیں جس کے تم مدّعی بنے بیٹھے ہو، لیکن جسے تم نے درحقیقت کچھ کا کچھ بنا رکھا ہے. اس لئے حضرت مریمؑ نے تاہل کی زندگی اختیار کرنے میں کوئی گناہ نہیں کیا. لہٰذا میں انہیں موردِ الزام قرار نہیں دیتا. یہ تمہاری شقاوت اور قساوتِ قلبی ہے جو ایک عفیفہ کے خلاف دریدہ دہنی سے کام لے رہے ہو. میں تو ایسا شقی القلب نہیں ہو سکتا. یقیناً وہ حسنِ سلوک کی مستحق ہے اور اس کے ساتھ میرا سلوک ایسا ہی ہوگا. وَبَرًّا بِوَالِدَتِی [1]

---

[1] انجیل میں اس کے برعکس یہ درج ہے کہ حضرت عیسیٰؑ اپنی والدہ سے درشتی سے پیش آیا کرتے تھے. متی میں ہے.

> جب وہ بھیڑ سے یہ کہہ ہی رہا تھا تو دیکھو اس کی ماں اور بھائی باہر کھڑے تھے اور اس سے بات کرنی چاہتے تھے ٥ کسی نے اس سے کہا. دیکھ تیری ماں اور تیرے بھائی باہر کھڑے ہیں اور تجھ سے بات کرنی چاہتے ہیں ٥ اس نے خبر دینے والے کے جواب میں کہا کون ہے میری ماں اور کون ہیں میرے بھائی؟ اور اپنے شاگردوں کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا دیکھو میری ماں اور میرے بھائی یہ ہیں ٥ کیونکہ جو کوئی میرے آسمانی باپ کی مرضی پر چلے وہی میرا بھائی اور بہن اور ماں ہے ٥ (متی ۴۶ — ۱۲/۵۰)

اس میں شبہ نہیں کہ اس وعظ میں حضرت عیسیٰؑ نے وہ عظیم الشان اصول بیان فرمایا ہے جس کی تبلیغ کے لئے تمام حضرات انبیائے کرامؑ تشریف لاتے رہے، یعنی انسانوں کی تقسیم باعتبارِ کفر و ایمان نہ بلحاظِ نسب و قومیت. لیکن اس واقعہ سے دو باتیں واضح ہیں. یا تو حضرت مسیحؑ کی والدہ آپ پر ایمان نہیں رکھتی تھیں اور "آسمانی باپ" کی مرضی پر نہیں چلتی تھیں، اس لئے آپ نے فرمایا کہ میری ماں وہ نہیں. میری ماں (اور بھائی) یہ لوگ ہیں جو خدا کی مرضی پر چلتے ہیں. اگر یہ صحیح ہے تو پھر عیسائیوں کے ہاں مریمؑ کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے اور اس کے بعد حضرت مریمؑ کی پرستش کیا معنی رکھتی ہے! اور اگر یہ غلط ہے تو پھر حضرت مسیحؑ کے اس سلوک کو کیا کہئے؟ (بہرحال یہ استفسار عیسائی حضرات سے ہے)۔

قرآنِ کریم نے حضرت یحییٰؑ کے متعلق بھی لکھا ہے کہ وہ اپنے ماں باپ سے نیک سلوک کرتے تھے اور سرکش و

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

اس سے اس امر کی شہادت مل گئی کہ حضرت مریمؑ نے مسلکِ رُہبانیت ترک کر دینے میں کسی جُرم کا ارتکاب نہیں کیا تھا اس لئے نہ آپ اور نہ آپ کا لڑکا کسی طعن و تشنیع کا مورد قرار پا سکتا تھا۔ اسی لئے دوسرے مقام پر، اللہ تعالیٰ نے اسے حضرت عیسٰیؑ اور آپ کی والدہ پر اپنا انعام قرار دیا ہے۔

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِيْ عَلَيْكَ وَ عَلٰى وَالِدَتِكَ ۘ اِذْ اَيَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۣ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَ كَهْلًا ۚ (۵/۱۱۰) نیز (۳/۴۶)

اور جب اللہ کہے گا، اے مریم کے بیٹے عیسٰیؑ! میں نے تم پر اور تمہاری ماں پر جو انعامات کئے ہیں انہیں یاد کرو۔ جب ایسا ہوا تھا کہ میں نے وحی کے ذریعے سے تمہیں تقویت دی تھی۔ تم لوگوں سے چھوٹی عمر میں بھی (وعظ و نصیحت کی) باتیں کرتے تھے اور بڑی عمر میں بھی (یعنی یہودیوں کی سازش کے علی الرغم تم نے عمر بھی بڑی پائی تھی)۔

⁂

یہ ہیں ولادتِ حضرت مسیحؑ کے متعلق واقعات جو قرآنِ کریم میں مذکور ہیں۔ انہی کے پیشِ نظر عیسائیوں سے کہا گیا کہ جب حقیقتِ حال یہ ہے تو پھر ابنیت کے عقیدہ کے کیا معنی؟

مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ سُبْحٰنَهٗ ؕ اِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝ (۱۹/۳۶ — ۳۵)

یہ بات خدا کے شایانِ شان ہی نہیں کہ وہ کسی کو اپنا بیٹا بنائے (تاکہ وہ کاروبارِ خداوندی میں اس کا ہاتھ بٹائے)۔ وہ اس سے بہت بلند ہے۔ اس کی قوتوں کا تو یہ عالم ہے کہ جب وہ کسی کام کے کرنے کا فیصلہ کر لیتا ہے تو وہ حکم کرتا ہے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتا ہے۔ (اسے اپنے ارادے اور احکام کو بروئے کار لانے کے لئے کسی مددگار کی ضرورت نہیں پڑتی)۔

(سابقہ صفحے کا فٹ نوٹ) جبّار نہ تھے (۱۹/۱۴)۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں عام طور پر والدین سے اچھا سلوک نہیں کیا جاتا تھا۔ اسی لئے اس خصوصیت کا ذکر نمایاں طور پر کیا گیا ہے۔

(باقی رہا ان کا یہ عقیدہ کہ مسیح خود خدا تھا، تو اس کی تردید کے لئے اس سے بڑھ کر اور کونسی دلیل ہو سکتی ہے کہ خود مسیحؑ کی دعوت یہ تھی کہ) میرا اور تمہارا، سب کا نشو و نما دینے والا، اللہ ہے۔ سو تم سب اس کی محکومیت اختیار کرو۔ یہ ہے زندگی کی صحیح، سیدھی اور متوازن راہ (۳/۵۰)۔

لیکن بایں ہمہ عیسائیوں نے باہمی اختلاف کیا (جس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے) اور اس قسم کا باطل عقیدہ لیکر بیٹھ گئے۔

فَاخْتَلَفَ الْأَحْزَابُ مِنْ بَيْنِهِمْ فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ كَفَرُوا مِن مَّشْهَدِ يَوْمٍ عَظِيمٍ ﴿۱۹/۳۷﴾۔

مگر پھر اس کے بعد ان کے مختلف فرقے آپس میں اختلاف کرنے لگے۔ تو جن لوگوں نے حقیقتِ حال سے انکار کیا، ان کی حالت پر افسوس! اس دن کے منظر پر افسوس، جو (آنے والا ہے اور جو) بڑا ہی سخت دن ہوگا!

رُوح پھونکنے سے مُراد

حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کے سلسلہ میں یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مریمؑ میں اپنی "روح پھونک دی"۔ فَنَفَخْنَا فِيهَا مِن رُّوحِنَا (۲۱/۹۱)۔ رُوح کے متعلق "ابلیس و آدم" (عنوان ملائکہ) میں بصراحت لکھا جا چکا ہے۔ آپ ایک مرتبہ متعلقہ مقام پر نگاہ ڈال لیجئے جہاں سے یہ واضح ہو جائے گا کہ اس سے مفہوم امرِ الٰہی بھی ہے۔ پھر نفخِ رُوح سے یہ مراد نہیں کہ سچ مچ کوئی شے پھونک دی جاتی ہے۔ یہی نفخِ روح خود تخلیقِ انسانی کے ضمن میں بھی آیا ہے جس سے مراد اس ہیولیٰ انسان میں جوہرِ انسانیت کی بیداری (خدائی صفات کی نمود) ہے۔ (دیکھئے "ابلیس و آدم" عنوان "انسان" اور اُس میں (۹ـ۳۲/۷)؛ ۱۵/۲۹؛ ۳۸/۷۲)۔ یہی نفخِ روح، مولودِ حضرت مریمؑ کے متعلق ہے۔ یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ فَنَفَخْنَا فِيهَا مِن رُّوحِنَا (۲۱/۹۱) میں فیھا کی ضمیر مؤنث ہے لیکن سورۃ تحریم میں فَنَفَخْنَا فِيهِ مِن رُّوحِنَا (۶۶/۱۲) آیا ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اس مؤخر الذکر آیت میں فِيهِ کی ضمیر کا مرجع، فرج ہے (آیت قرآنِ کریم سے نکال کر دیکھئے)۔ لیکن قیاسِ غالب یہ ہے کہ فِيهِ میں ضمیر مذکر حضرت عیسیٰؑ کی طرف راجع ہے جن کا ذکر مستور ہے۔ اس لئے کہ دوسری جگہ خود حضرت عیسیٰؑ کو رُوحٌ مِّنْهُ کہا گیا ہے (۴/۱۷۱)۔

مندرجہ صدر آیت میں حضرت عیسیٰؑ کو اللہ کا کلمہ کہا گیا ہے۔ نیز سورۃ آلِ عمران میں ہے

اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ۖ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ وَ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ۙ (۳/۴۴)

اسی سلسلہ میں، ملائکہ نے مریم سے کہا تھا کہ خدا تمہیں، اپنی طرف سے، ایک بات کی خوشخبری دیتا ہے، یعنی ایک بیٹے کی جس کا نام مسیح (اور) عیسیٰؑ ابنِ مریم ہوگا، دنیا میں صاحبِ وجاہت اور آخرت میں خدا کے مقربین میں سے۔

کلمے کے معنی

کلمہ کے معنی کیا ہیں؟ قرآنِ کریم میں لفظ (کلمہ جمع کلمٰت) متعدد معانی میں استعمال ہوا ہے۔ سب سے پہلے عام "بات" کے معنوں میں (دیکھئے ۹/۷۴؛ ۱۶/۹؛ ۱۸/۲۴؛ ۱۸/۵)۔ نیز کلمہ کے معنی ایسی بات کے بھی ہیں جس میں کوئی خصوصیت ہو۔ مثلاً قصۂ آدم میں ہے کہ ہبوط کے بعد آدم نے اپنے رب سے کلمات سیکھ لئے (۲/۳۷)۔ نیز دیکھئے (۹/۴۰؛ ۴۸/۲۶؛ ۳/۶۳)۔ اسی سلسلہ میں آگے قدم بڑھائیے تو کلمہ کے معنی بنیادی قانونِ خداوندی، نظریۂ حیات، آئیڈیالوجی یا مشن اور مقصدِ زندگی کے ملیں گے۔ سورۃ ابراہیم میں احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کا عظیم الشان اصول بیان کیا گیا ہے (جس کی تشریح کا یہ موقع نہیں) جس میں فرمایا ہے۔

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ۙ تُؤْتِيْۤ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۭ بِاِذْنِ رَبِّهَا ؕ وَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۠ وَ مَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِ ِۨاجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ ۠ يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَ يُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ ۙ۫ وَ يَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ۠ (۱۴/۲۴—۲۷)

ذرا غور کرو کہ ان ہر دو، متضاد نظریاتِ حیات اور نظامہائے زندگی کو خدا کس طرح ایک مثال کے ذریعے واضح کرتا ہے۔ خوشگوار نظریۂ زندگی کی مثال ایک عمدہ، پھلدار درخت

کی سی ہے جس کی جڑیں (پاتال میں) محکم اور استوار ہوں اور اس کی شاخیں فضائے آسمانی میں جھولے جھول رہی ہوں۔ (یعنی اسے معاشی زندگی میں مادی تمکن بھی حاصل ہو اور اس کے ساتھ ہی وہ بلند اخلاقی اقدار سے بھی ہمکنار ہو جن کا سرچشمہ مادی کائنات سے ماوراء ہے)۔

وہ درخت، قانونِ خداوندی کے مطابق، ہر زمانے میں، ہر وقت پھل دیئے جاتا ہے۔ اللہ، اس طرح، تجریدی اور نظری حقائق کو، محسوس مثالوں کے ذریعے واضح کر دیتا ہے تاکہ لوگ انہیں اچھی طرح سمجھ جائیں۔

اس کے برعکس، غلط نظریۂ زندگی اور نظامِ حیات کی مثال ایک ایسے نکمے درخت کی سی ہے جس کی کھوکھلی سی جڑ، زمین کے اوپر ہی ہو کہ اُسے جب جی چاہے، اکھاڑ کر پھینک دیا جائے۔ (جو غلط نظام، اخلاقی اقدارِ خداوندی سے ہمکنار نہیں ہوتا، اسے ثبات و قرار نصیب نہیں ہو سکتا)۔

اس طرح اللہ، اس محکم نظریۂ زندگی کی رُو سے، ایمان والوں کی جماعت کو، ان کی دنیاوی اور اُخروی زندگی (دونوں) میں، ثبات اور تمکن عطا کر دیتا ہے اور جو لوگ اس نظام سے سرکشی برتتے ہیں، ان کی کوششیں رائگاں چلی جاتی ہیں۔ یہ سب کچھ اس کے قانونِ مشیت کے مطابق ہوتا ہے۔

بمعنی قوانینِ الٰہیہ

ظاہر ہے کہ خدا کے مخلص بندوں کی ان تدابیر و مقاصدِ عالیہ کے استحکام و برومندی کی وجہ یہ ہے کہ وہ مشیتِ ایزدی سے ہم آہنگ ہوتے ہیں اور خود قوانینِ الٰہیہ کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ انہیں استحکام و ثبات حاصل ہو۔ اس لئے قوانینِ الٰہیہ کے لئے بھی کلمات اللہ کے الفاظ آئے ہیں۔ سورۃ انعام میں ہے۔

وَ لَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَ اُوْذُوْا حَتّٰۤى اَتٰىهُمْ نَصْرُنَا ۚ وَ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ وَ لَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِی الْمُرْسَلِیْنَ ۝ (۶/۳۴)

اور یہ واقعہ ہے کہ تم سے پہلے بھی خدا کے رسول جھٹلائے گئے۔ سو انہوں نے لوگوں کے

جھٹلانے اور اذیّت دینے پر استقامت سے کام لیا (اور اپنے کام میں لگے رہے) یہاں تک کہ (بالآخر) ہماری مدد آپہنچی اور (یاد رکھو! یہ اللہ کا مقررہ قانون ہے) کوئی نہیں جو اس کے قوانین کو بدل دینے والا ہو اور رسولوں کے حالات میں سے بعض کے حالات تو تم تک پہنچ ہی چکے ہیں۔

اور اللہ کے قوانین صدق و عدل سے پورے ہو کر رہتے ہیں۔

وَ تَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّ عَدْلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ○ (۶/۱۱۵)

اور تمہارے پروردگار کا قانون سچائی اور انصاف کے ساتھ (پورا ہو کر رہے گا۔ یوں سمجھ کر کہ) پورا ہو گیا۔ اُس کے قوانین کا کوئی بدلنے والا نہیں۔ وہ (سب کچھ) سننے والا سب کچھ جاننے والا ہے۔

یعنی اس دنیا میں جماعتِ حقّہ (حزب اللہ) کی کامیابی اور فائز المرامی اور حیاتِ اُخروی میں سرخروئی و سرفرازی۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا يَتَّقُوْنَ ؕ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِى الْاٰخِرَةِ ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ؕ (۶۳–۱۰/۶۴)

یہ وہ لوگ ہیں کہ ایمان لائے اور زندگی ایسی بسر کی کہ برائیوں سے بچتے رہے۔ ان کے لئے دنیا کی زندگی میں بھی (کامرانی و سعادت کی) بشارت ہے اور آخرت کی زندگی میں بھی۔ اللہ کے قوانین اٹل ہیں کبھی بدلنے والے نہیں! اور یہی سب سے بڑی فیروزمندی ہے جو انسان کے حصہ میں آسکتی ہے۔

یہی وہ قانون (کلمہ۔ اصول) تھا جس کے مطابق ساحرینِ فرعون کو ناکامی اور حضرت موسیٰؑ کو کامرانی نصیب ہوئی۔ سورۂ یونس میں ہے۔

وَ يُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ؑ (۱۰/۸۲)

وہ حق کو اپنے قوانین کے مطابق ضرور ثابت کر دکھائے گا۔ اگرچہ ان لوگوں کو جو مجرم ہیں

ایسا ہونا پسند نہ آئے۔

اس لئے کہ یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ خدا کے فرستادگان ہمیشہ غالب و منصور رہیں گے۔

وَ لَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ۝ (۳۷/۱۷۱)

اور یہ حقیقت ہے کہ ہمارا قانون ہمارے بندوں (یعنی رسولوں) کی نسبت پہلے ہی سے ہو چکا ہے (کہ وہ کامیاب ہو کر رہیں گے)۔

سورۂ انفال میں ہے۔

وَ اِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَ تَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَ يَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ (۸/۷)

اور (مسلمانو!) جب ایسا ہوا تھا کہ اللہ نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ (دشمنوں کی) دو جماعتوں میں سے کوئی ایک تمہارے ہاتھ ضرور آئے گی اور تمہارا حال یہ تھا کہ چاہتے تھے کہ جس جماعت میں لڑائی کی طاقت نہیں (یعنی قافلہ والی) وہ ہاتھ آجائے اور (خدا کا چاہنا دوسرا تھا) خدا چاہتا تھا، اپنے قانون کے ذریعہ حق کو ثابت کر دے اور دشمنانِ حق کی جڑ بنیاد یں کاٹ کر رکھ دے!

لیکن تدابیر باطل کی جڑیں کٹنے کے لئے مہلت اور وقفہ ضروری ہے اور یہ بھی اللہ ہی کا قانون ہے۔

وَ مَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا ؕ وَ لَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيْمَا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝ (۱۰/۱۹)

اور (ابتدا میں) انسانوں کی ایک ہی اُمت تھی پھر الگ الگ ہو گئے اور اگر تمہارے پروردگار کی جانب سے ہی یہ قانون مقرر نہ ہو چکا ہوتا (کہ لوگوں کو آزادیٔ عمل دی گئی ہے) تو جن باتوں میں لوگ اختلاف کر رہے ہیں ان کا فیصلہ کبھی کا ہو چکا ہوتا۔

سورۂ ہود میں ہے۔

وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ؕ وَ لَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ؕ وَ اِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ

مِّنْهُ مُرِيْبٍ ۝ (۱۱/۱۱۰)۔

اور ہم نے موسیٰؑ کو کتاب دی تھی۔ پھر اس میں اختلاف کیا گیا اور اگر تیرے پروردگار کا پہلے سے یہ قانون مقرر نہ ہو چکا ہوتا' (یعنی یہ کہ دنیا میں ہر انسان کو مہلت عمل ملتی ہے) تو البتہ اُن کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا۔ اور اُن لوگوں کو اس کی نسبت شُبہ ہے کہ حیرانی میں پڑے ہیں۔

سورۂ طٰہٰ میں ہے۔

وَ لَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَّ اَجَلٌ مُّسَمًّى ۝ (۲۰/۱۲۹)

اور (اے پیغمبر!) اگر ایسا نہ ہوتا کہ پہلے سے تیرے پروردگار نے (اس بارے میں) ایک قانون ٹھہرا لیا ہے تو اسی گھڑی ان پر (جرم کا) الزام لگ جاتا اور مقررہ وقت نمودار ہو جاتا!

اس سلسلہ میں حسب ذیل آیات بھی دیکھئے۔

(۴۱/۴۵؛ ۴۲/۱۴؛ ۴۲/۲۱؛ ۳۹/۱۹؛ ۳۹/۷۱؛ ۴۰/۶؛ ۱۱/۱۱۹؛ ۱۰/۹۶؛ ۱۰/۳۳؛ ۱۸/۲۷)

آیات میں کلمہ یا کلمات کے جو الفاظ آئے ہیں انہیں آپ احکامِ الٰہیہ کہہ لیجئے یا اس کے وعدے یا قوانین' بات ایک ہی ہے۔ اگر کوئی کہے کہ سنکھیا مت کھانا' اس سے موت واقع ہو جائے گی' تو یہ ایک حکم بھی ہے اور قانون اور تنذیر بھی۔ جو اسے سچا مان لے گا ہلاکت سے محفوظ ہو جائے گا۔ جو انکار کرے گا تباہ ہو جائے گا۔ اسی کا نام ایمان اور کفر ہے۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ج لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ ص فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ كَلِمٰتِهٖ وَ اتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝ (۷/۱۵۸)

---

[1] دیکھئے آیات (۲/۱۲۴؛ ۴۳/۲۸)

(اے پیغمبر! تم لوگوں سے کہو) "اے افرادِ نسلِ انسانی! میں تم سب کی طرف خدا کا بھیجا ہوا آیا ہوں، وہ خدا کہ آسمانوں اور زمین کی ساری بادشاہت اُسی کے لئے ہے۔ کوئی الٰہ نہیں مگر اُسی کی ذات۔ موت اور حیات اس کے قوانین سے وابستہ ہے۔ بس اللہ پر ایمان لاؤ، اور اس کے رسول، نبیِ اُمّی پر، جو اللہ اور اس کے کلمات (یعنی اس کے قوانین) پر ایمان رکھتا ہے اور اس کی پیروی کرو تاکہ (کامیابی کی) راہ تم پر کھل جائے۔"

کتابِ فطرت اور کلامُ اللہ میں

یہ قوانین کتابِ فطرت کے ایک ایک صفحہ پر بھی بکھرے ہوئے ہیں (اور جہاں تک انسانوں کا تعلق ہے قرآنِ کریم میں محفوظ ہیں)۔ ان کا احاطہ ناممکن ہے۔ ذرا کسی ماہرِ علم الافلاک سے پوچھئے کہ جس کہکشاں کو آپ کے شاعر "گردِ مرمریں" کہہ کر اپنا جی بہلا لیتے ہیں وہ کتنی وسعت ناآشنا اور حدود فراموش کائناتوں کا مجموعہ ہے جن میں سے ہر کائنات اتنی بڑی ہے کہ ہماری دنیا اس کے سامنے رائی کے دانہ کی بھی نسبت نہیں رکھتی۔ ان کائناتوں میں کلمات اللہ کا حصر و احاطہ کس کے بس کی بات ہے۔

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَ لَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا ○ (۱۸/۱۰۹) نیز (۳۱/۲۷)

(اے پیغمبر!) اعلان کردے، اگر میرے پروردگار کے "کلمات" لکھنے کے لئے دنیا کے سمندر سیاہی بن جائیں تو سمندر کا پانی ختم ہو جائے گا مگر میرے پروردگار کے "کلمات" ختم نہ ہوں گے۔ اگر ان سمندروں کا ساتھ دینے کے لئے ویسے ہی سمندر اور بھی پیدا کر دیں، جب بھی وہ کفایت نہ کریں!

حضرت عیسیٰؑ کلمتُ اللہ تھے

کلمتُ اللہ کے ان معانی کو سامنے رکھئے اور پھر غور کیجئے ان آیات پر جن میں حضرت عیسیٰؑ کو کلمۃ اللہ کہا گیا ہے (ان آیات کو پہلے درج کیا جا چکا ہے، یعنی ۴/۱۷۱؛ ۳/۴۵)۔ ان آیات میں کلمہ کے معنی تدبیر، حکم، وعدہ، قانون، بشارت، کچھ بھی لیجئے، مفہوم واضح ہے، یعنی حضرت عیسیٰؑ تدبیرِ الٰہیہ کے سلسلۂ زریں کی ایک کڑی تھے جسے انسانوں کی رشد و ہدایت کے لئے حضرات انبیاء کرامؑ کی شکل میں دنیا میں بھیجا جاتا رہا یا آپ اس وعدہ کی تکمیل تھے جو حضرت مریمؑ سے کیا گیا تھا (کہ انہیں ایک آبرومند بیٹا عطا کیا جائے گا) یا امرِ الٰہی

(خدا کا حکم) تھا جو قانونِ مشیت کے تابع پورا ہوا جیسے اللہ کا ہر امر ایک قاعدہ اور قانون کے ماتحت پورا ہوتا ہے۔ سورۂ تحریم میں حضرت مریمؑ کے متعلق ہے۔

وَ مَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا وَ صَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَ كُتُبِهٖ وَ كَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ ع (۶۶/۱۲)۔

اور عمران کی بیٹی مریم جس نے اپنی (عصمت و پاک دامنی کی) حفاظت کی چنانچہ اُس (بچے) میں ہم نے اپنی روح پھونک دی اور اُس نے اپنے پروردگار کے احکام و قوانین کی تصدیق کی تھی۔ اور وہ تھی ہی مطیع و فرماں بردار لوگوں میں سے۔

یہاں کلمات کے معنی "کتب" (احکام) اور "قانت" (فرماں پذیر) سے واضح ہو جاتے ہیں۔ اگر وہ دو آیات بھی سامنے رکھ لی جائیں جو اس سے پہلے آئی ہیں تو بات اور بھی واضح ہو جاتی ہے۔ یعنی حضرت مریمؑ ایک نیک بخت اور پارسا، مجسمۂ عفت و عصمت اور پیکرِ ناموس و شرافت تھیں جنہوں نے اپنے اعمالِ حیات سے احکامِ الٰہیہ کی تصدیق کردی۔ یہی کچھ حضرت یحییٰؑ کے متعلق فرمایا۔

فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ هُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًۢا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ سَيِّدًا وَّ حَصُوْرًا وَّ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ○ (۳/۳۹)

پھر ملائکہ نے زکریا کو پکارا اور وہ محراب میں کھڑا نماز پڑھ رہا تھا، اور کہا کہ خدا تمہیں یحییٰ کی (یعنی ایک لڑکے کی جو پیدا ہوگا اور اُس کا نام یحییٰ رکھا جائے گا) بشارت دیتا ہے قانونِ خداوندی کو سچ کر دکھانے والا ہوگا، ایک بڑی جماعت کا سردار صاحبِ نظم و ضبط اور خدا کے صالح بندوں میں سے ایک نبی ہوگا۔

یہاں اگر کلمہ کے معنی وعدہ بھی لئے جائیں تو بھی مفہوم صاف ہے کہ حضرت یحییٰؑ کی پیدائش خدا کے اس وعدہ کی تصدیق تھی جو اس نے اپنے بندے زکریاؑ سے کیا تھا (کہ اسے ایک فرزند سعید و صالح عطا فرمائے گا)۔ یہ معنی اگر حضرت مریمؑ پر بھی منطبق کئے جائیں تو مفہوم یہ ہوگا کہ اللہ کے وعدے جو اُس نے بنی اسرائیل سے کر رکھے تھے کہ تم میں ایک مسیحؑ پیدا ہوگا، ان کی تصدیق حضرت مریمؑ کی

وساطت سے ہوگئی۔

تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت سامنے آگئی ہوگئی کہ حضرت عیسیٰ کو کلمتہ اللہ کہنے سے ان میں (جیسا کہ عیسائیوں کا عقیدہ ہے) کسی طرح بھی شانِ الوہیت پیدا نہیں ہوجاتی۔ کائنات کی ہر شے کلمتہ اللہ ہے اور انہی میں سے حضرت عیسیٰ ہیں[1]۔

پیدائشِ عیسیٰ کے ضمن میں قرآنِ کریم کی ابھی ایک اور آیت باقی ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں ہے۔

إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِندَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ ۖ خَلَقَهُ مِن تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُن فَيَكُونُ ۝ (۳/۵۸)

(یہاں تک بات یہودیوں کے متعلق تھی۔ اب آؤ عیسائیوں کے اس دعوے کی طرف کہ "عیسیٰ بن باپ پیدا ہوئے تھے اور اس لئے وہ خدا کے بیٹے ہیں" سو ان سے کہہ دو کہ یہ تمہارے ذہن کی تراشیدہ باتیں ہیں) خدا کے نزدیک عیسیٰ کی پیدائش کی بھی وہی کیفیت ہے جو ہر آدمی کی پیدائش کی ہوتی ہے ــ انسان کے سلسلۂ پیدائش کی ابتدا مٹی (جمادات) سے ہوتی ہے اور پھر وہ، خدا کی مقرر کردہ اسکیم کے مطابق، مختلف مراحل طے کرتا ہوا پیکرِ بشریت میں آجاتا

---

[1] عیسائیوں کے مختلف فرقے مختلف انداز سے حضرت مسیح میں صفاتِ الوہیت کے قائل ہیں۔ ان میں اسکندریہ کے عیسائی آپ کو لوگاس یعنی ازلی کلمتہ اللہ کہتے تھے۔ قرآنِ کریم نے کلمتہ اللہ کی تشریح فرماکر اس حقیقت کو بھی بے نقاب کردیا کہ حضرت عیسیٰ کے کلمتہ اللہ ہونے سے نہ ان میں شانِ الوہیت پیدا ہوسکتی ہے نہ ازلیت و سرمدیت۔ وہ کلمتہ اللہ ان ہی معانی میں ہیں جن میں اوپر ذکر کیا جاچکا ہے۔ لہٰذا اللہ کے ایک برگزیدہ بندے اور بس!

قَالَ إِنِّي عَبْدُ اللَّهِ آتَانِيَ الْكِتَابَ وَجَعَلَنِي نَبِيًّا (۱۹/۳۰)

اُس نے کہا۔ "میں اللہ کا بندہ ہوں۔ اس نے مجھے کتاب دی اور نبی بنایا۔

عیسائیوں نے اس کے نظریہ پر اپنے فلسفۂ الٰہیات کی ایک عظیم عمارت قائم کر رکھی ہے جس کی رُو سے یہ لوگاس (کلمتہ اللہ) تثلیث کے اقانیمِ ثلاثہ کا اقنومِ ثانی ہے۔ لیکن یہ فلسفہ یونان سے مستعار لیا گیا ہے اور اسے اس پیغامِ خداوندی سے کچھ علاقہ نہیں جس کے علمبردار حضرت عیسیٰ تھے۔ درحقیقت یہ سب شاخسانے عقیدۂ ابنیت کی پیداوار ہیں جس نے اللہ کے ایک رسول اور انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔

ہے (۵/۲۲؛ ۳۰/۲۰)۔ اسی طرح عیسیٰؑ کی پیدائش ہوئی تھی (اس لئے نہ وہ عیسائیوں کے عقیدے کے مطابق خدا ہے، نہ خدا کا بیٹا)۔

مثلِ آدم سے مفہوم

بیان کیا جاتا ہے کہ نجران کے عیسائیوں کا ایک وفد حضرت عیسیٰؑ کے متعلق قرآنی عقائد پر بحث وتمحیص کی غرض سے نبی کریمؐ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا۔ سورۂ آلِ عمران کی مندرجہ صدر اور اس سے متصل دو تین دوسری آیات اسی واقعہ کے متعلق بتائی جاتی ہیں۔ آیت مندرجہ صدر میں چونکہ حضرت عیسیٰؑ کی مماثلت ومشابہت "آدم" سے بیان کی گئی ہے اس لئے اس سے مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ پیدائشِ "آدم" کی طرح حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش بھی مافوق العادت طریق سے ظہور میں آئی تھی۔ لیکن اس آیتِ مقدسہ کو جب قرآن کریم کی دوسری متعلقہ آیات کی روشنی میں دیکھا جائے (جن کا ذکر گذشتہ صفحات میں آچکا ہے) تو پھر محض اس مماثلت سے اس نتیجہ پر پہنچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ بعض حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ آیت بطور الزامی جواب کے ہے یعنی عیسائیوں سے یہ کہا گیا ہے کہ بفرضِ محال (جیسا کہ تم کہتے ہو) اگر یہ صحیح تسلیم کر لیا جائے کہ حضرت مسیحؑ بن باپ کے پیدا ہوئے تھے تو بھی اس سے یہ کیسے ثابت ہو گیا کہ وہ ابن اللہ تھے۔ اگر بن باپ کے پیدا ہو جانے سے کوئی شخص ابن اللہ ہو سکتا ہے تو آدم جو باپ اور ماں دونوں کے بغیر پیدا ہوئے تھے ان کے متعلق کیا مانا جائے؟ انہیں تو ابن اللہ سے کچھ بڑھ کر ہونا چاہیئے! لیکن اس آیت میں ارشاد ہے کہ اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ "یعنی" اللہ کے نزدیک عیسیٰؑ کی مثال آدم کی سی ہے"۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ الزامی جواب نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ہمارے نزدیک حقیقتِ حال یوں ہے۔

ہم "ابلیس وآدم" میں بیان کردہ قصۂ آدم میں دیکھ چکے ہیں کہ وہ آدمؑ جس کی تخلیق کا ذکر آیا ہے کسی شخصِ واحد کا نام نہیں۔ بلکہ اس سے مراد خود نوعِ انسانی ہے جس کی تخلیق کی ابتدا مٹی سے ہوئی اور ارتقائی مدارج طے کرتے کرتے موجودہ شکل پیدا ہو گئی۔ اس اعتبار سے قرآنِ کریم نے متعدد مقامات پر عام انسانوں سے یہی کہا ہے کہ تمہاری تخلیق مٹی سے ہوئی ہے۔ تفصیل انسان اور آدمؑ کے عنوانوں میں (ابلیس وآدم میں) گذر چکی ہے۔ آپ اس سلسلہ میں آیات (۵/۲۲؛ ۳۰/۲۰) دیکھ لیں۔ ان آیات میں کہا گیا ہے کہ آدمؑ (یعنی نوعِ انسانی) کی تخلیق کی ابتدا مٹی سے ہوئی۔ لیکن ابتدا کو انتہا تک پہنچنے

کے لئے مختلف تدریجی مراحل طے کرنے پڑے اور یہی کُنْ فیکون ہے۔ اسی قسم کا کن فیکون حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کے سلسلہ میں ہم دیکھ چکے ہیں۔ وہاں بھی مقصود ابتدار سے انتہا تک مختلف تدریجی مراحل طے کرنے سے ہے۔ حضرت یحییٰؑ کی پیدائش کا ذکر بھی پہلے گذر چکا ہے جب حضرت زکریا نے بیٹے کی موعودہ ولادت پر اظہارِ تعجب کیا تو ارشاد ہوا کہ تعجب کیا ہے! وَ قَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَ لَمْ تَكُ شَيْئًا (۱۹/۹) اس سے پیشتر ہم تمہیں پیدا کر چکے ہیں، درانحالیکہ تم کچھ بھی نہ تھے۔ اور ظاہر ہے کہ حضرت زکریا کی اپنی پیدائش عام حالات کے ماتحت ہی ہوئی تھی۔ اسی طرح حضرت یحییٰؑ کی پیدائش ہوئی۔ یہی ارشاد مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ میں ہے۔

اس آیت کے صحیح مفہوم میں دشواری اس لئے پیش آتی ہے کہ آدمؑ کے متعلق صحیح قرآنی مفہوم سامنے نہیں ہوتا۔ آدم کے متعلق (جیسا کہ عام عقیدہ ہے) یہی سمجھا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک مٹی کا پتلا بنا دیا اور اس میں جان ڈال دی۔ پھر اس کی پسلی سے اس کی بیوی نکالی اور ان دونوں سے پھر سلسلۂ تخلیق آگے بڑھا۔ لیکن جیسا کہ عنوان آدم و انسان (ابلیس و آدم) میں بتصریح لکھا جا چکا ہے تخلیقِ انسانی کا یہ تصور ذہنِ انسانی کے عہدِ طفولیت کی پیداوار ہے۔ قرآنِ کریم نے انسانی پیدائش کے متعلق نظریۂ ارتقاء کی واضح تشریح کر دی ہے..... اس کی روشنی میں آدم اور اسکی تخلیق کے متعلق حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ تخلیقِ آدم (یعنی نوعِ انسانی) کے متعلق اس حقیقت کو سامنے رکھئے پھر آیۃ زیرِ نظر (اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ) کا مفہوم بھی واضح ہو جائے گا۔ یعنی (اے عیسائیو!) تم اپنے ذہن میں حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کے متعلق کچھ بھی عقائد رکھو! اللہ کے نزدیک تو ان کی پیدائش نوعِ انسانی کی پیدائش کے مثل ہے جو اپنی ابتدار سے انتہا تک مختلف مدارج طے کر کے تکمیل تک پہنچی۔ ایسا ہی حضرت عیسیٰؑ کے متعلق ہوا۔

اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ۝ (۳/۵۹)

(اے پیغمبر! مسیح کے انسان ہونے اور اس کی پیدائش کی نسبت جو کچھ کہا گیا ہے، تو) یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے امرِ حق ہے۔ سو تیرے لئے اس باب میں بحث و جدل کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔

قرآنِ کریم نے حضرت عیسیٰؑ کو مثلِ آدم اس لئے بھی کہا ہے کہ اناجیل کے بیان کے مطابق

حضرت عیسیٰؑ خود اپنے آپ کو ابنِ آدم کہا کرتے تھے۔ مثلاً انجیل متی میں ہے۔

تب اس نے (مسیح نے) شاگردوں کے پاس آکر کہا اب سوتے رہو اور آرام کرو۔ دیکھو وقت آپہنچا ہے اور ابنِ آدم گناہگاروں کے حوالے کیا جاتا ہے ۰

(متی باب ۲۶۔ آیت ۴۵)

لہذا جو اپنے آپ کو 'ابنِ آدم' کہتا ہے اس کی پیدائش کی مثال خود آدم (آدمی) کی ہے۔ وہ آدمی کا بیٹا ہے اور آدمی ہی کی طرح خود بھی پیدا ہوا ہے۔

ان سوالات کی اہمیت کیوں؟

پیدائش اور وفاتِ حضرتِ عیسیٰؑ کے متعلق ہم قرآنِ کریم سے یہ کچھ سمجھ سکے ہیں لیکن اگر آپ ان نتائج سے متفق نہ ہوں تو قرآنی آیات آپ کے سامنے ہیں (جیساکہ متعدد بار لکھا جاچکا ہے)۔ آپ ان پر از خود غور کیجئے کیونکہ قرآن ہر ایک کو غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ لیکن تدبر فی القرآن میں خارجی اثرات کو داخل نہ ہونے دیجئے کہ اللہ کی کتابِ محکم اس سے بہت بلند و بالا ہے۔ اس باب میں آپ کی قلبی کیفیات کا ہمیں پورا پورا اندازہ ہے۔ اس لئے کہ ان مسائل (بالخصوص وفات و حیاتِ حضرت مسیحؑ) کو اس قدر اہمیت حاصل ہوگئی ہے کہ ہر شخص کا اس بحث میں اُلجھنے کو جی چاہتا ہے۔ حالانکہ آپ غور کیجئے تو حضرت عیسیٰؑ کی وفات علمی دنیا میں ایک تاریخی سوال اور دنیائے مذہب میں قرآنی مسائل میں سے ایک مسئلہ ہے۔ جس طرح قرآنِ کریم کے متعدد دیگر مسائل کو غور و فکر اور تاریخی انکشافات کی روشنی میں سمجھا جاسکتا ہے' اسی طرح اس پر بھی غور و تدبر ہونا چاہیئے۔ اس سے زیادہ اسے حیثیت حاصل نہیں۔ عیسائیوں میں یہ مسئلہ ان کے مذہب کی بنیاد و اساس کی حیثیت رکھتا ہے اس لئے ان کے ہاں اس کی خاص اہمیت کی وجہ سمجھ میں آسکتی ہے۔ لیکن ہمارے ہاں یہ سوال دین کے اصول و اساس میں سے نہیں۔ لیکن دورِ حاضرہ میں (بالخصوص بعض مخصوص مقاصد کے ماتحت) اسے اس قدر اہمیت دی گئی ہے کہ اس سوال کو کفر و ایمان کا معیار بنا دیا گیا ہے۔ جب آپ سنجیدگی سے اس سوال پر غور کریں گے یقیناً حیران رہ جائیں گے کہ جب کسی قوم کے سامنے زندہ نصب العینِ حیات نہیں رہتا تو کس طرح اس کے قوائے عملیہ مفلوج ہوجاتے ہیں اور وہ کس طرح اپنا سارا وقت منطقی موشگافیوں اور دُور از کار فلسفیانہ نکتہ آفرینیوں میں صرف کرتی اور ان لاحاصل نظری مباحث کو

خاص اہمیت دے کر اپنے آپ کو فریب میں مبتلا رکھتی ہے. جب تک مسلمانوں کی نگاہوں کے سامنے زندگی کا واضح نصب العین اور ان کے قلوب میں اس کے حصول کی تڑپ تھی وہ اس قسم کے مباحث میں کبھی وقت ضائع نہیں کرتے تھے۔ آپ صدرِ اوّل کی تاریخ پر نگاہ ڈالئے جب ایک مختصر سی جماعت نے ہر طاغوتی قوت کا تختہ الٹ کر رکھ دیا تھا۔ آپ کو کہیں اس قسم کے نظری مسائل کی خار دار جھاڑیاں نظر نہیں پڑیں گی جو اُن کے دامنِ خیال و قوت کو اُلجھا کر بےگانۂ منزل بنا دیں. اس وقت ہوتا یہ تھا کہ ان کے خدا نے ایک حکم دیا، مرکز نے اس کی تشکیل فرما دی اور انہوں نے اس کی تکمیل کر کے دکھا دی.

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں
بلبل چہ گفت و گُل چہ شنید و صبا چہ کرد؟

نظریٔ مسائل اور مسلمان

دنیا کی کوئی قوت نہ تھی جو اس بے پناہ جذبۂ عمل و اطاعت کے سامنے ٹھہر سکتی. لیکن اس کے بعد جب دورِ انحطاط شروع ہوا تو شکست خوردہ طاغوتی قوتوں نے اِدھر اُدھر سے سر نکالا۔ قیصریت، برہمنیت، کورانہ تقلید کی لعنت ایک ایک کر کے ان کے قلب و نگاہ کی دنیا پر مسلط ہو گئی. اسی کے ساتھ یہود و نصاریٰ اور ایران و روما کے زخم خوردہ جیوش و عساکر اپنی ناکامیوں اور نامرادیوں کے انتقام کے لئے صف آرا ہو گئے. اب میدانِ جہاد کی جگہ مناظروں کے اکھاڑوں نے لے لی اور قرآنی نظام کی جگہ عجمی تصوراتِ زندگی نے. عیسائی احبار اپنے "خدائے مصلوب" کے چھنے ہوئے مقامِ الوہیت کی بازیابی کی فکر میں تھے۔ انہوں نے اپنے عقائد کو اس طرح غیر شعوری طور پر مسلمانوں کی ذہنیت پر مرتسم کرنا شروع کیا کہ کچھ عرصے کے بعد وہی عقائد ان کے اجزائے دین بن گئے اور یہود و نصاریٰ کی منظم سازشوں سے روایات کی شکل اختیار کر گئے. قرآن پیچھے چلا گیا اور اس قسم کی وضعی روایات آگے بڑھ آئیں اور یوں

حقیقت خرافات میں کھو گئی

اس کے بعد معاند قوتوں کی مسلسل کوشش رہی کہ مسلمان ان نظری مسائل کی خار دار جھاڑیوں سے نکلنے نہ پائیں۔ اپنے ہاں تو انہوں نے تقسیم عمل کا اصول رائج کر لیا جس کی رُو سے پوری کی پوری قوم حصولِ قوت و سطوت میں سرگرمِ عمل رہتی لیکن کچھ لوگ اس غرض کے لئے الگ کر دیئے جاتے کہ وہ مسلمانوں کو مناظروں کی تھپکیاں دے دے کر سلاتے رہیں۔ اس طرح ہوا یہ کہ

یاں لعلِ فسوں ساز نے باتوں میں لگایا
دے پیچ اُدھر زُلف اڑا لے گئی دل کو

خود فریب وحقیقت فراموش مسلمان سمجھ ہی نہ سکا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ گذشتہ زمانے میں کیا کچھ ہوا؟ اگر آپ اس کے سمجھنے کی زحمت نہ بھی گوارا کریں تو بھی جو کچھ آپ کے سامنے ہوا اُسی سے اندازہ لگا لیجئے کہ یہ کچھ کس طرح ہوا؟ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ گذشتہ پچاس سال سے، جبکہ پرانی دنیا ایک پورے انقلاب سے گزر کر یکسر نئی دنیا میں تبدیل ہو چکی ہے اور صفحۂ ارض پر ایک عجیب ہنگامۂ رست و خیز برپا ہے، ہندی (اور اب پاکستانی) مسلمان کی ساری قوتیں اس عقدہ کے حل کرنے میں صرف ہو رہی ہیں کہ

ابنِ مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے؟

"جدید نبوت!" سادہ لوح مسلمان دورِ حاضرہ کی "جدید قادیانی نبوت" کی کامیابی و ناکامی کے اندازے مردم شماری کے اعداد و شمار سے لگاتا ہے اور خوش ہو جاتا ہے کہ دس کروڑ کے سمندر میں اس "نبوت" کے متبعین کی تعداد چند قطروں سے زیادہ نہیں۔ لیکن وہ نہیں سوچتا کہ اس "نبوت" نے کس طرح اس بحرِ زخار کو اس کی اپنی ہی موجوں کے طلسمِ پیچ و تاب میں الجھائے رکھا اور یوں اس کی وہ قیامت خیز تلاطم انگیزیاں جو دنیا کا نقشہ بدل دینے کے لئے کافی ہو سکتی تھیں، اپنے ہی بھنور میں گھر کر ضائع ہو گئیں۔ کیا یہ کامیابی چھوٹی کامیابی ہے؟ مسلمان اس نصف صدی کی روئداد پڑھ پڑھ کر خوش ہوتا ہے کہ ہم نے بحث و جدل کا فلاں میدان مارا اور ہمارے فلاں مولوی صاحب نے فلاں مناظرہ جیتا اور آسمان اس پر ہنس رہا ہوتا ہے کہ

اس سرابِ رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تُو
آہ اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تُو

اس تمام طلسمِ پیچ و تاب کا ذمہ دار کون ہے؟ وہ چند روایات جن میں مذکور ہے کہ حضرت عیسیٰؑ بجسدِ عنصری آسمان پر زندہ ہیں اور قیامت کے قریب دوبارہ زندہ ہوں گے۔ ان چند روایات نے آج تک مسلمانوں کے پاؤں کہیں ٹکنے ہی نہیں دیئے۔ اس کے ساتھ ہی ہر صدی کے اخیر پر ایک مجدد اور پھر ایک "مہدیٔ آخر الزماں" کی آمد سے متعلقہ روایات۔ مسلمانوں کی حالت یہ

"آنے والے" کا عقیدہ

ہے کہ ایک "آنے والے" کے لئے کھڑکی خود کھول دی. لیکن جب کوئی اس کھڑکی کے راستے اندر آیا تو اس کے ساتھ گتھم گتھا ہونا شروع ہو گئے. ان سے پوچھئے کہ جس دروازہ کو "ختمِ نبوّت" کے عظیم الشان قفل نے بند کیا تھا اس میں اس قسم کے دریچوں اور کھڑکیوں کی گنجائش ہی کہاں تھی ؟ آپ کو معلوم ہے کہ " اس جدید نبوّت" کی بحث کا مدار کیا ہوتا ہے ؟ پہلے قرآن کی رُو سے ثابت کیا جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ فوت ہو چکے ہیں ــــ بہت اچھا ــــ بات ختم ہو گئی! لیکن بات تو اس کے نزدیک ختم ہو جائے جو قرآنِ کریم کو دین کا مدار مانے. اب وہ آگے بڑھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دیکھئے کہ فلاں روایت میں حضرت عیسیٰؑ کے آنے کی خبر موجود ہے. اس لئے وہ آنے والا "مسیح ابنِ مریمؑ" نہیں ہو سکتا بلکہ اس کا مثیل ہو گا اور وہ مثیلِ مسیح تشریف لے آئے ہیں. بس یہ ہے ساری گتھی ــــ اور اس کا حل ؟ کس قدر آسان!! یعنی ان سے کہیئے کہ

(i) آپ مانتے ہیں کہ قرآن سے ثابت ہے کہ حضرت عیسیٰؑ فوت ہو چکے اور ان کے دوبارہ تشریف لانے کا ذکر قرآنِ کریم میں کہیں نہیں آیا. اس لئے

(ii) کوئی روایت جو حضرت عیسیٰؑ کی آمد کی خبر دیتی ہے، وضعی اور جھوٹی ہے جو ہمارے لئے سند نہیں ہو سکتی. اب فرمایئے کیا ارشاد ہے ؟

لیجئے بحث ختم ہو گئی. لیکن یہاں تو مصیبت یہ ہے کہ ان روایات کو محکم اور اٹل سمجھا جاتا ہے اور قرآنی آیات کے معانی اس طرح کئے جاتے ہیں جس سے کسی نہ کسی طرح وہ روایات سچی قرار پا جائیں.

مُسلمان کی زندگی

جب تک آپ کی یہ روش ہے قیامت تک کے لئے مدعیانِ مسیحیت و مہدویت آتے رہیں گے اور آپ کو انہی لاطائل مسائل میں الجھا الجھا کر ختم کر دیں گے. اور اگر سچ پوچھئے تو اس جھگڑے کی ضرورت ہی کیا ہے ؟ آپ تو "مدعی نبوّت و مہدویت و مجددیت" کا ذکر کرتے ہیں، قرآن کے نزدیک عام مسلمان ہونے کے لئے جو معیار ہے ذرا اُسے سامنے لایئے اور پھر آئینے میں دیکھئے کہ اس میں ہمارے خط و خال کیا کہتے ہیں ؟ قرآن کا ارشاد ہے کہ

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝
(۵/۴۴)

اور جو کوئی خدا کی نازل کی ہوئی کتاب کے مطابق فیصلے نہ کرے تو ایسے ہی لوگ ہیں جو کافر ہیں (یعنی حق سے منکر ہو گئے ہیں)۔

اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ یَزۡعُمُوۡنَ اَنَّهُمۡ اٰمَنُوۡا بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡكَ وَ مَاۤ اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلِكَ یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یَّتَحَاكَمُوۡۤا اِلَی الطَّاغُوۡتِ وَ قَدۡ اُمِرُوۡۤا اَنۡ یَّكۡفُرُوۡا بِهٖ ؕ وَ یُرِیۡدُ الشَّیۡطٰنُ اَنۡ یُّضِلَّهُمۡ ضَلٰلًۢا بَعِیۡدًا ۝ (۴/۶۰)

(اے پیغمبر!) کیا تم نے ان لوگوں کی حالت پر غور نہیں کیا جن کا دعویٰ یہ ہے کہ جو کچھ تم پر نازل ہوا اور جو کچھ تم سے پہلے نازل ہو چکا ہے، وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں، لیکن (عمل کا حال یہ ہے کہ) چاہتے ہیں کہ اپنے معاملات کے فیصلے غیر خداوندی قوت سے کرائیں حالانکہ انہیں حکم دیا گیا تھا کہ اس سے انکار کریں۔ اصل یہ ہے کہ شیطان چاہتا ہے کہ انہیں اس طرح گمراہ کر دے کہ راہِ راست سے دور جا پڑیں۔

فرمایئے جو شخص یا قوم اس روشِ زندگی پر نہ صرف قانع ہی ہو بلکہ اس کے استحکام میں ساعی بھی ہو اس سے "کفر و اسلام" پر بحث کیسی؟ آپ "نبوت" کسے کہتے ہیں؟ قرآن کہتا ہے کہ زندگی کی اس روش پر قائم رہتے ہوئے اپنا اسلام تو ثابت کرو؟

دہن کا ذکر کیا یاں سر ہی غائب ہے گریباں سے

آپ شروع سے دیکھتے چلے آ رہے ہیں کہ قرآنِ کریم کی رُو سے اسلام محض چند عقائد و رسوم کا نام نہیں بلکہ یہ ایک نظامِ اطاعت و حکومت ہے جسے عملاً دنیا میں رائج و نافذ ہونا ہے۔ اس نظام میں اطاعت و محکومیت صرف خدا کی ہو سکتی ہے جس کا عملی ذریعہ یہ ہے کہ ایک مرکز کے تابع قرآنی احکام و قوانین کی اطاعت کی جائے۔ حضرات انبیائے کرامؑ دنیا میں یہی کرتے رہے۔ یہی ان کا مشن تھا۔ ختمِ نبوت کے بعد اس سلسلہ کو جاری رکھنا اسلام کے متبعین کا فریضہ تھا۔ آج بھی اگر کسی کے لئے کوئی کام صحیح معنی میں ایمان و عمل کا مظاہرہ کہلا سکتا ہے، تو یہی ہے۔

اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی است

یہی ایک کسوٹی ہے جس پر صحیح پرکھ ہو سکتی ہے۔ لیکن دوسروں سے کیا کہیے، یہ حقیقت خود ہمارے

ہاں کے اربابِ مذہب کی نگاہوں سے بھی اوجھل ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے مسلمان کی زندگی کیا ہے۔ ان کے نزدیک بھی "نجات" کا دارومدار آمین بالجہر و خفی، رفعِ یدین، فاتحہ خلف الامام، حیات و مماتِ مسیحؑ کے مسائل پر ہے۔ اس لئے دونوں فریق انہی نظری مسائل کی بحث میں غوش ہیں۔ جیسے وہ ویسے ہم ؎

ہوسِ منزلِ لیلیٰ نہ تو داری و نہ من	جگرِ گرمیٔ صحرا نہ تو داری و نہ من
دل و دیں در گردِ زہرہ وشانِ عجمی	آتشِ شوقِ سلیمیٰ نہ تو داری و نہ من
خزفے بود کہ از ساحلِ دریا چیدیم	دانۂ گوہرِ یکتا نہ تو داری و نہ من
بہ کہ با نورِ چراغِ تہِ داماں سازیم	طاقتِ جلوۂ سینا نہ تو داری و نہ من

عیسائیوں کا غلو

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، عیسائیوں نے ابتداءً فرطِ عقیدت سے حضرت عیسیٰؑ کی شان میں غُلُو اور مبالغہ سے کام لیا۔ یہی مبالغہ سینٹ پال کے وقت حقیقت کی شکل اختیار کرنے لگا۔ نیقیہ کی کونسل نے اسے عقائد کا رنگ دیا اور ٹرنٹ کی کونسل میں اس نے اس ایمان کی صورت اختیار کر لی کہ:

> ہم ایمان لاتے (۱) خدا، قدرت والے باپ پر جو ظاہر اور پوشیدہ چیزوں کا خالق ہے اور (۲) ربّ یسوع مسیح ابن اللہ پر جو باپ کا اکلوتا بیٹا ہے، جو باپ (خدا) کے ہاں جملہ کائنات سے پہلے پیدا ہوا۔ عین ذات ہے، الہٰ، الٰہ ہے اور نور، نور ہے، عین خدا ہے۔ مولود ہے مخلوق نہیں۔ باپ اور اس کا جوہر ایک ہے۔..... ہم انسانوں کی نجات کے واسطے اس کا نزول و حلول ہوا...... (مزید تفصیل "مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں" میں ملے گی)۔

جب حضرت مسیحؑ کو یہ مقام دیا گیا تو حضرت مریمؑ کا مقام خود تصور میں آسکتا ہے۔ چنانچہ آپ کے متعلق "مقدس کلیسا" کا یہ فیصلہ ہے کہ:

> وہ خدا کے نزدیک بڑی قوتوں کی مالکہ ہے۔ وہ جو کچھ مانگتی ہے اسے دیا جاتا ہے۔ وہ ہمارے لئے سرچشمۂ خیر ہے کیونکہ وہ ہمارے خدا سے مانگتی ہے۔ چونکہ وہ خدا کی ماں ہے اس لئے وہ اس کی درخواست کو مسترد نہیں کر سکتا اور چونکہ وہ ہماری بھی ماں ہے اس

لئے وہ ہماری سفارش سے انکار نہیں کرسکتی..... ہم اپنی نجات کے لئے جو دعائیں اس سے کرتے ہیں وہ مستجاب ہوتی ہیں۔
CATHOLIC SCHOOL BOOK P-158

حتیٰ کہ ستینگلر کے بیان کے مطابق آج بھی رومن کیتھولک کے ہاں رسومات اور دعاؤں میں (حضرت) مسیحؑ کا درجہ ان کی والدہ سے دوسرے درجہ پر آتا ہے۔" (جلد دوم صفحہ ۲۲۴)

۱۹۵۰ء میں پوپ (پائیس ۱۲×) نے اس عقیدہ کا اعلان کیا کہ (حضرت) مریمؑ بھی اپنی وفات کے بعد بہ جسدِ عنصری آسمان پر اٹھالی گئی تھیں۔ ۱۹۵۴ء میں 'پرستش کی رسومات میں' "ملکہ مریم" کے عنوان سے ایک جدید تقریب کا اضافہ کیا گیا۔ حضرت مسیحؑ کے ساتھ ان کی والدہ کو بھی معبود قرار دیا گیا اور ۱۹۶۴ء میں حضرت مریمؑ کو "مادرِ کلیسا" کے ممتاز ترین لقب سے نوازا گیا۔
(بحوالہ CRAVERI P-41, 42)

اُن کی موجودہ رَوِش

لیکن ان عقائد کے متعلق اب عیسائی محققین کی روش کیا ہے، اس کا اندازہ ایک مشہور مسیحی عالمِ دینیات ریورینڈ چارلس اینڈرسن اسکاٹ کے اس مضمون سے لگایئے جو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں شامل ہے۔ اس مقالہ میں وہ لکھتا ہے کہ

> پہلی تین انجیلوں (متی، مرقس، لوقا) میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس سے یہ گمان کیا جاسکتا ہو کہ انجیلوں کے لکھنے والے یسوع کو انسان کے سوا کچھ اور سمجھتے تھے۔ ان کی نگاہ میں وہ ایک انسان تھا، ایسا انسان جو خاص طور پر خدا کی رُو سے فیضیاب ہوا تھا اور خدا کے ساتھ ایک ایسا غیر منقطع تعلق رکھتا تھا جس کی وجہ سے اگر اس کو خدا کا بیٹا کہا جائے تو حق بجانب ہے۔ خود متی اس کا ذکر بڑھئی کے بیٹے کی حیثیت سے کرتا ہے اور ایک جگہ بیان کرتا ہے کہ "پطرس نے اس کو "مسیح" تسلیم کرنے کے بعد الگ ایک طرف لے جاکر اسے ملامت کی (متی باب ۱۶ آیت ۲۲)۔ لوقا میں ہم دیکھتے ہیں کہ واقعۂ صلیب کے بعد یسوع کے دو شاگرد اماؤس کی طرف جاتے ہوئے اس کا ذکر اس حیثیت سے کرتے ہیں کہ وہ "خدا اور ساری امت کے نزدیک کام اور کلام میں قدرت والا نبی تھا" (لوقا ۲۴/۱۹)۔ یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ اگرچہ "مرقس" کی تصنیف سے پہلے مسیحیوں میں یسوع کے لئے لفظ 'خداوند' (LORD) کا استعمال عام طور پر چل پڑا تھا، لیکن نہ مرقس کی

انجیل میں یسوع کو کہیں اس لفظ سے یاد کیا گیا ہے اور نہ متی کی انجیل میں۔ بخلاف اس کے دونوں کتابوں میں یہ لفظ اللہ کے لئے بکثرت استعمال کیا گیا ہے۔ یسوع کے ابتلا کا ذکر تینوں انجیلیں پورے زور کے ساتھ کرتی ہیں جیسا کہ اس واقعہ کی شایانِ شان ہے، مگر مرقس کی "فدیہ" والی عبارت (مرقس ۴۵/۱۰) اور آخری فسخ کے موقع پر چند الفاظ کو مستثنیٰ کر کے ان کتابوں میں کہیں اس واقعہ کو وہ معنی نہیں پہنائے گئے ہیں جو بعد میں پہنائے گئے حتیٰ کہ اس بات کی طرف کہیں اشارہ تک نہیں کیا گیا ہے کہ یسوع کی موت کا گناہ یا کفارہ سے کوئی تعلق تھا۔

آگے چل کر وہ پھر لکھتا ہے!

یہ بات کہ یسوع خود اپنے آپ کو ایک نبی کی حیثیت سے پیش کرتا تھا، متعدد عبارتوں سے ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً یہ کہ "مگر مجھے آج اور کل اور پرسوں اپنی راہ پر چلنا ضرور ہے کیونکہ ممکن نہیں کہ نبی یروشلم سے باہر ہلاک ہو" (لوقا ۳۳/۱۳)۔ وہ اکثر اپنا ذکر "ابنِ آدم" کے نام سے کرتا ہے........ یسوع کہیں اپنے آپ کو "ابن اللہ" نہیں کہتا اور اس کے دوسرے ہم عصر بھی جب اس کے متعلق یہ لفظ استعمال کرتے ہیں تو غالباً اس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ وہ اس کو "مسیح" سمجھتے ہیں۔ البتہ وہ اپنے آپ کو مطلقاً بیٹے کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے..... مزید برآں، وہ خدا کے ساتھ اپنے تعلق کو بیان کرنے کے لئے بھی "باپ" کا لفظ اسی اطلاقِ شان میں استعمال کرتا ہے..... اس تعلق کے بارے میں وہ اپنے آپ کو منفرد نہیں سمجھتا تھا بلکہ ابتدائی دور میں دوسرے انسانوں کو بھی خدا کے ساتھ اس خاص گہرے تعلق میں اپنا ساتھی سمجھتا تھا، البتہ بعد کے تجربے اور انسانی طبائع کے عمیق مطالعہ نے اسے یہ سمجھنے پر مجبور کر دیا کہ اس معاملہ میں وہ اکیلا ہے۔

پھر یہی مصنف لکھتا ہے:۔

عید پنتکست کے موقع پر پطرس کے یہ الفاظ کہ "ایک انسان جو خدا کی طرف سے تھا" یسوع کو اس حیثیت میں پیش کرتے ہیں جس میں اس کے ہم عصر اس کو جانتے اور سمجھتے تھے..... انجیلوں سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ یسوع بچپن سے جوانی تک بالکل فطری طور پر جسمانی و ذہنی

نشوونما کے مدارج سے گزرا۔ اس کو بھوک لگتی تھی۔ وہ تھکتا اور سوتا تھا۔ وہ حیرت میں مبتلا ہوسکتا تھا اور دریافتِ احوال کا محتاج تھا۔ اس نے دکھ اٹھایا اور مرا۔ اس نے یہی نہیں کہ سمیع و بصیر ہونے کا دعویٰ نہیں کیا بلکہ صریحاً اس سے انکار کیا ہے ..... درحقیقت اس کے حاضر و ناظر ہونے کا اگر دعویٰ کیا جائے تو یہ اس پورے تصور کے بالکل خلاف ہوگا جو ہمیں انجیلوں سے حاصل ہوتا ہے۔ بلکہ اس دعوے کے ساتھ آزمائش کے واقعہ کو اور کھوپڑی کے مقام پر جو واردات گذریں ان میں سے کسی کو بھی مطابقت نہیں دی جاسکتی، تاوقتیکہ ان واقعات کو بالکل غیر حقیقی قرار نہ دے دیا جائے۔ یہ ماننا پڑے گا کہ مسیح جب ان سارے حالات سے گذرا تو وہ انسانی علم کی عام محدودیت اپنے ساتھ لئے ہوئے تھا اور اس محدودیت میں اگر کوئی استثنا رکھتا تو صرف اسی حد تک جس حد تک پیغمبرانہ بصیرت اور خدا کے یقینی شہود کی بنا پر ہوسکتا ہے۔ پھر مسیح کو قادرِ مطلق سمجھنے کی گنجائش تو انجیلوں میں اور بھی کم ہے۔ کہیں اس بات کا اشارہ تک نہیں ملتا کہ وہ خدا سے بے نیاز ہو کر خود مختارانہ کام کرتا تھا۔ اس کے برعکس وہ بار بار دعا مانگنے کی عادت سے اور اس قسم کے الفاظ سے کہ "یہ چیز دعا کے سوا کسی اور ذریعہ سے نہیں ٹل سکتی"۔ اس بات کا صاف اقرار کرتا ہے کہ اس کی ذات قطعاً خدا پر منحصر ہے۔ فی الواقع یہ بات ان انجیلوں کی تاریخی حیثیت سے معتبر ہونے کی ایک اہم شہادت ہے کہ اگرچہ ان کی تصنیف و ترتیب اس زمانے سے پہلے مکمل نہ ہوئی تھی جبکہ مسیحی کلیسا نے مسیح کو الٰہ سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ پھر بھی ان دستاویزوں میں ایک طرف مسیح کے فی الحقیقت انسان ہونے کی شہادت محفوظ ہے اور دوسری طرف ان کے اندر کوئی شہادت اس امر کی موجود نہیں ہے کہ مسیح اپنے آپ کو خدا سمجھتا تھا۔

اس کے بعد یہ مصنف پھر لکھتا ہے۔

وہ سینٹ پال تھا جس نے اعلان کیا کہ واقعۂ رفع کے وقت اسی فعل رفع کے ذریعہ سے یسوع پورے اختیارات کے ساتھ "ابن اللہ" کے مرتبہ پر علانیہ فائز کیا گیا..... یہ "ابن اللہ" کا لفظ یقینی طور پر ذاتی ابنیت کی طرف ایک اشارہ اپنے اندر رکھتا ہے جسے پال نے دوسری جگہ یسوع کو "خدا کا بیٹا" کہہ کر صاف کر دیا ہے۔ اس امر کا فیصلہ اب نہیں کیا جاسکتا کہ آیا

وہ ابتدائی عیسائیوں کا ایک گروہ تھا یا پال تھا جس نے مسیح کے لیے لفظ "خداوند" کا خطاب اصل مذہبی معنی میں استعمال کیا۔ شاید یہ فعل مقدم الذکر گروہ ہی کا ہو۔ لیکن بلاشبہ وہ پال تھا جس نے اس خطاب کو پورے معنی میں بولنا شروع کیا۔ پھر اپنے مدعا کو اس طرح اور بھی زیادہ واضح کر دیا کہ "خداوند یسوع مسیح" کی طرف بہت سے وہ تصورات اور اصطلاحی الفاظ منتقل کر دیئے جو قدیم کتب مقدسہ میں خداوند یہوواہ (اللہ تعالیٰ) کے لئے مخصوص تھے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے مسیح کو خدا کی دانش اور خدا کی عظمت کے مساوی قرار دیا اور اسے مطلق معنی میں خدا کا بیٹا ٹھہرایا۔ تاہم متعدد حیثیات اور پہلوؤں سے مسیح کو خدا کے ابر کر دینے کے باوجود پال اس کو قطعی طور پر اللہ کہنے سے باز رہا۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے ایک دوسرے مضمون "مسیحیت" میں ریورنڈ جارج ولیم ناکس مسیحی کلیسا کے بنیادی عقیدے پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

عقیدۂ تثلیث کا فکری سانچہ یونانی ہے اور یہودی تعلیمات اس میں ڈھالی گئی ہیں۔ اس لحاظ سے یہ ہمارے لئے ایک عجیب قسم کا مرکب ہے۔ مذہبی خیالات بائبل کے اور ڈھلے ہوئے ایک اجنبی فلسفے کی صورتوں میں۔

باپ، بیٹا اور روح القدس کی اصطلاحیں یہودی ذرائع کی بہم پہنچائی ہوئی ہیں آخری اصطلاح اگرچہ خود یسوع نے شاذونادر ہی کبھی استعمال کی تھی اور پال نے بھی جو اس کو استعمال کیا اس کا مفہوم بالکل غیر واضح تھا۔ تاہم یہودی لٹریچر میں یہ لفظ شخصیت اختیار کرنے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ پس اس عقیدہ کا مواد یہودی ہے (اگرچہ اس مرکب میں شامل ہونے سے پہلے وہ بھی یونانی اثرات ۔۔۔ مغلوب ہو چکا تھا) اور مسئلہ خالص یونانی۔ اصل سوال جس پر یہ عقیدہ بنا دہ کوئی اخلاقی سوال تھا نہ مذہبی بلکہ وہ سراسر ایک فلسفیانہ سوال تھا، یعنی یہ کہ ان تینوں اقانیم (باپ، بیٹے اور روح) کے درمیان تعلق کی حقیقت کیا ہے؟ کلیسا نے اس کا جو جواب دیا وہ اس عقیدہ میں درج ہے جو نیقیہ کی کونسل میں مقرر کیا گیا تھا اور اسے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی تمام خصوصیات میں بالکل یونانی فکر کا نمونہ ہے۔

اسی سلسلہ میں انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے ایک دوسرے مضمون تاریخ کلیسا کی یہ عبارت بھی قابلِ ملاحظہ ہے۔

تیسری صدی عیسوی کے خاتمے سے پہلے مسیح کو عام طور پر "کلام" کا جدّی ظہور تو مان لیا گیا تھا تاہم بکثرت عیسائی ایسے تھے جو مسیح کی الوہیت کے قائل نہ تھے۔ چوتھی صدی میں اس مسئلہ پر سخت بحثیں چھڑی ہوئی تھیں جن سے کلیسا کی بنیادیں ہل گئی تھیں۔ آخرکار ۳۲۵ء میں نیقیہ کی کونسل نے الوہیتِ مسیح کو باضابطہ سرکاری طور پر اصل مسیحی عقیدہ قرار دیا اور مخصوص الفاظ میں اسے مرتب کر دیا۔ اگرچہ اس کے بعد بھی کچھ مدت تک جھگڑا چلتا رہا لیکن آخری فتح نیقیہ ہی کے فیصلے کی ہوئی جسے مشرق اور مغرب میں اس حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا کہ صحیح العقیدہ عیسائیوں کا ایمان اسی پر ہونا چاہیئے۔ بیٹے کی الوہیت کے ساتھ روح کی الوہیت بھی تسلیم کی گئی اور اسے اصطباغ کے کلمہ اور رائج الوقت شعائر میں باپ اور بیٹے کے ساتھ جگہ دی گئی۔ اس طرح نیقیہ میں مسیح کا جو تصور قائم کیا گیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عقیدۂ تثلیث اصل مسیحی مذہب کا ایک جزوِ لاینفک قرار پا گیا۔

پھر اس دعوے پر کہ "بیٹے کی الوہیت مسیح کی ذات میں مجسم ہوئی تھی" ایک دوسرا مسئلہ پیدا ہوا جس پر چوتھی صدی میں اور اس کے بعد بھی مدتوں تک بحث و مناظرہ کا سلسلہ جاری رہا۔

مسئلہ یہ تھا کہ مسیح کی شخصیت میں الوہیت اور انسانیت کے درمیان کیا تعلق ہے؟ ۴۵۱ء میں لیڈن کی کونسل نے اس کا یہ تصفیہ کیا کہ مسیح کی ذات میں دو مکمل طبیعتیں مجتمع ہیں، ایک الٰہی طبیعت دوسری انسانی طبیعت اور دونوں متحد ہو جانے کے بعد بھی اپنی جداگانہ خصوصیات بلا کسی تغیّر و تبدّل کے برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ تیسری کونسل میں جو ۶۸۰ء میں بمقام قسطنطنیہ منعقد ہوئی، اس میں اتنا اور اضافہ کیا گیا کہ یہ دونوں طبیعتیں اپنی الگ الگ حیثیتیں بھی رکھتی ہیں۔ یعنی مسیح بیک وقت دو مختلف حیثیتوں کا حامل ہے......

اسی دوران میں مغربی کلیسا نے گناہ اور فضل و کرم کے مسئلہ پر خاص توجہ کی اور یہ سوال مدتوں زیرِ بحث رہا کہ نجات کے معاملہ میں خدا کا کام کیا ہے اور بندے کا کام کیا۔ آخرکار

۵۲۹ء میں اورنیج کی دوسری کونسل میں...... یہ نظریہ اختیار کیا گیا تھا کہ ہبوطِ آدم کی وجہ سے ہر انسان اس حالت میں مبتلا ہے کہ وہ نجات کی طرف کوئی قدم نہیں بڑھا سکتا جب تک وہ اُس فضلِ خداوندی سے جو اصطباغ میں عطا کیا جاتا ہے نئی زندگی نہ حاصل کرلے اور یہ نئی زندگی شروع کرنے کے بعد بھی اسے حالتِ خیر میں استمرار نصیب نہیں ہوسکتا جب تک فضلِ خداوندی دائماً اس کا مددگار نہ رہے اور فضلِ خداوندی کی یہ دائمی اعانت اسے صرف کیتھولک کلیسا ہی کے توسط سے حاصل رہ سکتی ہے۔

اور انسائیکلوپیڈیا ببلیکا میں مذکور ہے۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ کنواری سے پیدا ہونے کا عقیدہ ہمیں کفارہ کے دائرہ میں لے جاتا ہے۔

کفارہ کا عقیدہ

جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں، ابنیت اور الوہیت وغیرہ کے عقائد درحقیقت بنیاد ہیں کفارہ کے عقیدہ کی اور کفارہ کی بنیاد یہ ہے کہ ہر بچہ آدم و حوا کے اوّلیں گناہ کی وجہ سے فطرتاً گناہگار پیدا ہوتا ہے اور اس کی فطرت کی یہ خباثتِ ازلی کسی عمل سے دُھل نہیں سکتی۔ اس کے لئے یہ ایمان ضروری ہے کہ خدا بشکلِ مسیح دنیا میں آیا اور اس نے انسانوں کی نجات کے لئے اپنے آپ کو صلیب پر لٹکوایا۔ یوں اس کی قربانی، نوعِ انسانی کے گناہوں کا کفارہ بن گئی۔ اس عقیدہ کی رُو سے ہر انسانی بچہ کی فطرت کو گناہگار تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ عیسائی اس عقیدہ کا ماخذ خود حضرت مسیحؑ کو قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجنز اینڈ ایتھکس کا مضمون نگار لکھتا ہے کہ

کئی بالواسطہ طریقوں سے (حضرت) مسیح بھی انسانی قلب کے فطری طور پر گناہگار ہونے کو تسلیم کرتے ہیں۔

بڑے بڑے نامور عیسائی مصنفین اس عقیدہ کی اہمیت اور صداقت کو اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتے ہیں۔ مسٹر T.S.ELIOT اپنی کتاب AFTER STRANGE GODS, میں لکھتا ہے۔

میرے نزدیک "فطری گناہ" کا عقیدہ ایک عظیم الشان حقیقت ہے۔

ایک بہت بڑا عیسائی مشنری DOOLITTLE چین گیا اور وہاں برسوں تک عیسائیت کی تعلیم کی تبلیغ کرتا رہا۔ لیکن ان سے فطرتِ انسانی کی ازلی خباثت کے عقیدہ کو منوا نہ سکا۔ چنانچہ وہ اہل چین کی اس "جہالت" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ

مجھے یہ دیکھ کر بہت دُکھ ہوا کہ یہ بدبخت مخلوق بائبل کے اس عقیدہ کی معقولیت اور صداقت کو تسلیم نہیں کرتی۔

THE SOCIAL LIFE OF CHINESE

پادری صاحب کو تعجب تھا کہ چین کے "جہلا" ایسی معقول تعلیم کی صداقت کو نہیں مانتے، لیکن انہیں کیا معلوم تھا کہ چار ہی روز بعد، خود ان کے اپنے ہاں کے اربابِ دانش و بینش بھی اسکی "معقولیت" سے انکار کر بیٹھیں گے۔ چنانچہ R.C. JOHNSTON اپنی کتاب CONFUCIANISM AND MODERN CHINA میں WESTMINSTER CONFESSION کے حوالہ سے لکھتا ہے۔

ازلی گناہ کا عقیدہ درحقیقت "ازلی خرابی" ہے جس کی وجہ سے ہم ہر قسم کے خیر سے بیزار اور ہر قسم کے شر کی طرف مائل رہتے ہیں۔

سر ہنری جونس (اپنی کتاب A FAITH THAT ENQUIRES میں اس عقیدہ کی تردید و تکذیب کے بعد "فطرتِ انسانی" کے نیک ہونے کے عقیدہ کا اعلان کرتا ہے۔ SIR JAMES JRVINE نے سینٹ اینڈریوز کے گرجے میں ایک بصیرت افروز تقریر کے دوران میں کہا کہ

جو چیز میرے دل میں سب سے زیادہ نمایاں حیثیت لئے ہوئے ہے، وہ یہ ہے کہ میرے تجربہ نے میرے اس احساس کو اور بھی زیادہ شدید کر دیا ہے کہ انسان اپنی فطرت کے لحاظ سے نیک ہے۔

TIMES, LONDON
20-1-1933

مشہور عالمِ نفسیات WILLIAN MCDOOGALL اپنی کتاب CHARTER AND THE CONDUCT OF LIFE میں لکھتا ہے۔

اب دورِ حاضر کے بچے کی عزتِ نفس کو شروع ہی سے اس عقیدہ سے ٹھیس نہیں لگائی جاتی کہ وہ فطرتاً بدواقع ہوا ہے بلکہ اب اس کی تربیت اس کُلیہ کے ماتحت عمل میں آتی ہے کہ وہ فطرتاً نیک ہے اور وہ ایک مہذب اور شستہ ماحول میں یقیناً نیکی، سچائی اور حُسن کا متلاشی ہوگا یہ یقیناً فوزِ عظیم ہے۔

مسٹر A.E. TAYLOR لکھتا ہے کہ "یہ عقیدہ ایک بطلان ہے" اور میں کسی ایسے سائنٹفک اور خدا کی طرف دعوت دینے والے مذہب کا استقبال کرونگا جو ہمیں فطرتِ انسانی پر ایسی مضحکہ انگیز تہمت پر ایمان رکھنے کی ضرورت سے بچالے۔

MIND JULY 1912

غور کیا آپ نے کہ دنیائے عیسائیت کے یہ اراکین و عمائد اپنے ان غیر فطری عقائد سے تنگ آکر فطرت کی صحیح تعلیم کے لئے کس طرح مضطرب اور بے قرار ہیں؟ مسٹر ٹیلر کسی ایسے مذہب کی تلاش میں دیوانہ وار پھر رہے ہیں جو خدا کی وحدانیت اور فطرتِ انسانی کے خیر ہونے کی تعلیم دے اور تعلیم بھی علیٰ وجہ البصیرت دے۔ اے کاش! کہیں مسٹر ٹیلر کے سامنے قرآن کریم ہوتا تو اسے اس حسرت و حرماں نصیبی سے یوں مضطرب و حیران نہ ہونا پڑتا۔ وہ قرآن جس کی تعلیم یہ ہے کہ انسان کو اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ میں پیدا کیا گیا ہے (۹۵/۴) اور اسے عزت و تکریم عطا کی گئی ہے (وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (۱۷/۷۰) اور جس نے برملا کہہ دیا کہ اس کی نجات و سعادت اور شقاوت و بدبختی کا فیصلہ یکسر اس کے اپنے اعمال پر ہے (لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (۵۳/۳۹)، اور "آدم" (یا کسی اور) کا گناہ کسی دوسرے پر اثر انداز نہیں ہوسکتا (اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۵۳/۳۸) اور ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا کہ ہماری دعوت علیٰ وجہ البصیرت دعوت ہے (اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۛ عَلٰى بَصِيْرَةٍ (۱۲/۱۰۸). یہ حقائق اگر مسٹر ٹیلر کے سامنے ہوتے تو اسے معلوم ہوجاتا کہ اُسے جس چشمہ زندگی کی تلاش ہے، وہ کہاں مل سکتا ہے؛ لیکن یہ حقائق ان لوگوں کے سامنے ہیں یا نہیں، غور طلب چیز تو یہ ہے کہ دنیا کس طرح کشاں کشاں، طوعاً و کرہاً (اپنے غلط معتقدات و تصورات کو چھوڑ کر) اسلام کی تعلیم کی طرف بڑھے چلی آرہی ہے۔ (تفصیل اس کی "ابلیس و آدم" میں "وحی" کے عنوان میں ملاحظہ فرمائیے) عیسائیت کا سارا مدار

اس عقیدہ پر ہے کہ انسان فطری طور پر گناہوں سے ملوّث ہے اور اب دنیا علیٰ وجہ البصیرت اس عقیدہ کا بطلان کر رہی ہے اور یہ سب قرآن کی تعلیم کی بنا پر ہے جو شعوری اور غیر شعوری طور پر ذہنوں کو متاثر کئے جا رہی ہے۔ جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ (۱۷/۸۱)۔

ایک اور آیت

واقعۂ تصلیب سے متعلق سورۂ نساء کی حسبِ ذیل آیات پر ایک مرتبہ پھر نگاہ ڈالیئے:۔

وَ قَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ وَ مَا قَتَلُوْهُ وَ مَا صَلَبُوْهُ وَ لٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ؕ وَ اِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ؕ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَ مَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ۙ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝ وَ اِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ۚ (۴/۱۵۷ — ۱۵۹)

ان آیات کا عام ترجمہ یوں کیا جاتا ہے۔

اور (نیز) ان کا یہ کہنا کہ ہم نے مریم کے بیٹے عیسیٰ کو جو خدا کے رسول ہونے کا دعویٰ کرتے تھے (سولی پر چڑھا کر) قتل کر ڈالا۔ حالانکہ (واقعہ یہ ہے کہ) نہ تو انہوں نے قتل کیا اور نہ سولی پر چڑھا کر ہلاک کیا، بلکہ حقیقت ان پر مشتبہ ہو گئی۔ اور جن لوگوں نے اس بارے میں اختلاف کیا تو بلاشبہ وہ اس کی نسبت شک و شبہ میں پڑے ہوئے ہیں۔ اس بارے میں ان کے پاس کوئی یقینی بات نہیں ہے، بجز اس کے کہ ظن و گمان کے پیچھے جائیں اور یقیناً انہوں نے عیسیٰ کو قتل نہیں کیا۔ بلکہ اللہ نے اسے اپنی طرف بلند کر لیا اور اللہ سب پر غالب رہنے والا اور (اپنے تمام کاموں میں) حکمت رکھنے والا ہے۔

اور (دیکھو) اہلِ کتاب میں سے کوئی نہ ہوگا جو اپنی موت سے پہلے اُس پر ضرور ہی یقین نہ لے آئے اور قیامت کے دن وہ (اللہ کے حضور) ان پر شہادت دینے والا ہوگا۔

ان میں سے آیات ۱۵۸ ا ۔ ۱۵۷ کی تشریح تو پہلے گذر چکی ہے۔ آیت ۱۵۹ غور طلب ہے۔ یہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ یہودی اور عیسائی دونوں اس بات پر متفق تھے کہ حضرت عیسیٰؑ کی موت صلیب پر واقع ہو چکی ہے۔ قرآنِ کریم نے اس کی تردید کی اور واضح الفاظ میں فرمادیا کہ یہ قطعاً غلط ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ "اہلِ کتاب میں سے کوئی نہیں ہوگا جو اپنی موت سے قبل اس (حقیقت) پر یقین نہ لے آئے"۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد نزولِ قرآن سے لے کر قیامت تک کے تمام اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) نہیں ہو سکتے اس لئے کہ یہ چیز خلافِ مشاہدہ ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ اس سے مراد وہ یہود و نصاریٰ ہیں جو نزولِ آیت کے وقت مخاطب تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان میں سے بیشتر وہ تھے جو بعد میں مسلمان ہو گئے اور وہ حضرت مسیحؑ کے متعلق اس صداقت پر ایمان لے آئے جو قرآنِ کریم نے بیان فرمائی ہے لیکن ایسے یہود و نصاریٰ بھی تو تھے جو مسلمان نہیں ہوئے اس لئے یہ قیاس بھی درست نہیں۔

بعض حضرات اس سے مفہوم یہ لیتے ہیں کہ جب حضرت عیسیٰؑ آسمان سے نازل ہوں گے تو اس وقت تمام اہلِ کتاب ان کی (حضرت مسیحؑ کی) موت سے پیشتر ان پر ایمان لے آئیں گے۔ لیکن یہ مفہوم (جیسا کہ تصریحاتِ سابقہ سے ظاہر ہے) دور از کار ہے۔ اس لئے کہ جب نزولِ حضرت عیسیٰؑ کا کوئی ذکر قرآن کریم میں نہیں تو یہ خیال اپنی طرف سے بڑھا کر دیگر آیات کا مفہوم اس کے مطابق متعین کرنا قرآن فہمی نہیں۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس آیت میں "اہل الکتاب" سے مراد صرف عیسائی ہیں۔ عیسائی اپنے مرنے سے پہلے، حضرت مسیحؑ کے کفارہ کا اقرار کرتے ہیں اور اسی سے ان کی نجات ہوتی ہے (بلکہ پادری آ کر ان سے اس امر کا اقرار لیتا ہے) کفارہ کے معنی یہ ہیں کہ حضرت مسیحؑ نے اپنے ماننے والوں کے گناہوں کا کفارہ، صلیب پر جان دے کر دیا۔ یعنی ہر عیسائی مرنے سے پہلے حضرت مسیحؑ کے صلیب پر جان دینے کا اقرار کرتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ واقعہ یہ ہے کہ خود عیسائیوں کو بھی بالتحقیق معلوم نہیں کہ صلیب کا واقعہ کیا تھا اور جسے صلیب پر چڑھایا گیا تھا وہ حضرت مسیحؑ ہی تھے یا کوئی اور۔ لیکن اس کے باوجود ان کی حالت یہ ہے کہ وہ اس بات پر کہ فی الواقع حضرت مسیحؑ ہی کو صلیب دی گئی تھی اس قدر محکم ایمان رکھتے ہیں کہ جب تک مرنے سے پہلے اس ایمان کو دُہرا نہ لیں، اپنی بخشش کا یقین نہیں کرتے۔ جب یہ اپنی بخشش کے لئے خدا کے سامنے جائیں گے تو اُس وقت حضرت مسیحؑ ان کے خلاف

شہادت دیں گے (کہ انہوں نے یہ عقیدہ کیسے وضع کرلیا تھا ؟)۔

دشمن سے محبت یا عدل؟

ایک چھوٹی سی بات اور بھی۔ انجیل کی تعلیم (منسوب الیٰ حضرت عیسیٰؑ) یہ ہے کہ " دشمن سے محبت کرو" (متی ۵/۴۴)

یہ تعلیم بڑی خوش آیند اور نگاہ فریب نظر آتی ہے۔ لیکن ذرا اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر سوچئے کہ انسان سے اس کا تقاضا کسی طرح بھی درست ہو سکتا ہے ؟ کیا یہ کسی دھڑکنے والے دل سے ممکن بھی ہے کہ وہ اپنے دشمن سے محبت کرے۔ محبت ایک لطیف جذبہ ہے جس کا سرچشمہ ہم آہنگی و یگانگت ہے۔ عداوت اور محبت ایسے متضاد و متبائن جذبات کا نام ہے جن میں کسی صورت میں بھی ہم آہنگی و یگانگت پیدا نہیں ہو سکتی۔ چونکہ یہ مطالبہ انسانی جذبات کے خلاف ہے اس لئے تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے کہ کسی نے دشمن سے محبت کی ہو۔ خود حضرت مسیحؑ کی تعلیم کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں کہ انہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں دنیا میں صلح کرانے نہیں بلکہ تلوار چلانے آیا ہوں۔ باپ کو بیٹے سے اور ماں کو بیٹی سے جدا کرانے[1]۔ ظاہر ہے کہ یہ قطع و برید بنا بر عداوت ہی ہو گی نہ کہ محبت کا نتیجہ (ذاتی عداوت و محبت نہیں بلکہ اصولی فرق کے مطابق)۔

اس کے برعکس دیکھئے قرآنِ کریم نے دشمن کے متعلق جو تعلیم پیش کی ہے وہ کس قدر شرفِ انسانیت پر مبنی اور ممکن العمل ہے۔ فرمایا:-

وَ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا (۵/۸)

اور (دیکھو) ایسا کبھی نہ ہو کہ کسی گروہ کی دشمنی تمہیں اس بات کے لئے ابھار دے کہ (اس کے ساتھ) عدل نہ کرو۔

غور کیجئے۔ دشمن سے عدل کرنا ناممکن نہیں، محبت کرنا ناممکن ہے۔ " دشمن سے بھی انصاف کرو" کس قدر بلند اصول ہے اور کیسا ممکن العمل ! اس باب میں مشہور عالمِ اجتماعیات WILLIAN A. BREND اپنی کتاب FOUNDATIONS OF HUMAN CONFLICTS میں لکھتا ہے کہ

" انجیل کا یہ حکم کہ دشمن سے بھی محبت کرو، ایک ایسا مطالبہ ہے جو نفسیاتی ناممکنات میں سے ہے" (صـ۳۷)۔

---

[1] (متی ۳۵ - ۱۰/۳۴)۔

حضرت عیسیٰؑ کا تذکارِ جلیلہ اور اُس کے تضمنات ختم ہو گئے۔ یہاں ہم نے دیکھ لیا کہ یہودیوں کے بعد عیسائیوں کو اُن کا جانشین بنایا گیا۔ لیکن اُنہوں نے بہت جلد توحید کو چھوڑ کر مشرکانہ عقائد

یوم الحسرت

اپنے ہاں داخل کر لئے کہ یہ کسی طرح بھی انعاماتِ الٰہیہ کی وراثت کے مستحق نہ رہے۔ اس لئے خدا کے غیر متبدّل قانون کی رُو سے یہ انعامات اُن سے چھین کر اس جماعت کے حوالے کر دیئے گئے جنہیں اللہ نے وراثتِ کتاب کے لئے منتخب کیا تھا۔ یہ انقلاب کس طرح رونما ہوا، اس کی تفصیل "معراجِ انسانیت" میں ملے گی۔ یہاں صرف ایک اشارہ پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ سورۃ مریم میں ہے۔

مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ○ فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَيْنِهِمْ ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ مَّشْهَدِ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ○ اَسْمِعْ بِهِمْ وَ اَبْصِرْ ۙ يَوْمَ يَاْتُوْنَنَا لٰكِنِ الظّٰلِمُوْنَ الْيَوْمَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ○ (۱۹/۳۸ — ۳۵)

یہ بات خدا کے شایانِ شان ہی نہیں کہ وہ کسی کو اپنا بیٹا بنائے (تاکہ وہ کاروبارِ خداوندی میں اس کا ہاتھ بٹائے)۔ وہ اس سے بہت بلند ہے۔ اس کی قوتوں کا تو یہ عالم ہے کہ جب وہ کسی کام کے کرنے کا فیصلہ کر لیتا ہے، تو وہ حکم کرتا ہے کہ ہو جا، اور وہ ہو جاتا ہے (اُسے اپنے ارادے اور احکام کو بروئے کار لانے کے لئے کسی مددگار کی ضرورت نہیں پڑتی)۔

(باقی رہا ان کا یہ عقیدہ کہ مسیحؑ خود خدا تھا، تو اس کی تردید کے لئے اس سے بڑھ کر اور کونسی دلیل ہو سکتی ہے کہ خود مسیحؑ کی دعوت یہ تھی کہ) میرا اور تمہارا، سب کا نشوونما دینے والا، اللہ ہے۔ سو تم سب اس کی محکومیت اختیار کرو۔ یہ ہے زندگی کی صحیح، سیدھی اور متوازن راہ (۳/۵۰)۔

اُس کی تعلیم تو یہ تھی، لیکن اس کے بعد (اس کے متبعین میں سے) مختلف فرقے، آپس میں اختلاف کرنے لگے۔ سو جن لوگوں نے اصل حقیقت سے انکار کیا ہے اُن پر

بیحد افسوس ہے۔ اُن کی اُس دن کیا حالت ہوگی جب حقیقتِ حال مشہود ہوکر سامنے آجائے گی؛ وہ وقت ان کے لئے بڑا ہی سخت ہوگا۔

(آج تو یہ لوگ، خدا کے ایک رسول کو خود خدا یا اس کا بیٹا بناکر) اس قدر ظلم کررہے ہیں اور حقیقت سے آنکھیں بند کئے، غلط راستے پر چلے جارہے ہیں لیکن اعمال کے ظہورِ نتائج کے دن یہ ایسا نہیں کرسکیں گے۔ اُس وقت اِن کے کان کیسے سننے والے اوران کی آنکھیں کیسی دیکھنے والی بن جائیں گی! (۵۰/۲۲)۔

اس کے بعد ارشاد ہے۔

وَ اَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ اِذْ قُضِيَ الْاَمْرُ وَ هُمْ فِيْ غَفْلَةٍ وَّ هُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ○ (۱۹/۳۹)

اور (اے پیغمبر!) انہیں اُس (آنے والے) دن سے خبردار کردے جو بڑا ہی پچھتانے کا دن ہوگا اور جب ساری باتوں کا فیصلہ ہوجائے گا۔ اِس وقت تو یہ لوگ غفلت میں پڑے ہیں اور اس بات پر یقین لانے والے نہیں۔

یہ "یوم الحسرت" کونسا تھا؛ وہ دن جب بیت المقدس کی کنجیاں عیسائی احبار و رہبان کے ہاتھوں سے اوران کا تخت و تاج قیصر (ہرقل) کے قبضہ سے نکل کر عربوں کی اونٹ چرانے والی صحرانشین قوم کے سپرد کیا گیا کہ وراثتِ ارض کا فیصلہ اللہ کے قانونِ مشیّت کے تابع ہوتا ہے۔

اِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْاَرْضَ وَ مَنْ عَلَيْهَا وَ اِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ ○ (۱۹/۴۰)

ہم ہی زمین کے وارث ہیں اور اُن تمام لوگوں کے بھی جو زمین پر بسے ہوئے ہیں اور تمام اعمال اپنے نتائج کے لئے ہمارے ہی قانونِ مکافات کی طرف لوٹتے ہیں۔

ہم "ابلیس و آدم" باب "رسالت" میں دیکھ چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر رسول کو کتاب

عطا فرمائی، اس لئے کہ پیغام کے بغیر پیغامبر (رسول) کا مقصد ہی کچھ نہیں. لیکن جس طرح اللہ تعالیٰ نے ہر رسول کا تذکرہ نہیں کیا اسی طرح قرآنِ کریم میں ہر کتاب کا نام بھی درج نہیں کیا. اس سے قبل زبور اور تورات کا ذکر آچکا ہے. حضرت عیسیٰؑ پر جو کتاب نازل کی گئی تھی اس کا نام انجیل ہے.

ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَ قَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَ اٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ ۙ (۵۷/۲۷).

پھر دیکھو (ان نبیوں کے بعد) ہم نے انہی کے نقشِ قدم پر اپنے رسولوں کو (یکے بعد دیگرے) بھیجا اور اُن کے بعد (پھر) مریم کے بیٹے عیسیٰ (جیسے جلیل القدر پیغمبر) کو بھیجا اور اسے انجیل عطا فرمائی.

وہ انجیل جس میں نور و ہدایت تھی (۵/۴۶).

آپ غور کیجئے کہ کیا دنیا میں کوئی اور مذہب بھی ہے جو "دوسرے" مذاہب کی کتبِ مقدسہ کا ذکر اس توصیف و ستائش سے کرے؟ یہ کتاب (انجیل) خود اللہ تعالیٰ نے سکھائی تھی.

وَ يُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ ۚ (۳/۴۸)

اور (اے مریم!) اللہ اس (جننے والے لڑکے) کو قانون اور حکمت کا علم عطا فرمائے گا یعنی توریت و انجیل کا.

اسی کا اعلان حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا تھا (۵/۱۱۰).

یہود و نصاریٰ کا دعویٰ تھا کہ حضرت ابراہیمؑ یہودی تھے یا نصرانی تھے. قرآنِ کریم نے کہا کہ تورات و انجیل تو حضرت ابراہیمؑ کے بعد نازل ہوئی ہیں. پھر آپ (حضرت ابراہیمؑ) ان کے متبع کیسے ہو سکتے ہیں؟

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِىْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَ مَآ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَ الْاِنْجِيْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ (۳/۶۵).

اے اہلِ کتاب! تم ابراہیم کے بارے میں کیوں حجت کرتے ہو (کہ ان کا طریقہ نہ یہودیت کا تھا نہ نصرانیت کا) اس لئے کہ تورات و انجیل (جن کے نام پر یہ گروہ بندیاں کی گئی ہیں) اس کے بہت بعد نازل ہوئی ہیں. (پس ظاہر ہے کہ جس گروہ بندی کا اُس وقت وجود ہی

نہ تھا، وہ کیونکر اس کا پیرو ہو سکتا ہے؟) کیا تم (اتنی موٹی سی بات بھی) نہیں سمجھ سکتے؟
اصلی تورات و انجیل میں جہاد و سرفروشی کی وہی تعلیم تھی جو قرآن کریم میں ہے۔

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۚ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ ۖ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنجِيلِ وَالْقُرْآنِ ۚ وَمَنْ أَوْفَىٰ بِعَهْدِهِ مِنَ اللَّهِ ۚ فَاسْتَبْشِرُوا بِبَيْعِكُمُ الَّذِي بَايَعْتُم بِهِ ۚ وَذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۝ (۹/۱۱۱)

بلاشبہ اللہ نے مومنوں سے اُن کی جانیں بھی خرید لیں اور اُن کا مال بھی، اور اس قیمت پر خرید لیں کہ ان کے لئے بہشت کی (جاودانی) زندگی ہو۔ وہ (کسی دنیوی مقصد کی راہ میں نہیں بلکہ) اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں۔ پس مارتے بھی ہیں اور مرتے بھی ہیں۔ یہ وعدہ اللہ کے ذمہ ہو چکا (یعنی اس نے ایسا ہی قانون ٹھہرا دیا) تورات، انجیل، قرآن (تینوں کتابوں) میں (یکساں طور پر) اس کا اعلان ہے۔ اور اللہ سے بڑھ کر کون ہے جو اپنا عہد پورا کرنے والا ہو؟ (پس مسلمانو!) اپنے اس سودے پر جو تم نے اللہ سے چکایا، خوشیاں مناؤ اور یہی ہے جو بڑی سے بڑی فیروزمندی ہے!

حتیٰ کہ اُن میں نبی اکرمؐ کے مقدس رفقاء کا تذکرہ بھی تھا کہ وہ کس طرح دیگر انبیائے کرامؑ کے ساتھیوں کی طرح خدا کی بادشاہت کو زمین پر قائم کریں گے (دیکھئے ۴۸/۲۹)۔

محرف انجیل لیکن یہ سب کچھ اس انجیل میں تھا جو اللہ کی طرف سے نازل ہوئی تھی نہ کہ اس میں جسے انسانی ہاتھوں نے بُری طرح سے محرّف کر ڈالا۔ حتیٰ کہ آج جن کتابوں کو اناجیل کے نام سے پیش کیا جاتا ہے خود عیسائی محققین کو اعتراف ہے کہ اُن کی اصلیت کا کچھ علم نہیں (انجیل کی تاریخ اور عیسائیوں کے اعترافات کی تفصیل ہماری کتاب "مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں" میں ملے گی)۔ بہرحال نزولِ قرآن کے وقت عیسائیوں کی یہ حالت تھی کہ وہ حقیقی انجیل کو بالکل چھوڑ چکے تھے (کہ اس کے وجود کا کہیں بھی پتا نہ تھا)۔ انجیل کی تعلیم قرآن میں آچکی تھی لیکن وہ اس کا، ضد اور تعصب کی بناء پر انکار کرتے تھے۔ نتیجہ یہ کہ وہ اللہ کے انعام و اکرام سے یکسر

محروم ہو گئے۔ سورۂ مائدہ میں ہے۔

وَ لَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ وَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ؕ مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ؕ وَ كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ (۵/۶۶)

اور اگر وہ تورات اور انجیل کو اور جو کچھ اُن کے پروردگار کی طرف سے اب اُن پر نازل ہو رہا ہے' (راست بازی کے ساتھ) قائم رکھتے' تو ضرور ایسا ہوتا کہ اُن کے اوپر سے بھی اور اُن کے قدموں کے نیچے سے بھی انہیں برکت ملتی (لیکن انہوں نے تورات و انجیل کی تعلیم ضائع کر دی)۔ ان میں سے ایک گروہ ضرور میانہ رَو ہے' لیکن زیادہ تر ایسے ہی ہیں کہ جو کچھ کرتے ہیں' برائی ہی برائی ہے۔

نزولِ قرآن کے وقت نصاریٰ کی کیا حالت تھی' اس کا تذکرہ اپنے مقام پر آئے گا۔

خلاصۂ مبحث

انبیائے بنی اسرائیل میں حضرت عیسیٰؑ نمایاں خصوصیت کے حامل ہیں۔ آپ کی حیاتِ طیبہ باعتبارِ زمانہ ایسی مختصر کہ گویا ایک شعلۂ مستعجل۔ خود اناجیل سے بھی (جو درحقیقت اپنی موجودہ شکل میں آپ کی سیرت کی کتابیں ہیں)، آپ کی زندگی کے آخری ڈیڑھ دو سال سے زیادہ کے حالات نہیں ملتے۔ لیکن باعتبارِ اثر و نتائج، ایک طرف ایسی ہدف رس کہ بنی اسرائیل جیسی قوم کی ہلاکت و بربادی کے خلاف خدا کی آخری حجّت اور دوسری طرف ایسی ہمہ گیر کہ تھوڑے سے عرصہ میں نوعِ انسانی کے ایک کثیر حصہ کے قلوب و اذہان پر چھا جانے والی۔ پھر اس ڈیڑھ دو سال کے کوائفِ حیات بھی معتقدین اور مخالفین کے افراط و تفریط کے گہوارہ میں اس طرح جنباں کہ اگر قرآنِ کریم کا مرکزِ ثقل سامنے نہ آتا تو چشمِ تحقیق آپ کے صحیح مقام سے کبھی آشنا نہ ہو سکتی۔ قومِ بنی اسرائیل اپنے عروج و اقبال کی انتہائی بلندیوں سے زوال و انحطاط کی آخری پستیوں میں گر چکی تھی۔ دنیاوی اعتبار سے رومیوں کے شکنجۂ استبداد میں جکڑی ہوئی اور دینی اعتبار سے خدا کی جگہ انسانوں (یعنی احبار و رہبان) کے خود ساختہ قوانین کی غیر فطری زنجیروں میں گرفتار۔ ایسے میں حضرت عیسیٰؑ ایک انقلاب آفریں پیغام لے کر آئے تاکہ اس شوریدہ بخت قوم کو جسمانی اور "روحانی" ہر طرح کی غلامی سے نجات دلا کر ایک خدا کی چوکھٹ پر جھکنے کے آئین سکھائیں جس سے اُن کی ذلتیں، عظمتوں میں اور پستیاں سرفرازیوں میں بدل جائیں۔ لیکن معلوم ہوا کہ مرض لاعلاج ہو چکا تھا اور مریض اس مقام پر پہنچ چکا تھا جہاں دوائی سے چڑ اور طبیبِ مشفق سے عداوت پیدا ہو جایا کرتی ہے۔ اس بدقسمت قوم کے علماء و مشائخ نے محض اپنی سیادت و قیادت قائم رکھنے کے لئے نہ صرف آپؑ کے پیغامِ حیات بخش کی مخالفت کی بلکہ آپ کے خلاف سازش کر کے آپ کی جان کے دشمن ہو گئے۔ وہ ان مشئوم تدابیر میں مصروف تھے اور آسمان ان کے انجام و عواقب پر ہنس رہا تھا۔ حضرت عیسیٰؑ ان کی دست بُرد سے محفوظ رکھے گئے۔ باقی رہی آپ کے حواریوں کی جماعت، سو اس کی تسکین کا سامان آپ نے یہ مژدہ سُنا کر بہم پہنچا دیا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ آپ کے بعد وہ نبیِ آخر الزّماںؐ آئے گا جو آپ (بلکہ تمام انبیائے سابقہ علیہم السلام) کے پیغام کی تکمیل کر دے گا۔ یہودی خوش تھے کہ انہیں بہت بڑی "کامیابی" حاصل ہوئی ہے۔ لیکن

زمانہ کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں کہ اُن کی یہ خوشی درحقیقت چراغ کا وہ خندۂ سحری تھا جس کے بعد وہ ہمیشہ کے لئے گُل ہو جاتا ہے۔ شجرِ ابراہیمیؑ کی یہ شاخِ فلسطینی جس نے ترو تازگی کی ہر صلاحیت اپنے اندر سے کھودی تھی، یوں خشک ہو کر رہ گئی کیونکہ خود حضرت ابراہیمؑ سے " لَا یَنَالُ عَھْدِی الظّٰلِمِیْنَ (۱۲۴) " فرما دیا گیا تھا۔ اور اس کے بعد برگ و بار اُس شاخِ حجازی کے حصہ میں آیا جس میں شادابی و شگفتگی کے عنوانات کھل کھلا کر ہنس رہے تھے کہ

قسمتِ بادہ باندازۂ جام است ایں جا

شاخِ اسمٰعیلی کی ان شادابیوں کا تذکرہ " معراجِ انسانیت " میں ملے گا۔

وَاِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗٓا اِلَى الْكَهْفِ (۱۸/۱۶)

با نشۂ درویشی در ساز و دمادم زن
چو پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن

اَصحابُ کہف

سابقہ عنوان میں بتایا جاچکا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے بعد ان کے متبعین پر سخت آزمائش و ابتلا کا دَور آیا. معاندانہ قوتیں چاروں طرف سے سیلابِ بلا کی طرح ہجوم کرکے اُمنڈ آئیں. یہ دنیا کی نگاہوں سے چھپے چھپے اپنی زندگی بسر کرتے تھے. حکومت کی سختیاں، یہودیوں کی دسیسہ کاریاں، کہیں پناہ کی جگہ نہ ملتی تھی. اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ بستیوں سے دُور جنگل اور ویرانوں میں کہیں چھپ چھپا کر زندگی کے دن بسر کریں. اس خلوت گزینی اور گوشہ نشینی نے رفتہ رفتہ منظم رہبانیت کی شکل اختیار کرلی. خانقاہیت کے خطوط و آثار عیسائیت سے پہلے بھی موجود تھے. ہوسکتا ہے کہ ان عیسائیوں میں بعض ایسے بھی ہوں جن کے رگ و پئے میں خانقاہیت کے جراثیم پہلے سے موجود ہوں. درمیان میں یہ جراثیم دب گئے اور اب جو فضا سازگار ملی تو انہوں نے پھر سے انگڑائیاں لینی شروع کردیں. اس تصورِ زندگی نے آہستہ آہستہ ایک ایسی متعین صورت اختیار کرلی کہ اس کے قواعد و ضوابط مرتب ہونے لگے اور خانقاہیت

خانقاہیت

ایک خاص شعارِ زندگی اور مسلکِ حیات قرار پا گئی. قرآنِ کریم نے جہاں یہود و نصاریٰ کے اور غلط معتقدات و رسومات کی تردید کی ہے وہاں اس حقیقت کو بھی بے نقاب کردیا ہے کہ رہبانیت کی یہ زندگی حضرت مسیحؑ (یا کسی اور رسول) کی تعلیم نہ تھی جو منجانب اللہ لوگوں تک پہنچائی گئی ہو، بلکہ یہ ان لوگوں کا خود ساختہ مسلک تھا.

ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَ قَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَ اٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ ۙ وَ جَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّ رَحْمَةً ؕ وَ رَهْبَانِيَّةَ ۨ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ۚ فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ ۚ وَ كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ○ (۵۷/۲۷)

پھر (اُن کے بعد) ہم نے اُن ہی کے نقشِ قدم پر اپنے (دوسرے) رسولوں کو بھیجا اور انہی کے بعد ہم نے مریم کے بیٹے عیسیٰ (جیسے جلیل القدر پیغمبر) کو بھیجا اور ہم نے اسے انجیل عطا فرمائی اور ان لوگوں کے دلوں میں جنہوں نے (صحیح معنی میں) انجیل کی پیروی کی، رحمدلی اور محبت پیدا کردی۔ باقی رہی رہبانیت، سواے ان لوگوں نے (ازخود) گھڑ لیا ہے۔ ہم نے ان پر فرض نہیں کی تھی۔ ہم نے تو محض اپنے قوانین سے ہم آہنگی فرض قرار دی تھی (مگر ان لوگوں نے ازخود نئی نئی پابندیاں اپنے اوپر عائد کرلیں چنانچہ کرنے کو تو یہ مسلک اختیار کرلیا لیکن یہ لوگ اسے کماحقہٗ نبھا نہ سکے۔ یہ نبھنے والا مسلک ہی نہیں) چنانچہ ہم نے ان لوگوں کو جو اُن میں سے (صحیح طور پر) ایمان لائے تھے ان کا اجر عطا کردیا اور (ایسے لوگ بہت ہی کم ہیں، ورنہ) ان میں سے بہت سے فسق و فجور کی زندگی بسر کرنے والے ہیں۔

جیسا کہ اوپر لکھا جاچکا ہے، شروع شروع میں یہ زاویہ نشینی اور خلوت گزینی مستبد قوتوں کے جور و ستم سے بچنے کے لئے اختیار کی گئی تھی، اس لئے ان غاروں اور تہ خانوں میں بڑے بڑے عمدہ گہر تابدار چمکتے نظر آتے تھے۔ لیکن جب اس نے ایک منظم رسم کی سی صورت اختیار کرلی تو یہی خانقاہیں ان تمام انسانیت سوز معائب و جرائم کے مرکز بن گئیں جن کے تصور سے حیا کی رُوح کانپ اُٹھے۔ قرآن کریم نے اس ابتدائی دَور کی خلوت گزینی کا ایک واقعہ اپنے درخشندہ اوراق میں محفوظ کرلیا ہے جس سے بتانا یہ مقصود ہے کہ مستبد طاغوتی قوتیں اللہ کا نام لینے والوں پر کس طرح گوشۂ عافیت تنگ کردیتی ہیں، لیکن بالآخر فلاح و فوز انہی کے ساتھ ہوتی ہے جو حق و استقامت پر جمے رہتے ہیں۔ یہ واقعہ اصحابِ کہف یا اصحابِ رقیم کے نام سے

قصۂ اصحابِ کہف

متعارف ہے اور سورۂ کہف میں مذکور۔ سرگزشتہ داستان ان آیات سے سامنے آتا ہے۔

اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَ الرَّقِيْمِ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا ○ اِذْ اَوَى الْفِتْيَةُ اِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوْا رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّ هَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا ○ فَضَرَبْنَا عَلٰٓى اٰذَانِهِمْ فِى الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا ○ (۹ — ۱۱/۱۸)

اے مخاطب! کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ وہ لوگ جنہیں "اَصْحٰبُ الْكَهْفِ وَ الرَّقِيْمِ" کہہ کر پکارا جاتا ہے — یعنی اس غار والے لوگ جو بطرا (پیٹرا) میں واقع تھی — کوئی خارقِ عادت مخلوق یا اچنبے کی چیز تھے؟ (ایسا نہیں تھا۔ بات کچھ اور تھی، جسے بعد میں لوگوں نے چیستان بنا دیا اور اُس نے اسی طرح شہرت پکڑ لی)۔

ہوا یہ تھا کہ کچھ نوجوان تھے (جو دین کے اصولوں پر معاشرہ میں انقلاب پیدا کرنا چاہتے تھے (۱۸/۱۴)۔ ان کی سخت مخالفت ہوئی اور حالت یہاں تک پہنچ گئی کہ وہ ملک چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ چنانچہ) انہوں نے (پہاڑوں کے اندر) ایک بہت بڑے غار میں جا کر پناہ لی، تاکہ وہاں اپنے مقصد کے حصول کے لئے تیاری کریں۔ اس کے لئے انہوں نے ہم سے التجا کی کہ اے ہمارے پروردگار! تو ایسا انتظام کر دے کہ ہمیں تیری طرف سے سامانِ زندگی بھی بہم پہنچتا رہے اور ہم نے جس بات کا ارادہ کیا ہے اسے کامیاب بنانے کے اسباب و ذرائع بھی میسر آجائیں۔

چنانچہ وہ اس غار میں کئی برس تک اس طرح رہے کہ وہ باہر کی دنیا سے منقطع تھے۔

غور سے دیکھئے تو سارے قصہ کا ملخص ان ہی تین آیات کے اندر جھلمل جھلمل کر رہا ہے۔ اس کے آگے اسی اجمال کی تفصیل ہے۔ ہم قصۂ اصحاب الحجر (جوئے نور) میں دیکھ چکے ہیں کہ حجر نبطی حکومت کا دارالسلطنت تھا، لیکن اس سے پیشتر ان کا دارالحکومت ایک اور شہر تھا جسے رقیم کہا جاتا تھا۔ جب رومیوں نے شام اور فلسطین کا علاقہ فتح کیا ہے تو اس شہر کو شہرت حاصل ہوئی لیکن رقیم کے

رقیم

نام سے نہیں بلکہ پیٹرا کے نام سے جسے عربوں نے اپنے ہاں بطرا کہہ کر پکارا۔ دورِ حاضرہ کی اثری تحقیقات نے اس شہر کے کھنڈرات کا سُراغ لگا لیا ہے

جہاں سے پرانے غاروں کے اندر خانقاہوں کے آثار ملے ہیں۔ یہ شہر اس شاہراہ پر واقع تھا جو حجاز سے شام کی طرف جاتی تھی۔ اس لئے نزولِ قرآن کے وقت عرب، اصحابِ کہف (غار والوں) یا اصحاب الرقیم (یطرا والوں) کے قصہ سے آشنا تھے۔ لیکن انہی تفاصیل کے ساتھ جو لوگوں میں عام طور پر پھیل چکی تھیں، قرآن کریم نے انہیں " اَصۡحٰبُ الۡکَہۡفِ وَ الرَّقِیۡمِ " کے نام سے پکار کر ان دونوں ناموں کی طرف اشارہ کر دیا جن سے یہ لوگ متعارف تھے۔

اس واقعہ کی ابتداء یوں ہوتی ہے کہ چند نوجوان تھے جن کے دل میں حق پرستی کا جذبہ موجزن تھا اور وہ معاشرہ میں صحیح آسمانی انقلاب لانا چاہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کی یہ کوشش مفاد پرست اربابِ اقتدار کی سخت مخالفت کا موجب بنی ہوگی۔ چنانچہ وہ ان کے دستِ تظلم و استبداد سے محفوظ رہنے کی خاطر بستی سے دُور کسی غار میں جا چھپے اور وہاں اپنے پروگرام کی تیاریوں میں مصروف رہے۔ اس دوران میں وہ باہر کی دنیا سے الگ تھلگ رہے۔ اس کے بعد جب باہر کی دنیا کے حالات مساعد ہوتے تو وہ پھر بستی کی طرف آئے اور انہوں نے آکر دیکھا کہ زمانہ نے باطل پرستی کا زیادہ عرصہ تک ساتھ نہیں دیا اور وہی حق پرستی جو بستیوں اور آبادیوں سے دھکیل کر نکال دی گئی تھی، ان آبادیوں اور بستیوں پر غالب آچکی تھی۔

ان " غار والوں " کے متعلق عوام میں طرح طرح کے قصے مشہور تھے (اور ظاہر ہے کہ مسلکِ خانقاہیت کے اربابِ حل و عقد اور بھی انہیں بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہوں گے)۔ قرآن نے رسول اللہؐ سے کہا کہ ہم تمہیں ان کی بابت ٹھیک ٹھیک بات بتاتے ہیں۔

نَحۡنُ نَقُصُّ عَلَیۡکَ نَبَاَہُمۡ بِالۡحَقِّ ؕ اِنَّہُمۡ فِتۡیَۃٌ اٰمَنُوۡا بِرَبِّہِمۡ وَ زِدۡنٰہُمۡ ہُدًی ﴿ۖ﴾ وَّ رَبَطۡنَا عَلٰی قُلُوۡبِہِمۡ اِذۡ قَامُوۡا فَقَالُوۡا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ لَنۡ نَّدۡعُوَا مِنۡ دُوۡنِہٖۤ اِلٰـہًا لَّقَدۡ قُلۡنَاۤ اِذًا شَطَطًا ﴿۱۴﴾ (۱۸/۱۴—۱۳)

(آگے بڑھنے سے پیشتر، اس حقیقت کو ایک بار پھر سمجھ لینا چاہیئے کہ ان کے متعلق عوام میں طرح طرح کی باتیں مشہور ہو چکی ہیں لیکن) ہم تمہیں، ان کی بابت ٹھیک ٹھیک بات بتاتے ہیں۔ یہ چند نوجوان تھے جو اپنے نشو ونما دینے والے کی طرف سے متعین کردہ نظام کو اپنی

زندگی کا نصب العین بنا چکے تھے اور اس کے قیام کی راہیں اُن پر بہت دُور تک کُھل چکی تھیں۔
چنانچہ جب وہ اس انقلابی مقصد کو لے کر اٹھے ہیں تو ہم نے ان کے دلوں کو مضبوط کر دیا
اور انہوں نے اعلان کر دیا کہ ان کے معاشرہ میں اس خدا کا نظام قائم ہو گا جس کا نظام کائنات
کی پستیوں اور بلندیوں میں ہر جگہ مسلط ہے۔ ہم اس کے سوا کسی اور کا اقتدار اور قانون ماننے
کے لئے تیار نہیں۔ اگر ہم ایسا کریں گے تو یہ بات ہمیں حق کی راہ سے بہت دُور لے جائے گی۔

ان کے برعکس ان کی قوم کی حالت یہ تھی کہ

هٰٓؤُلَآءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً ؕ لَوْلَا یَاْتُوْنَ عَلَیْهِمْ بِسُلْطٰنٍۭ بَیِّنٍ ؕ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا ؕ (۱۸/۱۵)۔

(اس وقت ہماری) قوم کے لوگوں کی حالت یہ ہے کہ انہوں نے خدا کے علاوہ اور بہت سی
قوتوں کا اقتدار تسلیم کر رکھا ہے (اور کہتے ہیں کہ انہوں نے یہ کچھ خود خدا کے حکم کے
مطابق کیا ہے)۔ حالانکہ ان کے پاس ان قوتوں کے اقتدار اور اختیار کی کوئی سند (اتھارٹی)
نہیں۔ یہ خدا پر یکسر کذب اور افترا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ حدود فراموش اور
کون ہو سکتا ہے جو خدا پر اس طرح افترا باندھے۔

خلوت گزینی

ان کا یہ اعلان کرنا تھا کہ ان پر چاروں طرف سے مخالفتوں کا ہجوم ٹوٹ پڑا۔ چنانچہ وہ باہمی مشورہ سے
اس نتیجہ پر پہنچے کہ ہمیں اس وقت ان کا کھل کر مقابلہ نہیں کرنا چاہیئے۔ ہمیں ان
سے الگ ہو کر اپنی تیاریاں کرنی چاہئیں۔ اس فیصلہ کے مطابق وہ بستی سے
نکل کر دُور ایک غار میں چلے گئے۔

وَ اِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَ مَا یَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗۤا اِلَی الْكَهْفِ یَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَ یُهَیِّئْ لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا ۝ (۱۸/۱۶)

(اُن کا یہ اعلان کرنا تھا کہ ان پر چاروں طرف سے مخالفتوں کا ہجوم اُمنڈ آیا۔ چنانچہ اُنہوں نے
باہمی مشورہ کیا اور ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ) جب تم نے اپنی قوم سے الگ مسلک

اختیار کر لیا ہے اور اس (قوم) نے اللہ کو چھوڑ کر جن ہستیوں کے اقتدار کو اختیار کر رکھا ہے تم اُن سے بھی کنارہ کش ہو چکے ہو (تو تمہارا ان کے اندر رہنا ٹھیک نہیں۔ سرِ دست ہمیں یہاں سے چلے جانا چاہیئے) اور فلاں غار میں پناہ لے لینی چاہیئے۔ (اور وہاں خفیہ طور پر اپنی تیاریاں جاری رکھنی چاہئیں)۔ خدا کا قانونِ ربوبیت (جسے متمکن کرنے کے لئے تم نے یہ آواز اٹھائی ہے) ایسا انتظام کر دے گا کہ تمہاری ضروریاتِ زندگی کی چیزوں کو وہاں تک پھیلا دے اور تمہارے مقصد کی تکمیل کے لئے جس ساز و سامان کی ضرورت ہے اسے بھی سہل الحصول بنا دے۔

وہ جس غار میں جاکر چھپے اُس کا رُخ شرقاً غرباً نہیں بلکہ شمالاً جنوباً تھا جس کی وجہ سے سورج کی شعاعیں اس کے اندر داخل نہیں ہو سکتی تھیں۔ لیکن اس کے اندر جگہ کشادہ تھی۔

وَ تَرَى الشَّمْسَ إِذَا طَلَعَتْ تَّزَاوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِينِ وَ إِذَا غَرَبَتْ تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَ هُمْ فِي فَجْوَةٍ مِّنْهُ ؕ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَ مَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا ۧ (۱۸/۱۷)

اُنہوں نے جس غار میں جاکر پناہ لی تھی، وہ اس طرح واقع ہوئی تھی کہ جب سورج نکلے تو تم دیکھو کہ وہ اُس غار کے دہانہ سے دائیں جانب کو پھر جاتا ہے اور جب وہ غروب ہو تو اُس کے دہانہ سے بائیں طرف کتراتا ہوا نکل جاتا ہے (یعنی سورج کی شعاعیں، اس غار کے اندرون کے کسی حصہ میں بھی نہیں پہنچتی تھیں۔ وہ شمالاً جنوباً واقع تھی)۔ اس غار کا دہانہ تو تنگ تھا لیکن اُس کے اندر، بہت کشادہ جگہ تھی (جو اُن کی جماعت کے لئے کافی تھی)۔ یہ انتظام خدا کی نشانیوں میں سے تھا (جو انہیں میسر آگیا تھا) اور خدا ہی نے ان کی راہ نمائی اس طرف کر دی تھی ـــ حقیقت یہ ہے کہ منزلِ مقصود تک وہی پہنچ سکتا ہے جسے خدا کی راہ نمائی میسر آجائے۔ جسے یہ راہ نمائی نصیب نہ ہو اُس کا نہ کوئی رفیق ہو سکتا ہے، نہ کوئی راستہ بتانے والا۔

اگرچہ وہ غار میں محفوظ تھے لیکن اس کے باوجود کسی حفاظتی تدبیر سے غافل نہیں رہتے تھے۔ حتّٰی کہ نیند کی حالت میں بھی یکسر بے خبر نہیں ہوتے تھے۔ وہ اس طرح چاق و چوبند سوتے تھے کہ باہر سے اگر ان پر کسی کی نظر پڑ جائے تو وہ یہی سمجھے کہ وہ جاگ رہے ہیں۔ (وَ تَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا وَّ هُمْ رُقُوْدٌ (۱۸/۱۸)۔ پھر وہ غار میں اپنی پوزیشن کو وقتاً فوقتاً بدلتے رہتے تھے وَ نُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَ ذَاتَ الشِّمَالِ (۱۸/۱۸) اور غار کے دہانے پر ان کا کتا اپنے بازو پھیلائے، دروازے کا راستہ روکے چوکنا بیٹھا رہتا تھا کہ کوئی خطرہ ہو تو انہیں اس سے آگاہ کر دے (وَ كَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ (۱۸/۱۸)۔ غرضیکہ انہوں نے وہاں کیفیت ایسی پیدا کر رکھی تھی کہ اگر کسی کو معلوم بھی ہو جائے کہ وہاں کوئی رہتا ہے اور اندر جھانکے تو ڈر کے مارے اُلٹے پاؤں بھاگ اُٹھے لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَّ لَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا (۱۸/۱۸)۔

دوبارہ آبادی کی طرف

وہ اس غار میں ایک عرصہ تک رہے اور چپکے چپکے اپنی تیاریاں کرتے رہے۔ وہ ان تیاریوں میں اس جذب و انہماک سے مصروف تھے کہ انہیں یاد بھی نہ تھا کہ انہیں وہاں کتنا عرصہ ہو گیا ہے۔ چنانچہ جب انہوں نے فیصلہ کیا کہ اب باہر نکلنے کا وقت آگیا ہے تو ایک دوسرے سے پوچھنے لگے کہ ہم بھلا یہاں کتنا عرصہ رہے ہونگے؟ (قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ (۱۸/۱۹)۔ تاکہ اس کا اندازہ کیا جائے کہ بستی کے لوگ انہیں پہچان لیں گے یا نہیں۔ ان میں سے کسی نے کہا کہ اتنا عرصہ۔ دوسرے نے کہا کہ نہیں اس سے کم مدت (قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ (۱۸/۱۹)۔ بہرحال انہوں نے کہا کہ "یہ بات محض اندازہ لگانے کے لئے چھیڑی تھی۔ ٹھیک طور پر خدا ہی جانتا ہے کہ ہم کتنی مدت سے یہاں آئے ہوئے ہیں۔ جس مقصد کے لئے ہم اس کا اندازہ کرنا چاہتے تھے (کہ بستی کے لوگ ہمیں پہچان لیں گے یا نہیں)، اس کا دوسرا طریق یہ ہے کہ اپنے میں سے ایک آدمی کو یہ سکّہ دے کر بستی کی طرف بھیجو کہ وہاں سے اچھا سا کھانا لے آئے۔ لیکن وہ اس احتیاط اور ہوشیاری سے جائے کہ ہمارا راز نہ افشا ہونے پائے" (۱۸/۱۹) کیونکہ

اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ اَوْ يُعِيْدُوْكُمْ فِيْ مِلَّتِهِمْ وَ لَنْ تُفْلِحُوْٓا اِذًا اَبَدًا ○ (۱۸/۲۰)

اگر لوگوں نے خبر پالی، تو وہ چھوڑنے والے نہیں۔ یا تو سنگسار کریں گے یا مجبور کرینگے
کہ پھر ان کے مذہب میں واپس چلے جائیں۔ اگر ایسا ہوا تو پھر تم کبھی فلاح نہ
پاسکو گے۔

اب یہ واجب العزت تھے

اس آیت سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ وہ غار میں کیوں پناہ گزین ہوئے تھے۔ اس کے بعد لوگ ان کے حالات سے باخبر ہوگئے (وَكَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ (۱۹/۲۱) اور ان کے ہم مسلک و ہم مشرب لوگوں کو اس سے بہت تقویت ہوئی کہ ان کے داعیانِ انقلاب زندہ ہیں اور اس قدر طاقت بھی فراہم کرچکے ہیں۔ اس سے انہیں یقین ہوگیا کہ خدا نے ان سے جو وعدہ کر رکھا تھا کہ اگر وہ ثابت قدم رہے تو انہیں آخر الامر کامیابی ہوگی، وہ بالکل سچا تھا (لِيَعْلَمُوٓا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ۱۸/۲۱) اور وہ انقلاب یقیناً آکر رہے گا جس کے لئے وہ اتنے عرصہ سے منتظر تھے۔ (وَ اَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيْهَا (۱۸/۲۱)۔

قرآن کریم نے اس کے بعد کے قصے کی کڑیوں کو بیان نہیں کیا کہ وہ کس طرح اپنے پروگرام میں کامیاب ہوئے اور لوگوں کے دلوں میں ان کی تعظیم و تکریم کس حد تک بڑھ گئی۔ وہ صرف اتنا بتاتا ہے کہ وہ غار اُن لوگوں کیلئے قوم کا شعار اور عظمت کا نشان قرار پاگئی! اور جب وہ نوجوان، بعد میں فوت ہوئے تو ان کے معتقدین میں اس امر پر اختلاف پیدا ہوا کہ ان کی یادگار کس قسم کی بنائی جائے۔ کسی نے کہا کہ وہاں ایک بہت بڑی عمارت بطور یادگار بنانی چاہیئے (فَقَالُوا ابْنُوْا عَلَيْهِمْ بُنْيَانًا ۱۸/۲۱)۔ لیکن گروہِ غالب کا فیصلہ یہی ہوا کہ ان کی قبروں پر ایک عبادت گاہ بنادی جائے (لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا ۱۸/۲۱)۔ چنانچہ اس طرح ان انقلاب آفریں مجاہدین کی قبریں بعد میں لوگوں کے لئے سجدہ گاہ بن گئیں اور ان کا غار خانقاہ میں تبدیل ہوگیا۔

اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ اب لوگ یہ تو بھول چکے ہیں کہ انہوں نے کس قدر مجاہدانہ کارنامے سرانجام دیئے تھے۔ اب ان کے مزاروں سے منتیں مانی جاتی ہیں۔ ان کے متولی لوگوں کو ان کی "کرامات" کے قسم قسم کے افسانے سناتے ہیں اور ان کے معتقدین بھی اس قسم کی بے معنی بحثوں میں اُلجھے رہتے ہیں کہ وہ تین تھے، چوتھا ان کا کتا تھا (سَيَقُوْلُوْنَ

ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ (۱۸/۲۲)۔ دوسرا کہتا ہے نہیں، وہ پانچ تھے، چھٹا اُن کا کُتا تھا (وَيَقُوْلُوْنَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ ۱۸/۲۲)۔ یہ بھی کسی حتم ویقین کے ساتھ نہیں کہتے، یونہی اندھیرے میں تیر چلاتے ہیں (رَجْمًاۢ بِالْغَيْبِ ۱۸/۲۲)۔ بعض ان سے بھی آگے بڑھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ سات تھے، آٹھواں ان کا کُتا تھا (وَيَقُوْلُوْنَ سَبْعَةٌ وَّ ثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ۱۸/۲۲)۔ اس کے بعد قرآن، نبی اکرمؐ (اور آپؐ کی وساطت سے مسلمانوں) سے کہتا ہے کہ یہ لوگ اگر اس قسم کی باتیں لے کر آپ کے پاس آئیں تو ان سے بحث میں نہ اُلجھو۔ ان سے کہہ دو کہ ان کی تعداد کا علم خدا ہی کو ہے۔ تم میں سے کوئی بھی ٹھیک ٹھیک بات نہیں جانتا۔ تم ان سے بات کرنے میں اسی حد تک رہو جس حد تک قرآن نے بات واضح کر دی ہے۔ اس سے زیادہ نہ ان سے کچھ کہو، نہ ان سے کچھ پوچھو (قُلْ رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَّا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ ڨ فَلَا تُمَارِ فِيْهِمْ اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا ۠ وَّلَا تَسْتَفْتِ فِيْهِمْ مِّنْهُمْ اَحَدًا ۱۸/۲۲)۔

یہ تھا ان کی تعداد کے متعلق۔ اس کے بعد غار میں رہنے کی مدت کے متعلق ہے۔

وَلَبِثُوْا فِيْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِيْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا ○
قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا...... (۱۸/۲۵ - ۲۶)

بعض ان میں سے کہتے ہیں کہ وہ غار میں تین سو برس تک رہے۔ بعض اس مدت میں نو برس کا اضافہ کر دیتے ہیں۔ ان سے کہہ دو کہ اس کا علم بھی خدا ہی کو ہے کہ وہ کتنے سال تک غار میں رہے تھے۔

قرآن چونکہ تاریخ کی کتاب نہیں اس لئے وہ اس قسم کی واقعاتی تفاصیل میں نہیں جاتا۔ ان قصص کے بیان کرنے سے اس کا مقصد کسی اصولی حقیقت کی طرف توجہ دلانا ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ اپنے آپ کو وہیں تک محدود رکھتا ہے۔ یہی مقصد گذشتہ آیات سے ہے۔

واقعہ اور اس کی تفاصیل ختم ہو گئیں۔ وہ مجاہدین ایسے معرکہ آرا کارنامہ کے بعد وفات پا گئے اور لوگوں نے ان کی قبروں پر ایک یادگار قائم کر دی جو رفتہ رفتہ خانقاہ بن گئی۔ ان خانقاہوں

کے اندر عبادات گذاری کے کیا کیا طریقے تھے' ان کی تفاصیل خانقاہیت کے متعلق لٹریچر[1] کے مطالعہ سے مل سکتی ہیں۔ ان لوگوں کی عجیب

خانقاہوں کی زندگی

حالت تھی۔ اس قسم کی عبادت کا منتہیٰ یہ سمجھا جاتا تھا کہ انسان اس میں اس درجہ مستغرق ہو کہ کھانے پینے تک کا بھی ہوش نہ رہے۔ اس پر جذب و انہماک کا ایسا عالم طاری ہو کہ وہ جس انداز میں محوِ عبادت گذاری ہے' اسی انداز میں مہینوں پڑا رہے۔ اگر کھڑا ہے تو بیٹھے نہیں' سجدہ میں ہے تو اُٹھے نہیں۔ جو جھکا ہے جھکا رہے، جو بیٹھا ہے بیٹھا رہے۔ مغرب میں تو اس قسم کی خانقاہیں اور ان خانقاہوں میں ایسی موت آور ریاضتیں باقی نہیں رہیں، لیکن مشرق میں ابھی تک اس کے آثار باقی ہیں۔ ہمالہ کی چوٹیوں یا غاروں میں آج بھی اس قسم کے مندر پائے جاتے ہیں جہاں سادھو' سنیاسی اس قسم کی ریاضتوں میں محو ہوتے ہیں۔ کوئی ایک ٹانگ کے بل کھڑا ہے۔ کسی نے ایک ہاتھ اوپر اٹھا رکھا ہے اور وہ ہاتھ بالکل سوکھ چکا ہے۔ کوئی آسمان کی طرف ٹکٹکی لگائے ہے اور آنکھ نہیں جھپکتا۔ کوئی لوہے کی میخوں کے بستر پر لیٹا ہے۔ کوئی آگ جلائے اوندھا لٹک رہا ہے۔ یہی کچھ عیسائیت کی خانقاہیت میں ہوتا تھا۔

تاریخی اور اثری انکشافات شاہد ہیں کہ ارضِ فلسطین اس قسم کے تہ خانوں اور غاروں سے پٹی پڑی تھی۔ یہ غار عبادت گاہوں کے طریق پر بھی کام آتے تھے اور جب ویران ہو جاتے تو رہزنوں

ان غاروں کی تفاصیل

اور قزاقوں کی کمین گاہوں اور پناہ گاہوں کا کام دیتے تھے۔ تورات میں ان غاروں کے متعلق اکثر اشارات ملتے ہیں۔ مثلاً قاضیون کی کتاب میں ہے۔

---

[1] اس موضوع پر انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا اور انسائیکلوپیڈیا اوف ریلیجن اینڈ ایتھکس کے مضامین کے علاوہ

SPIRIT AND ORIGIN OF CHRISTIAN MONESTICISM by J.O. Hannay

Benedictive Monasticism by E.C. Butler

مطالعہ کے قابل ہیں۔

اور مدیانیوں کا ہاتھ اسرائیلیوں پر قوی ہوا اور مدیانیوں کے سبب بنی اسرائیل نے اپنے لئے پہاڑوں میں کھوہ اور غار اور مضبوط مکان بنا لئے۔ (قاضیون ۶/۲)

رابنسن اپنی کتاب Biblical Researches in Palestime میں لکھتا ہے۔

یہ ملک چاروں طرف سے غاروں سے پٹا پڑا ہے۔ یہ غاریں شاید (حضرت) داؤد کے زمانہ میں کمین گاہوں کے طور پر استعمال ہوتی تھیں۔ (جلد دوم صـ۲۰۳)

جوزیفس اپنی مشہور تاریخ Antiquities کی جلد ۱۴، باب ۱۵ میں ان تہ خانوں اور غاروں کے متعلق لکھتا ہے کہ ان میں رہزن اور قزاق پناہ لیا کرتے تھے۔ کوہ کارمل کی غاریں اس زمانہ کی مشہور عبادت گاہیں تھیں۔ کیٹو اپنے انسائیکلو پیڈیا اوف ببلیکل لٹریچر میں لکھتا ہے۔

کارمل چونے کے پتھر کا پہاڑ ہے اور جیسا کہ ایسی صورت میں اکثر ہوتا ہے، اس میں بڑی بڑی غاریں واقع ہیں، قریب ایک ہزار سے بھی زیادہ۔ ایک خاص خطہ میں جسے "راہبوں کے غار" کہا جاتا ہے قریب چار ہزار غاریں ایک دوسرے سے ملحق پائی جاتی ہیں۔ ان میں روشندان بھی ہیں اور سونے کی جگہ بھی۔ ان کے دروازے اس قدر تنگ ہیں کہ ایک وقت میں صرف ایک آدمی رینگ کر اندر داخل ہو سکتا ہے۔ پھر ان کے راستے اس قدر پُرپیچ وخم دار ہیں کہ چار قدم کے بعد انسان نگاہوں سے پوشیدہ ہو جاتا ہے .... یہ حقیقت ہر شخص کو معلوم ہے کہ کوہ کارمل کی غاریں زمانۂ قدیم میں نبیوں اور دوسرے مذہب پرست لوگوں کی عبادت گاہ تھیں۔

ایک مشہور سیاح Burckmardt اپنے سفر نامہ میں لکھتا ہے۔

کوہ کلات ابن معان میں طبعی غاروں کو ایسے راستوں سے باہم ملا دیا گیا ہے جو پتھر کی چٹانیں تراش تراش کر بنائے گئے ہیں۔ ان کے اندر پانی کے حوض ہیں اور کم وبیش چھ سو نفوس کے رہنے کی گنجائش۔

یہی غاریں تھیں جنہوں نے رفتہ رفتہ خانقاہوں کی شکل اختیار کر لی۔ الیسینی Essenes فرقہ (جس کا اجمالی ذکر پہلے آ چکا ہے) مسلک رہبانیت کا سب سے بڑا پیرو تھا۔ مصر میں ان کی اس قسم

کی خانقاہیں ان کے زہد و انزوا کی زندہ شہادتیں تھیں۔ مشہور یہودی مؤرخ فیلو PHILO قریب ۴۰ سنہ ق م میں ان کے متعلق لکھتا ہے۔

ہر عبادت گاہ میں ایک مقدس حلقہ ہوتا ہے جسے مندر کہا جاتا ہے اور اس کے ساتھ خانقاہ جس میں راہب عالمِ بالا کے عجائب و غرائب کے کرشمے دکھاتے ہیں۔ وہ اپنے پاس کچھ نہیں رکھتے، حتیٰ کہ کھانے پینے اور دیگر ضروریاتِ زندگی کی چیزیں بھی نہیں۔ ان کے پاس صرف نبیوں کا مقدس کلام ہوتا ہے اور اس قسم کی اور چیزیں جن سے ان کے زہد و تقدس میں اضافہ اور تکمیل[1] ہو۔

CONTEMPLATIVE LIFE

قریب سنہ ۲۵۰ء میں اسی قسم کی ایک خانقاہ عیسائی راہب پالوس نے جزیرہ طابینہ TOBENNA میں قائم کی۔

اس جزیرہ کی ہر خانقاہ میں یونانی لٹریچر کے ماہرین کی جماعتیں رہا کرتی تھیں۔ آہستہ آہستہ اسکندریہ اسکول کے لوگوں نے بھی وہاں آنا شروع کر دیا۔

(امریکن انسائیکلو پیڈیا، جلد ۷)

یہ پہلی خانقاہ تھی۔ لیکن اس کے بعد خانقاہوں کی ترویج اس برق رفتاری سے ہوئی کہ تیسری صدی کے اخیر میں ہر جگہ خانقاہیں دکھائی دینے لگیں۔ چنانچہ ROLLIN اپنی کتاب "تاریخِ مصرِ قدیم" (جلد دوم باب ۲) میں لکھتا ہے۔

"زیریں مصر کا سب سے بڑا اعجوبہ اس کا شہر OXYRICHUS تھا جس کی حالت یہ تھی کہ شہر کے اندر اور باہر، ہر جگہ راہب ہی راہب دکھائی دیتے تھے، شہر کی آبادی سے بھی زیادہ راہب۔ عام عمارات اور مناد رسب خانقاہوں میں تبدیل ہو چکے تھے اور ان کی تعداد سکونتی مکانات سے بھی زیادہ تھی...... اس شہر میں

---

[1] یہ قریب سنہ ۴۰ ق م کی شہادت ہے، یعنی اس زمانے کی شہادت جس میں حضرت مریمؑ خانقاہ میں راہبہ کی زندگی بسر کرنے کے لئے وقف کی گئی تھیں۔ تفصیل پہلے آ چکی ہے۔

بیس ہزار کنواری راہبات اور دس ہزار راہب بستے تھے۔

یہ ہے واقعہ اصحابِ کہف کا جس کے بیان سے مقصود یہ ہے کہ حق پرست لوگوں کو کس کس قسم کی تکالیف اور مصائب کا سامنا کرنا پڑتا تھا اور بالآخر وہ لوگ کس طرح مرجعِ انام بن جاتے تھے۔ ان قصص سے ذرا قرآنِ کریم کی وسعتِ داماں پر غور کیجئے۔ جہاں جہاں کوئی شگفتہ پھول ملتا ہے وہ کس طرح بلاتفریق چن لیتا ہے۔ کیا کسی اور جگہ بھی آپ کو ایسی کشادہ ظرفی کی مثال ملتی ہے؟

قرآنِ کریم نے رہبانیت کے متعلق کہا ہے کہ ایک تو یہ مسلک ہی لوگوں کا خود ساختہ تھا۔ اللہ نے اس مسلک کا حکم نہیں دیا تھا اور دوسرے یہ کہ یہ لوگ اپنے خود ساختہ مسلک کی بھی رعایت نہ رکھ سکے اور ان خرافات میں پڑ گئے جن کے تذکرہ سے آج روحِ انسانیت شرماتی ہے۔ مسلکِ خانقاہیت کی تشریح تو اپنے مقام میں (کسی آئندہ جلد میں) آئے گی۔ اس وقت صرف اتنا سمجھ لینا چاہیئے کہ اسلام کی رُو سے انسانی ذات (خودی) کے اثبات و تکمیل کا طریق یہ ہے کہ انسان اپنے جوشِ عمل اور شدتِ کردار سے عالمِ طبیعی کو مسخر کرلے اور ان بے پناہ قوتوں کو منشائے ایزدی کے مطابق نوعِ انسان کی فلاح و بہبود کے کاموں میں لائے۔ (اس کو قیامِ حکومتِ الٰہیہ کہتے ہیں)۔ اس کے برعکس مسلکِ خانقاہیت

فلسفۂ رہبانیت

رہبانیت (کہ جس کا ماخذ افلاطون کا مشرب "اعیان نامشہود" ہے) کی رُو سے دنیا کے خارجی حقائق سب سراب (ویدانت کی زبان میں مایا) ہیں۔ اس لئے انسان کو ان خارجی حقائقِ فطرت کی طرف سے آنکھیں بند کرکے "اندر کی دنیا" میں جذب ہوجانا چاہیئے۔ اس فلسفۂ حیات کا لازمی نتیجہ جمود و سکون ہے جس میں زندگی کا حرکتی عنصر یکسر افسردہ ہوجاتا ہے۔ اس لئے یہ فلسفۂ حیات غیر اسلامی ہے جو زندگی کو حقائق سے گریز اور حرکت و عمل کے بجائے جمود و تعطل سکھاتا ہے۔ اسلامی تصورِ زندگی کا راز "حرکتِ دوام" میں ہے۔ اب رہی دوسری شق، یعنی ان لوگوں نے اپنے خود اختیار کردہ مسلکِ خانقاہیت کی بھی رعایت نہ رکھی، سو اس ضمن میں خود مغربی محققین نے خانقاہیت MONASTICISM اور خانقاہوں MONASTRIES کے متعلق اس قدر لیسرچ کی

ہے کہ کسی دوسرے کے کچھ لکھنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ یہ خانقاہی فتنے خانقاہیت کی ابتدا ہی سے شروع ہو گئے تھے۔ طابینہ کی سب سے پہلی خانقاہ (جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے) کے متعلق امریکن سائیکلو پیڈیا (جلد ہفتم) میں مذکور ہے:

ترکِ دنیا کے اس غلو کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہوت پرستی، جنون، یاس انگیزی اور خودکشی عام ہونے لگی۔ راہبوں کی جہالت اور مذہبی جنون سے بہت سے خودغرض لوگوں نے فائدہ اٹھا کر انہیں اپنا آلۂ کار بنالیا۔

دنیائے عیسائیت میں BUCK'S THEOLOGICAL DICTATIONARY ایک مستند صحیفہ تسلیم کی جاتی ہے۔ اس میں MONKS کے عنوان کے تحت مصر کی تحریکِ خانقاہیت کے عروج کی داستان بیان کرنے کے بعد لکھا ہے۔

خانقاہوں کے فتنے

تھوڑے ہی عرصہ میں تمام مشرق سہل انگار انسانوں کی جماعتوں سے بھر گیا جنہوں نے تمام دنیاوی علائق سے قطع تعلق کر کے کرب و اذیت اور مصائب و نوائب کی زندگی اختیار کرلی تاکہ اس کے ذریعہ خدا اور عالمِ ملکوت سے قرب حاصل کیا جا سکے .... (لیکن کچھ عرصہ کے بعد) ان لوگوں کی شہوت پرستی ضرب المثل ہوگئی۔ نیز انہوں نے مختلف مقامات پر لوگوں کو مشتعل کر کے ہنگامے اور شورشیں برپا کرانا شروع کردیں..... مستند مصنفوں کی شہادات سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ لوگ بالعموم سہل انگار، جاہل، آوارہ مزاج اور حدود فراموش عیش پسند واقع ہوئے تھے جن کی زندگی کا مطمحِ نگاہ، تموّل، سہل انگاری اور عیش پرستی تھا۔

ان "تارک الدنیا" زاہدوں سے ایک دنیا تنگ آ رہی تھی۔

پیٹ لپٹ کر مانگنے والے بھکاری، راہبوں کے لباس میں ہر گلی کوچہ میں آوارہ پھرتے دکھائی دیتے تھے۔ ہر قسم کی بدمعاشی، فریب دہی ان کا شعار تھا۔ حتیٰ کہ جو لوگ انہیں پناہ دیتے یہ انہیں بھی نہ بخشتے .... جیروم کے اندازہ کے مطابق اس کے زمانہ میں اکیلے مصر میں ... ۷۰ راہب تھے...... یہ لوگ مذہبی جوشِ عقیدت کے نقاب میں

بدترین سلب و نہب کی وارداتوں کے مرتکب ہوتے۔

(PROGRESS OF RELIGIOUS IDEAS Vol,3 P249)

یہ خانقاہوں کی حالت تھی۔ اُدھر کلیساؤں میں جہاں اسی رہبانیت کی دوسری صورت پادریوں کے لباس میں جلوہ گر تھی، اس سے بھی بدتر حالت تھی۔ موشیم MOSHEIM مسیحی دنیا کا بہت بڑا مستند مورّخ ہے۔ وہ اپنی مشہور تاریخ میں تیسری صدی کے کلیساؤں کے متعلق لکھتا ہے۔

> اکثر کی یہ حالت تھی کہ وہ آرام طلبی اور شہوت پرستی کی زندگی میں ڈوبے ہوئے تھے..... ان کی کیفیت یہ تھی کہ وہ ان راہبہ عورتوں سے جو عمر بھر مجرّد رہنے کی قسم کھائے ہوتیں، ناجائز تعلقات قائم کرتے۔ ان خوبصورت راہبات کو اپنا شریکِ بستر بنالینا ان کے معمولات میں داخل ہوچکا تھا۔

یہ اعمال کی کیفیت تھی۔ اور عقائد کی یہ حالت کہ موشیم مذکور چوتھی صدی کے مذہب پرستوں کے متعلق لکھتا ہے۔

> ارضِ فلسطین اور دوسرے ولیوں کی قبروں کی زیارتوں کے لئے (اطراف واکنافِ عالم سے) لوگ چلے آتے، یہ سمجھ کر کہ حقیقی نیکی اور یقینی نجات صرف وہیں مل سکتی ہے۔ توہم پرستی کی لگام کو ذرا ڈھیلا کیجئے اور پھر دیکھئے کہ یہ کس طرح حدود فراموش وسعتوں تک پھیل جاتی ہے۔ چنانچہ ان میں بیہودہ معتقدات اور لایعنی رسومات کا نت نئے دن اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اس سرزمین کی مٹی کو لوگ تبرکاً لے جاتے۔ اس کے متعلق عقیدہ یہ تھا کہ یہ خبیث روحوں کے بداثرات سے محفوظ رکھنے کے لئے اکسیر ہے۔ چنانچہ اس مٹی کی ہر جگہ بڑی بڑی قیمتوں پر خرید و فروخت ہوتی........ آہستہ آہستہ توہم پرستی عام ہوتی گئی جس سے مذہبی مکاری اور فریب کا دروازہ کھل گیا۔ اب ان راستوں سے مذہبی دوکاندار آلے شروع ہوگئے جن کا اصول اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ لوگوں کی جہالت اور عقیدت سے فائدہ اٹھا کر اپنا اُلّو سیدھا کیا جائے اور اس طرح دولت اکٹھی کرلی جائے۔ انسانی فطرت کی کچھ افتاد ایسی ہے کہ ہر نئی چیز اعجوبہ اور کرامت بن کر نظر آتی ہے۔ (اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر کیا یہ جاتا کہ) مٹی کے ڈھیروں کو ولیوں کی قبریں بنا بنا کر ان کی پوجا کرائی جاتی۔ ولیوں کی فہرستوں میں

آئے دن اضافے ہوتے رہتے اور چوروں اور ڈاکوؤں کو مقدس شہدا ر بنا کر پیش کیا جاتا۔ کسی مردے کی ہڈیاں ویرانے میں دفن کر دی جاتیں۔ پھر مشہور کر دیا جاتا کہ ہمیں خواب میں دکھائی دیا ہے کہ اس جگہ ایک بہت بڑے بزرگ مدفون ہیں۔ راہبوں کی جماعتیں قریہ قریہ گشت لگاتیں اور یہ لوگ نہایت دیدہ دلیری سے نہ صرف بزرگوں کی طرف منسوب کر کے فرضی تبرکات ہی بیچتے بلکہ عوام کی نگاہوں کو یہ کہہ کر بھی دھوکا دیتے کہ ہم جنات نکالتے ہیں اور بھوت پریت کو مار بھگاتے ہیں۔ غرضیکہ اسی قسم کی مکاری اور جعلسازی اس قدر عام ہو رہی تھی کہ اس کی تفاصیل کے لئے ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہے۔

مشہور مورّخ گبن جس نے روما کی عظیم الشان سلطنت کے انحطاط و سقوط کی عبرت انگیز داستان لکھی ہے، اس باب میں لکھتا ہے ؛

> یہ کامیاب تجربہ کہ ولیوں کے تبرکات سونے اور جواہرات سے بھی زیادہ بیش قیمت ہیں، پادریوں کے لئے کلیسا کے خزانوں میں اضافے کرنے کی تحریص کا موجب بنا۔ انہوں نے امکانات و صداقت کو بالائے طاق رکھ کر، پرانی ہڈیوں کے لئے عجیب و غریب نام وضع کئے اور پھر ان ناموں کی طرف (محیّر العقول) کارنامے منسوب کئے۔ حضرت مسیح کے حواریوں اور ان مقدس لوگوں (کے چہروں)، پر جنہوں نے نیک اعمال میں ان کی پیروی کی تھی قسم قسم کے مذہبی افسانوں کی سیاہ چادر ڈالی گئی۔ جسور و غیور شہدا ر کی فہرست میں ہزارہا ایسے فرضی مشاہیر کا اضافہ ہو گیا جن کا وجود ان افسانہ طرازوں کے ذہن سے باہر کہیں نہیں تھا اور اس بدگمانی کے لئے کافی وجوہات موجود ہیں کہ صرف (TOURS) کا کلیسا ہی ایک ایسا نہ تھا جس میں ولیوں کے بجائے جعلسازوں کی ہڈیوں کی پرستش ہوتی تھی (اور جگہ بھی ایسا ہوتا تھا)، اس توہم پرستی نے ایک طرف فریب کاری اور خوش اعتقادی کی راہیں کشادہ کر دیں اور دوسری طرف دنیائے عیسائیت سے تاریخ اور بصیرت (دونوں) کے چراغ گل کر دیئے۔

ان ولیوں کو کعبۂ مقصود و قبلۂ حاجات اور مصائب و نوائب میں مشکلات کشا تصور کیا جاتا تھا۔ TOWNSEND اپنی کتاب TRAVELS IN SPAIN VOL-III میں لکھتا ہے ؛

یہ امر لوگوں کے لئے خوشی کا موجب ہے کہ ان لوگوں کے پاس اطباء کی حذاقت کے علاوہ امراض کے دفعیہ کے لئے ایک اور بھی امید کا سرچشمہ ہے۔ وہ سرچشمہ جو کسی مصیبت میں بھی ناکام نہیں رہتا۔ مثلاً (ان کے نزدیک) انتھلی ولی اپنے معتقدین کو آگ سے محفوظ رکھتا ہے اور ایک دوسرا انتھلی انہیں پانی کی مصیبت سے نجات دلاتا ہے۔ باربرا ولی جنگ اور بجلی کے حوادث میں جائے پناہ ہے۔ بلاس ولی گلے کی بیماریوں کو اچھا کرتا ہے۔ لوسیا ولی آنکھوں کے امراض کو شفا دیتا ہے۔ نکوس ولی ان جوان عورتوں کی امداد کرتا ہے جو شادی کی متمنی ہوں۔ رامتی ولی حمل کے ایام میں ان کی حفاظت کرتا ہے۔ پلونیا ولی دانتوں کو محفوظ رکھتا ہے۔ ڈومنگو ولی بخار اتار دیتا ہے اور روقی ولی کی طرف طاعون کی مصیبت میں رجوع کیا جاتا ہے۔ قصہ مختصر کوئی بیماری ہو یا کوئی مصیبت، اس کے دفعیہ کے لئے کوئی نہ کوئی ولی موجود ہے جس سے دُعا کے ذریعہ اعانت طلب کی جاتی ہے اور وہ اپنے پکارنے والے کی مدد کو پہنچ کر اس کی تکلیف میں دستگیری کرتا ہے۔

یہ اور ہم؟ آپ یہ کچھ پڑھ رہے ہیں اور تیسری چوتھی صدی کے عیسائیوں کی حالت کا نقشہ ذہن میں مرتسم کئے جا رہے ہیں۔ اس لئے آپ کو فرصت کہاں کہ یہ سوچیں کہ خود ہمارے ہاں ایک عرصہ دراز سے کیا ہو رہا ہے؟ لیکن مسلمان کو اس کے سوچنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اس نے قرآن میں پڑھا کہ رہبانیت خلافِ اسلام ہے تو سمجھ لیا کہ یہ آیت عیسائیوں سے متعلق ہے۔ ان کی خانقاہیت خلافِ اسلام تھی لیکن ہماری خانقاہیت عین اسلام بلکہ "مغزِ اسلام" ہے! اب انہیں کون سمجھائے کہ لات ومنات، لات ومنات ہی رہتے ہیں خواہ انہیں محرابِ کعبہ میں ہی کیوں نہ رکھ دیا جائے۔ اس قسم کی جعلسازیاں اور فریب کاریاں ہی قابلِ اعتراض نہیں بلکہ قابلِ اعتراض ہے وہ روحِ خانقاہیت جو خدا کا متعین فرمودہ نظامِ حیات نہیں، بلکہ حقائقِ زندگی سے گریز کرنے والے شکست خوردہ دماغوں کی اختراع ہے جس سے پوری کی پوری قوم افیونیوں کا گروہ بن کے رہ جاتی ہے اور یہ روحِ خانقاہیت ایک ہی ہے، یہاں ہو یا وہاں۔ علامہ اقبالؒ نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے ایک خط میں لکھا تھا کہ "تصوف اسلام کی سرزمین میں ایک اجنبی پودا ہے۔" یہی "اجنبی پودا" بعد میں عین اسلام بن گیا۔ حیرت ہے کہ قرآن کو سامنے رکھنے والے مسلمان کی سمجھ میں بھی یہ بات نہ

آئی کہ

کمالِ ترک نہیں آب و گل سے مہجوری
کمالِ ترک ہے تسخیرِ خاکی و نوری

حضرات انبیاء کرامؑ کا تذکارِ جلیلہ جس کی ابتدا حضرت نوحؑ سے ہوئی تھی "جوئے نور" اور "برقِ طور" کے بعد زیرِ نظر کتاب میں حضرت عیسیٰؑ تک وجہ شادابیٔ قلب و نظر بن چکا ہے۔ اس کے بعد حضور خاتم النبیینؐ کی سیرتِ مقدسہ اس سلسلہ کی اگلی کڑی "معراجِ انسانیت" میں آگئی ہے۔ قبل اس کے کہ زیرِ نظر کتاب کو ختم کیا جائے، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ حضرات انبیائے کرامؑ کے احوال و کوائف میں جو جو مشترکہ اقدار قرآن میں بیان ہوئی ہیں، انہیں بیک وقت سامنے لایا جائے اور اس کے بعد یہ دیکھا جائے کہ ان انبیائے کرامؑ کی دعوت کا ردِ عمل اُن کی اُمتوں کی طرف سے کیا ہوا؟ اس طرح یہ حصہ گویا سابقہ مندرجات پر نگہ بازگشت کا کام دے گا۔ آئندہ دو ابواب اسی طائرانہ تبصرہ پر مشتمل ہیں۔

یہ ہیں رسولؑ!

تِلْكَ الرُّسُلُ

فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ م (۲/۲۵۳)

بنگر کہ جوئے آب چہ مستانہ می رود!!

تِلْکَ الرُّسُلُ

یہ ہیں حضراتُ انبیائے کرام علیہمُ السّلام

طائرانِ حظیرۂ قدس کا وہ کاروانِ شوق جو صبحِ ازل، جھلملاتے تاروں کی سکوت افزا شبنمی چھاؤں میں، جانبِ منزل روانہ ہوا تھا، قندیلِ آسمانی کی بصیرافروز و جہاں تاب روشنی میں 'زمزمہ سنج و نغمہ بار' جذب و کیف کی نورانی وادیاں طے کرتا اس مقام تک آپہنچا ہے جہاں سے چراغِ منزل، روشنی کے جگمگاتے مینار کی طرح، دُور سے مسکراتا نظر آرہا ہے۔ وہ مقام جہاں اس مقصدِ عظیم کی تکمیل ہوگی جس کے لئے خاک کے ذرّے مختلف ارتقائی ادوار طے کرکے پیکرِ آدم میں متشکل ہوئے اور یہ پیکرِ آب و گِل مقامِ شرف و مجدِ انسانیت کی طرف رواں دواں جادہ پیما ہوا۔ نفوسِ قدسیہ کا یہ قافلۂ رشد و ہدایت ایک جوئے رواں تھی جو دامنِ کہکشاں سے فرازِ کوہ پر جلوہ بار و گہرریز ہوئی اور سینۂ کوہسار کو چیرتی، بڑی بڑی چٹانوں سے ٹکرا کر بجلیاں پیدا کرتی، سرودِ زندگی کو اپنی لہروں کے آغوش میں پرورش دیتی، داخلِ دشت و صحرا ہوئی۔

در خوابِ ناز بود بہ گہوارۂ سحاب　　وا کرد چشمِ شوق بآغوشِ کوہسار

از سنگ ریزہ نغمہ کشاید خرامِ اُو　　سیمائے او چو آئینہ بے رنگ و بے غبار

زی بحرِ بیکرانہ چہ مستانہ می رود

در خود یگانہ از ہمہ بیگانہ می رود[1]

---

[1] مشہور جرمن مفکّر اور شاعر گوئٹے نے نغمۂ محمدؐ کے نام سے ایک بڑی پیاری نظم لکھی تھی جس کا ترجمہ علامہ اقبالؒ نے پیامِ مشرق میں شائع کیا تھا۔ یہ اسی نظم کے بند ہیں۔

یہ مست خرامِ جوئبار، دشت و صحرا میں زمینِ صالح کو لالہ زاروں میں تبدیل کرتی اور خس و خاشاک اور ہر کشتِ زبوں حاصل کو اپنی موجوں کی لپیٹ میں بہاتی آگے بڑھتی گئی۔ گاہ اپنی سکوت افزا روانیوں سے سبزۂ نو دمیدہ کا منہ چومتی اور جھکی ہوئی شاخوں کو آئینہ دکھاتی اور گاہ، کف بردہاں طغیانیوں سے بڑے بڑے سرکش و تناور درختوں کو جڑ سے اکھیڑتی، این و آں سے بے نیاز، ماحول سے مستغنی، گرد و پیش سے غیر متأثر، اپنی خودی میں مست، انسانوں کے خود ساختہ قوانین و ضوابط سے بے رُخی برتتی اور صرف اس قانونِ سرمدی کا اتباع کرتی جس کے تابع زندگی بسر کرنے کے لئے اس کی تخلیق ہوئی تھی، جانبِ منزل بڑھتی چلی گئی۔

دریائے پُرخروش زبند و شکن گذشت ‌ ‌ ‌ ‌ از تنگنائے وادی و کوہ و دمن گذشت
یکساں چو سیل کردہ نشیب و فراز را ‌ ‌ ‌ ‌ از کاخِ شاہ و بارہ و کشت و چمن گذشت
بیتاب و تند و تیز و جگر سوز و بے‌قرار ‌ ‌ ‌ ‌ درہر زماں بتازہ رسید از کہن گذشت
زی بحرِ بیکرانہ چہ مستانہ می رود
در خود یگانہ از ہمہ بیگانہ می رود

یہ قافلۂ رشد و ہدایت، یہ کاروانِ نور و نکہت، ہر ناقۂ بے زمام کو دعوتِ قطار دیتا اور ہر رہروِ سفرِ حیات کی تقدیروں کی پردہ کشائی کرتا اس مقام تک آ پہنچا ہے جہاں آثارِ منزل نکھر کر سامنے آ گئے ہیں۔ تکمیلِ سفر کی ہنگامہ خیز مسرت اور حصولِ منزل کی مسرت انگیز کیفیت کا اندازہ ہم پا شکستہ کیا لگا سکتے ہیں، نہ جن کے قدم آشنائے جادہ نہ آنکھیں شناسائے منزل؟ اس والہانہ کیفیت کا پوچھئے کسی ایسے قلبِ زندہ سے جس پر یہ حقیقت آشکارا ہو چکی ہو کہ

حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

بہرکیف، یہ راحلۂ شوق اس وقت میقات میں پہنچ چکا ہے۔ وہ دیکھئے! ہر فردِ کارواں مصروفِ احرام بندی ہے کہ اب اگلا قدم حریمِ کعبہ میں ہوگا۔ جب تک یہ کارواں، ان تیاریوں میں مصروف ہے، آئیے ہم ان کی قطع کردہ راہوں پر ایک طائرانہ نگہِ بازگشت ڈالیں تاکہ گذری ہوئی منازل کی یاد پھر سے تازہ ہو جائے اور ہم ان شگفتہ و شاداب پھولوں کو دامنِ نگاہ میں لئے ان کے ساتھ آگے بڑھیں کیونکہ اس سے آگے فاران[1]

---

[1] سیرتِ نبی اکرمؐ مقصود ہے۔ یہ سیرت 'معراجِ انسانیت' کے عنوان سے شائع ہو چکی ہے۔

کی مقدس وادی میں پہنچ کر جہاں کا ہر سنگریزہ جلوہ فروشِ صد طور اور ہر ذرّہ آئینہ نمائے ہزار سینا ہے، اس کی فرصت نہ مل سکے گی۔ اس لئے کہ وہاں قلب کی ہر حرکت صرفِ نیاز اور نگاہ کی ہر جنبش وقفِ سجود ہو گی۔

اسلام کیا ہے؟

کائنات کی ہر شے ایک مقرّرہ قانون کے تابع زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔ اس روشِ تسلیم و رضا کا نام اسلام (جُھک جانا) اور جس قانون کی اطاعت ہو رہی ہے اس کا نام دین (نظامِ اطاعت یا مسلکِ زندگی) ہے۔ انسان بھی کائنات ہی کا ایک جزو ہے۔ اس لئے اس کے لئے بھی کسی آئین و نظام کے سامنے جھکنا ضروری ہے۔ جو نظامِ اطاعت اس کے لئے متعیّن کیا گیا ہے اس کا نام الدّین ہے اور جس انداز سے اس نظام کی اطاعت ہو گی اس کا نام الاسلام۔ انسان کے لئے اس الدّین کے علاوہ نہ کوئی اور دین (نظامِ اطاعت اور مسلکِ حیات) ہے نہ الاسلام کے علاوہ کوئی اور اسلام (اندازِ اطاعت اور طریقِ زندگی)؛ یعنی نظام بھی ایک اور اس نظام کی اطاعت کا طریق بھی ایک۔

أَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَ لَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ○ (۳/۸۳)

پھر کیا یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کا دین چھوڑ کر دوسری راہ ڈھونڈھ نکالیں؟ حالانکہ آسمان و زمین میں جو کوئی بھی موجود ہے، طوعاً و کرہاً سب اُسی کے حکم کے فرماں بردار ہیں اور ہر ایک کی گردش کا رُخ اسی محور کی طرف ہے۔

اس نظامِ اطاعت کے علاوہ کوئی اور نظام قابلِ قبول نہیں۔

وَ مَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَ هُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ○ (۳/۸۵)

جو کوئی الاسلام کے سوا (جو ایک مکمل نظامِ اطاعت اور مسلکِ حیات ہے) کسی دوسرے دین کا خواہشمند ہو گا، تو وہ کبھی قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ آخر الامر خاسر و نامراد رہے گا۔

اس لئے کہ

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ (۳/۱۹)

بلاشبہ الدّین (نظامِ اطاعت) اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہی ہے!

انسان اور دیگر اشیاء میں فرق دیگر اشیائے کائنات جس قانون کے ماتحت زندگی بسر کرنے کے لئے تخلیق ہوئی ہیں اُن پر اُن کے ذاتی میلانات ورجحانات یا خارجی مؤثرات اثر انداز نہیں ہوتے۔ برعکس اس کے انسان داخلی اور خارجی دونوں دنیاؤں سے اثر پذیر ہوتا ہے اس لئے اس سے الدّین کے مطابق زندگی بسر کرانے کے لئے، اس نظامِ زندگی کو بار بار اس کے سامنے لانے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی یاددہانی اور تاکید کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ نظامِ اطاعت (یا ضابطہ قوانین) جو اس طرح بار بار اس کے سامنے لایا جائے ایسے مقام سے ملنا چاہیئے جو خارجی امیال وعواطف سے اثر پذیر نہ ہو۔ یہ مقام سوائے ذاتِ باری تعالیٰ کے اور کون ہو سکتا ہے؟ پھر یہ بھی دیکھئے کہ اشیائے کائنات میں سے کسی نے اپنے لئے خود قوانینِ حیات مرتب نہیں کئے۔ ہر ایک کو خالقِ فطرت کی طرف سے ضابطہ زندگی عطا ہوا ہے۔ اسی طرح انسان بھی اپنی زندگی کے لئے آپ قانون نہیں وضع کر سکتا۔ یہ اصول واساسات اسے خالقِ فطرت ہی کی طرف سے ملنے چاہئیں۔ اس لئے وہ خالقِ فطرت بذریعہ وحی اس قانون کو انسانوں تک پہنچاتا ہے اور جن مقدس حضرات کے واسطہ سے یہ قانون انسانوں تک پہنچتا ہے، انہیں انبیاء یا رسول (پیغامبر) کہا جاتا ہے۔ چنانچہ جب انسان نے عمرانی زندگی کی ابتدا کی اور حیاتِ اجتماعیہ کے مقتضیات وروابط نے اُبھرنا شروع کیا تو اس کے ساتھ ہی یہ سلسلہ پیغام رسانی بھی شروع ہو گیا۔

یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ اِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ رُسُلٌ مِّنْکُمْ یَقُصُّوْنَ عَلَیْکُمْ اٰیٰتِیْ ۙ فَمَنِ اتَّقٰی وَ اَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ○ (۷/۳۵)

(اور فرمانِ الٰہی ہوا تھا) اے نوعِ انسان! جب کبھی ایسا ہو کہ میرے پیغمبر تم میں پیدا ہوں اور میرا قانون تمہارے سامنے پیش کریں، تو جو کوئی ان قوانین کی نگہداشت کرے گا اور (اس طرح اپنے اندر ارتقائے انسانیت کی) صلاحیت پیدا کر لے گا۔ اس کے لئے کسی طرح کا اندیشہ نہ ہوگا، نہ کسی طرح کی غمگینی"۔

حضرات انبیائے کرامؑ کا منصب یہی نہیں ہوتا کہ وہ ان پیغاماتِ خداوندی کو لوگوں تک پہنچا دیں۔ ان کا

فریضہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ان قوانین کے مطابق معاشرہ کی تشکیل کریں، یعنی ایک ایسا نظام قائم کریں جس میں تمام امور کے فیصلے قوانینِ خداوندی کے مطابق ہوں۔ یہ نظام اس جماعت کے ہاتھوں وجود پذیر ہوتا ہے جس کے افراد، بطیبِ خاطر (دل کی پوری رضامندی سے) قوانینِ خداوندی کی صداقت پر ایمان لاتے ہیں۔ اس میں کسی قسم کا جور و اکراہ نہیں ہوتا۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ جب ان فیصلوں نے قانون کی حیثیت اختیار کرنی ہو تو ان کے نفاذ کے لئے قوت کی بھی ضرورت ہوگی۔ اس لئے کہ معاشرہ میں ایسے لوگ بھی تو ہوں گے جو ان فیصلوں کو پسند نہیں کریں گے جن سے ان کے مفاد پر زد پڑتی ہو۔ نیز ایسی قوتیں بھی ہوں گی جو اس نظام کی مخالفت کریں گی۔ ان تمام مقاصد کے لئے ضروری ہے کہ اس نظام کے پاس قوت بھی ہو۔ لہٰذا حضرات انبیائے کرامؑ محض مبلغ اور واعظ نہیں ہوتے تھے' ایک فعال نظام کے مرکز اور ایک مملکت کے صدرِ اعلیٰ بھی ہوتے تھے۔ سورۃ حدید میں ہے۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَ لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَ رُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝ (۵۷/۲۵)

بلاشبہ ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب (قانون) اور میزانِ عدل نازل کی تاکہ لوگ انصاف کے ساتھ قائم رہ سکیں اور ہم نے لوہے کو نازل کیا جس میں بڑی قوت ہے اور لوگوں کے واسطے بڑی بڑی منفعتیں ہیں۔ (اور یہ سب کچھ اس لئے بھی کیا گیا) تاکہ خدا (اور مرکزِ حکومتِ الٰہیہ) کو اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ کون خدا اور اس کے رسولوں کی بن دیکھے امداد کرتا ہے (اور کون نہیں کرتا)۔ بلاشبہ خدا بڑی قوت اور غلبہ والا ہے

لے دنیا میں قوت کا مظاہرہ ہمیشہ فولاد سے ہوتا رہا ہے خواہ وہ ازمنۂ قدیمہ کی تیغ و سناں اور زرہ و خود ہو اور خواہ دورِ حاضرہ کے ٹینک اور ہوائی جہاز۔ قوت کے ان مظاہر کی صورتیں بدلتی رہتی ہیں۔ لیکن فولاد کی حقیقت اپنی جگہ پر مستقلاً قائم و دائم ہے۔ اس لئے قرآنِ کریم نے قوت کے مفہوم کے لئے فولاد ہی کا جامع لفظ استعمال کیا ہے۔ کیونکہ اس کے اندر قوت کے مختلف شئون و صُوَر مصور ہیں۔

(اُسے تمہاری مدد کی ضرورت نہیں ہے بلکہ تمہاری امداد خود تمہاری بہبود کے لئے ہے!)۔

حکومتِ الٰہیہ جس نظام کے ماتحت کوئی قانون عملاً نافذ ہو اسے نظامِ حکومت کہتے ہیں اور جس حکومت کے ماتحت قوانینِ الٰہیہ کی تنفیذ ہو اسے حکومتِ الٰہیہ۔ لہٰذا حضرات انبیاء کرامؑ کا مقصدِ زندگی قیام و بقائے حکومتِ الٰہیہ تھا تاکہ دنیا سے انسانی تغلّب و استیلا (فساد) کو مٹا کر عدل و انصاف کی بساط بچھائیں۔

فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ قف وَ قَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَ الْحِكْمَةَ وَ عَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ۗ وَ لَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝ (۲/۲۵۱)

چنانچہ (ایسا ہی ہوا) انہوں نے قانونِ خداوندی کے مطابق اپنے دشمنوں کو ہزیمت دی اور داؤد کے ہاتھ سے جالوت مارا گیا۔ پھر اللہ نے داؤد کو بادشاہی اور حکمت سے سرفراز کیا اور (حکمرانی و دانشوری کی باتوں میں سے) جو کچھ سکھلانا تھا سکھلا دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر اللہ ایسا نہ کرتا کہ انسانوں کے ایک گروہ کے ذریعہ دوسرے گروہ کو راستے سے ہٹاتا رہے تو دنیا خراب ہو جاتی (اور امن و عدالت کا نشان باقی نہ رہتا) لیکن اللہ دنیا کے لئے فضل و رحمت رکھنے والا ہے۔

سب کی تعلیم ایک تھی ظاہر ہے کہ جب ان تمام حضرات انبیائے کرامؑ کا مقصدِ زندگی ایک تھا، مبدارِ علم (نبوت) ایک تھا، وہ قانون جس کی ترویج و تنفیذ کے لئے ان کی بعثت ہوئی تھی ایک تھا، تو ان میں باہمی اختلاف کیسے ہو سکتا ہے؟ ان میں کبھی اختلاف نہ تھا۔ ان کا پیغام ایک تھا، ان کی تعلیم ایک تھی، اُن کی منزل واحد تھی، ان کا منتہائے نگاہ ایک تھا۔ اس لئے کہ الدّین انسانوں کے لئے ایک ہے اور یہ حضرات اسی الدّین کی اشاعت و تنفیذ کے لئے آتے تھے۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَ مَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا

الدِّيْنَ وَ لَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ؕ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ؕ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ۝ (۱۳/۴۲)

(اور دیکھو) اللہ نے تمہارے لئے وہی دین مقرر کیا ہے جس کا اس نے نوح کو حکم دیا تھا اور جسے ہم نے (اے پیغمبرِ اسلام) تمہارے پاس وحی کے ذریعہ بھیجا ہے اور جس کا ہم نے ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کو حکم دیا تھا کہ اس الدّین کو (جو سب کے لئے واحد ہے) قائم رکھنا اور اس میں تفرقہ نہ پیدا کرنا۔

مشرکین کو یہ بات جس کی طرف تم انہیں دعوت دے رہے ہو بڑی ہی گراں گذری۔ (کیا یہ گرانی تم پر حسد کی وجہ سے ہے؟ اگر ایسا ہے تو اس میں تمہارا کیا قصور؟) اللہ جسے چاہتا ہے (نبوت کے لئے) برگزیدہ کر لیتا ہے اور جو اس کی طرف رجوع کرتا ہے اسے اپنی راہ دکھا دیتا ہے۔

نہ صرف کسی ایک زمانہ کے انسانوں کے لئے الدّین ایک تھا بلکہ ہر زمانہ میں ایک تھا۔ اس لئے کہ مستقل اقدار ہمیشہ یکساں رہتی ہیں۔ طبیعی دنیا میں دیکھئے۔ سنکھیا جس طرح حضرت نوحؑ کے زمانہ کے انسانوں کے لئے قاتل تھا اسی طرح آج بھی مہلک ہے۔ جس طرح افرنگ کے پریزاد انسان کے لئے مہلک ہے اسی طرح افریقہ کے حبشی کے لئے بھی زہر ہے۔ پانی جس طرح سامی النسل انسانوں کے لئے ممدّ حیات ہے اسی طرح ایرین اقوام کے لئے بھی معاونِ زندگی ہے۔ جس طرح انسان کی طبیعی زندگی کے خواص واثرات کی یہ کیفیت ہے اسی طرح اس کی عمرانی، معاشرتی، عائلی، سیاسی، غرضیکہ حیاتِ اجتماعیہ کے ہر گوشے کی یہی حالت ہے۔ جو چیز آج سے دس ہزار برس پیشتر انسان کے شجرِ حیات کی کسی شاخ کے لئے وجۂ شگفتگی و شادابی تھی وہی آج بھی باعثِ نزہت ولطافت ہے۔ جو ایران میں موجبِ افسردگی و پژمردگی تھی وہ یونان میں بھی باعثِ ہلاکت و بربادی تھی۔ اس لئے کہ انسانی تقاضے اختلافِ زمان ومکان سے مختلف نہیں ہو جاتے اور دو اور دو آج سے پانچ ہزار سال پیشتر بھی اسی طرح چار تھے جس طرح آج۔ اور افلاطون کی عقل اور فیثا غورث کے قواعد کی رُو سے بھی ان کا نتیجہ وہی چار تھا جو ایک دہقانی گنوار کے ٹھیکریوں سے گن لینے کا۔ لہٰذا ان حضرات انبیاء کرامؑ کی تعلیم کے اصول واساس ہمیشہ ایک تھے اور انہیں ایک ہونا بھی چاہیئے تھا۔ یہ اصول کیا تھے؟ پھیلائیے تو ان کے لئے کتابوں کی کتابیں درکار ہوں، لیکن سمٹانے سے فقط ایک نقطۂ توحید، یعنی یہ کہ خدا کے

نازل فرمودہ قوانین کے علاوہ کسی اور ضابطۂ قوانین کے تابع زندگی بسر کرنا کسی کے لئے جائز نہیں۔ بالفاظِ دیگر، محکومیت صرف اللہ کی جائز ہے۔ اس کے سوا کسی اور کی محکومیت (عبودیت) اختیار کرنا شرک ہے۔

نقطۂ توحید

قُلْ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَاْمُرُوْٓنِّيْٓ اَعْبُدُ اَيُّهَا الْجٰهِلُوْنَ ٥ وَلَقَدْ اُوْحِيَ اِلَيْكَ وَ اِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ٥ بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ وَ كُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ٥ (۳۹/۶۴-۶۶)

(اے پیغمبرِ اسلام!) تم کہو کہ کیا تم مجھے اس کا حکم دیتے ہو کہ میں خدا کے سوا کسی اور کی عبودیت (محکومیت و اطاعت) اختیار کر لوں؟ حالانکہ تمہاری طرف اور ان لوگوں کی طرف جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں، یہ وحی کر دی گئی ہے کہ اگر تم نے خدا کی محکومیت میں کسی اور کو شریک کر لیا تو تمہارے اعمال بے کار ہو جائیں گے۔ تم ان لوگوں میں ہو جاؤ گے جو خسارہ اور نقصان اٹھاتے ہیں۔ تم ہمیشہ اللہ کی عبودیت (محکومیت و اطاعت) اختیار کرو اور شکر گزار بندوں میں سے بن جاؤ!

یہ تھی مرکزی تعلیم۔ یہ تھا بنیادی پیغام۔ لیکن جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، ان حضرات کا کام فقط تبلیغ و رسالت (یعنی پیغام رسانی) نہ تھا۔ بلکہ عملاً اس نظام کو قائم کرنا تھا جس کی رُو سے عبدیت فقط قوانینِ الٰہیہ کی رہ جائے۔

مرکزِ حکومت کی اطاعت

اس نظام کے قیام کے لئے مرکزِ حکومت کی اطاعت نہایت ضروری تھی۔ اس لئے اس اصول کی نشر و اشاعت کے ساتھ یہ بھی ارشاد تھا کہ

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ٥ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ رَبِّيْ وَ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ٥ (۴۳/۶۳-۶۴)

پس قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو اور میری (یعنی مرکزِ حکومت کی) اطاعت کرو۔ بلاشبہ اللہ ہی میرا اور تمہارا پروردگار ہے۔ لہٰذا اُسی کی عبودیت (اطاعت و محکومیت) اختیار کرو۔ یہی سیدھا راستہ ہے!

یعنی قوانینِ الٰہیہ کی اطاعت انفرادی طور پر نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ یہ تو دیئے ہی اس لئے جاتے ہیں کہ انسان

کی حیاتِ اجتماعیہ میں نظم و ضبط قائم رکھ سکیں جس کا نتیجہ عدل و اصلاح ہو۔ یعنی ہر فرد کو وہ سب کچھ مل جائے جس کا وہ مستحق ہے اور ایسی فضا پیدا کر دی جائے جس میں اس کے جوہرِ انسانیت پوری طرح نشوونما پا کر اپنے اندر ایسی صلاحیت پیدا کر لیں جس سے یہ پیکرِ آب و گل اس دنیاوی زندگی سے اگلی زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکے اور یوں حال و مستقبل کی تمام سرفرازیاں اور کامرانیاں اس کے قدم چومیں۔ لیکن ایک مرتبہ اس حقیقت کو پھر اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ رسولوں کی یہ اطاعت ان کی ذات کی اطاعت نہ تھی۔ بلکہ حتماً و اصلاً اس ضابطۂ قوانین کی اطاعت تھی جو انہیں منجانب اللہ عطا ہوتا تھا۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَ بِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۙ (۳/۷۹)

کسی انسان کو یہ بات سزاوار نہیں کہ اللہ اُسے (انسان کی ہدایت کے لئے) کتاب اور حکومت اور نبوت عطا فرمائے اور پھر اس کا شیوہ یہ ہو کہ لوگوں سے کہے کہ خدا کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ (یعنی خدا کے احکام کی جگہ میرے حکموں کی اطاعت کرو) بلکہ وہ یہی کہے گا کہ تمہیں چاہیئے کہ ربّانی انسان بنو، اس کتاب کے ذریعے جس کی تم تعلیم دیتے رہتے ہو اور اس کے پڑھنے پڑھانے میں مشغول رہتے ہو۔

وہ خدا پر ایمان لانے کی منادی کرتے اور اسی کی اطاعت سکھاتے تھے۔

رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۖ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ كَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَ تَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ۚ (۳/۱۹۳)

خدایا! ہم نے ایک منادی کرنے والے کی منادی سُنی جو ایمان کی طرف بلا رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ لوگو! اپنے پروردگار پر ایمان لاؤ۔ تو ہم نے اس کی پکار سُن لی اور ایمان لے آئے۔ پس خدایا! ہماری حفاظت فرما۔ ہماری برائیاں مٹا دے اور (اپنے فضل و کرم سے) ایسا کر کہ ہماری موت نیک کرداروں کے ساتھ ہو!

خُدا کے عبد اور ان کی خود سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ اللہ کے محکوم اور غلام تھے۔

وَ اذْكُرْ عِبٰدَنَآ اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ اُولِى الْاَيْدِىْ وَ الْاَبْصَارِ ○ (۳۸/۴۵)

اور (اے پیغمبرِ اسلام!) کتاب میں ہمارے (فرمانبردار) بندوں میں سے ابراہیم اسحٰق اور یعقوب کا ذکر کرو جو قوت و سطوت اور دانش و بینش کے مالک تھے!

اسی کے غلام اور اسی کے محتاج۔

فَسَقٰى لَهُمَا ثُمَّ تَوَلّٰٓى اِلَى الظِّلِّ فَقَالَ رَبِّ اِنِّىْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَىَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ ○ (۲۸/۲۴)

دخترانِ شعیب کے لئے (بکریوں کو) پانی پلاکر موسیٰ سائے کی طرف واپس آگیا اور (خدا سے) مناجات کرنے لگا۔ "خدایا! جو کچھ بھی میری طرف تو بھلائی اتار دے میں اس کا محتاج ہوں!"

حتیٰ کہ وہ اپنی ذات کے لئے بھی نفع و نقصان کا اختیار نہیں رکھتے تھے۔

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِىْ نَفْعًا وَّ لَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ وَ لَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۛۚ وَ مَا مَسَّنِىَ السُّوْٓءُ ۛۚ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّ بَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ع (۷/۱۸۸)

(اے پیغمبر!) تم کہہ دو کہ میرا حال تو یہ ہے کہ خود اپنی جان کا نفع نقصان بھی اپنے قبضہ میں نہیں رکھتا بجز اس کے جو خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہو۔ اگر مجھے غیب کا علم ہوتا تو ضرور ایسا کرتا کہ بہت سی منفعت بٹور لیتا اور (زندگی میں) کوئی گزند مجھے نہ پہنچتا۔ میں اس کے سوا کیا ہوں کہ ماننے والوں کے لئے خبردار کرنے والا اور بشارت دینے والا ہوں!

لہٰذا ان سب کی تعلیم کی اساس و بنیاد یہی تھی کہ تمام دنیا کے خودساختہ قوانین و ضوابط سے منہ موڑ کر صرف ایک اللہ کی محکومیت اختیار کی جائے۔

وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِىْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ

لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ۝ (۲۱/۲۵)

اور (اے پیغمبر!) ہم نے تجھ سے پہلے کوئی پیغمبر ایسا نہیں بھیجا جس پر ہم نے اس بات کی وحی نہ بھیجی ہو کہ کوئی معبود (حاکم و مطاع) نہیں مگر میری ذات۔ پس چاہیئے کہ میری ہی عبودیت (محکومیت و اطاعت) اختیار کرو۔

ہر ایک آکر یہی کہتا تھا کہ

قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ (۵۹)

اے میری قوم کے لوگو! اللہ ہی کی عبودیت (محکومیت و اطاعت) اختیار کرو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود (حاکم اور مطاع) نہیں ہے۔

شریعت یعنی جزئیات

اساس و بنیاد سب کی تعلیم کی ایک تھی۔ البتہ اپنے اپنے زمانہ کے تقاضوں کے اعتبار سے تفاصیل و جزئیات میں فرق ہونا لازمی تھا۔ آج سے پانچ ہزار سال پیشتر دنیا کی حالت یہ تھی کہ ایک بستی کے رہنے والوں کی ضروریات کا دوسری بستی والوں پر اثر نہیں پڑتا تھا۔ لیکن آج یہ کیفیت ہے کہ ساری دنیا گویا ایک بستی میں سمٹ کر آگئی ہے اور زمان و مکان کے بُعد عہدِ پارینہ کی داستانیں بن چکی ہیں۔ اس لئے جن بین الاقوامی قوانین و ضوابط کی آج ضرورت ہے اُس زمانہ میں اُن کا خیال بھی نہیں آسکتا تھا۔ اس لئے ان تمام انبیاء کرامؑ کی تعلیم کی اصل و بنیاد جہاں ایک تھی تفاصیل و جزئیات کے اعتبار سے ان میں ارتقائی امتیاز ضروری تھا۔ بایں ہمہ اس حقیقت کو نظر انداز نہ ہونے دیجئے کہ ان تفاصیل کے اختلاف سے اصل حقیقت پر کچھ اثر نہیں پڑتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے طرق و انداز کے اختلاف کے باوجود اکثر و بیشتر مشترک اقدار کا ذکر کیا ہے۔

وَ اِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ قف وَ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّ ذِي الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنِ وَ قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ ط ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَ اَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝ (۲/۸۳ نیز ۵/۱۲؛ ۲۰/۱۴)

اور پھر (وہ وقت) یاد کرو جب ہم نے بنی اسرائیل سے (اتباعِ شریعت کا) عہد لیا تھا (وہ عہد کیا تھا؟ یہ) کہ اللہ کے سوا کسی اور کی عبودیت (محکومیت و اطاعت) اختیار نہ کرنا۔ ماں

باپ کے ساتھ احسان کرنا، عزیزوں قریبیوں کے ساتھ نیکی سے پیش آنا، یتیموں مسکینوں کی خبرگیری کرنا، تمام انسانوں سے اچھے طریق پر ملنا، نظامِ صلوٰۃ قائم کرنا، زکوٰۃ (یعنی نوعِ انسانی کی نشوونما) کا انتظام کرنا۔ لیکن تم اس عہد پر قائم نہیں رہے اور ایک قلیل تعداد کے سوا سب نے روگردانی کی اور حقیقت یہ ہے کہ (ہدایت کی طرف سے) کچھ تمہارے رُخ ہی پھرے ہوئے ہیں۔

تفریق بین الرسل چونکہ یہ تمام حضرات انبیائے کرامؑ ایک ہی سلسلۃ الذہب کی مختلف کڑیاں، ایک ہی آسمان کے درخشندہ ستارے اور ایک ہی شجرِ مقدس کی مختلف شاخیں تھیں، اس لئے ان کی رسالت و نبوت کے بارے میں ایک دوسرے میں قطعًا کوئی فرق نہ تھا، نہ فرق کیا جا سکتا ہے۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۚ (۲/۲۸۵)۔

اللہ کا رسول اس وحی پر ایمان رکھتا ہے جو اس کے پروردگار کی طرف سے اس پر نازل ہوئی ہے، اور جو لوگ (دعوتِ حق پر) ایمان لائے ہیں، وہ بھی اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ سب اللہ پر، اُس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اُس کے رسولوں پر ایمان لائے ہیں (اُن کے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں) کہ ہم اللہ کے رسولوں میں سے کسی کو دوسروں سے جدا نہیں کرتے (کہ ایک کو مانیں، دوسرے کو نہ مانیں یا سب کو مانیں مگر کسی ایک سے انکار کر دیں۔ ہم خدا کے تمام رسولوں کو یکساں رسول مانتے ہیں)۔

اس لئے کسی ایک رسول پر ایمان لانے والے کے لئے ضروری ہے کہ ان سب پر بلا تفریق و تمیز ایمان لائے۔

وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ لَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۠ (۴/۱۵۲)

اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے اور ان میں سے کسی ایک کو بھی دوسروں سے جُدا نہیں کیا (یعنی کسی ایک کی نبوت سے بھی انکار نہیں کیا) تو بلاشبہ ایسے ہی لوگ ہیں کہ (سچے مومن ہیں اور) عنقریب ہم انہیں ان کا اجر عطا فرمائیں گے۔ اور اللہ حفاظت کرنے والا' رحمت والا ہے!

فضیلت البتہ ان حضرات کے دوائرِ اثر و نفوذ اور خطائرِ تعلیم و تبلیغ میں فرق تھا۔ ایک رسول صرف ایک بستی کے لوگوں کی تنذیر و تبشیر کے لئے آتا لیکن دوسرا ایک عظیم الشان قوم کی اصلاح و ہدایت کے لئے۔ ایک کا مقابلہ اپنے قریہ کے چند شریر نفوس سے ہوتا اور دوسرا فراعنۂ وقت اور نمارید عصر کی طاغوتی قوتوں سے نبرد آزما ہوتا۔ اس اعتبار سے اُن کے مدارج و مناصب الگ الگ تھے اور ایک کو دوسرے پر فضیلت۔

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ م (۲/۲۵۳ نیز ۱۷/۵۵)

یہ ہمارے پیغمبر ہیں' جن میں سے بعض کو ہم نے بعض پر فضیلت دی ہے (یعنی اگرچہ پیغمبری کے لحاظ سے سب کا درجہ یکساں ہے' لیکن اپنی اپنی خصوصیتوں کے لحاظ سے مختلف درجے رکھتے ہیں)۔

بایں ہمہ اختلافِ مدارج و مراتب' یہ تمام حضرات ایک ہی برادری کے افراد تھے۔

وَ اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ اَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ (۲۳/۵۲)

اور دیکھو یہ تمہاری امت دراصل ایک ہی اُمت ہے اور تم سب کا پروردگار میں ہی ہوں۔ پس میرے قوانین کی نگہداشت کرو۔

بشریتِ رُسل اوپر لکھا جا چکا ہے کہ ان حضرات انبیاء کرامؑ کا مقصدِ بعثت یہ تھا کہ وہ لوگوں تک ان قوانین کو پہنچاتے جن کے مطابق زندگی بسر کرنے سے وہ شرفِ انسانیت کی تکمیل کر سکتے تھے۔ اور صرف پہنچاتے ہی نہیں بلکہ عملاً اس نظام کو قائم کرتے جس کے ماتحت وہ قوانین نافذ العمل ہوتے۔ اس مقصد کے لئے ضروری تھا کہ حضرات انبیاء کرامؑ انسان ہوتے۔ اس لئے کہ انسانی حیاتِ اجتماعیہ کے نظم و ضبط کے لئے انسان ہی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی

لئے فرمایا۔

قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْأَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ۝ (۱۷/۹۵)

کہو کہ اگر زمین پر فرشتے چلتے پھرتے سکونت پذیر ہوتے تو ہم آسمان سے کسی فرشتے کو رسول بنا کر بھیجتے۔ (لیکن چونکہ زمین میں انسان آباد ہیں اس لئے ان کے لئے انسانوں میں سے ہی رسول بنایا جا سکتا ہے)۔

لہٰذا تمام رسول انسان تھے اور انسانوں میں سے بھی صرف مرد۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى ؕ (۱۲/۱۰۹ نیز ۱۶/۴۳؛ ۲۱/۷)

اور (اے پیغمبر!) ہم نے تم سے پہلے کسی رسول کو نہیں بھیجا ہے مگر اسی طرح کہ وہ باشندگانِ شہر میں ہی سے ایک مرد تھا اور ہم نے اس پر وحی اتاری تھی (ایسا کبھی نہیں ہوا کہ آسمان سے فرشتے اُترے ہوں)۔

یہ حضرات دوسرے انسانوں کی طرح کھاتے پیتے اور بیوی بچّوں کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً ؕ ...... (۱۳/۳۸ نیز ۲۵/۲۰)

اور یہ واقعہ ہے کہ ہم نے تجھ سے پہلے بھی (بے شمار) پیغمبر قوموں میں پیدا کئے اور (وہ تیری ہی طرح انسان تھے) ہم نے انہیں بیویاں بھی دی تھیں اور اولاد بھی۔

سورۃ انبیاء میں ہے۔

وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ؕ اَفَاۡئِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ ۝ (۲۱/۳۴)

اور (اے ہمارے پیغمبر!) ہم نے تجھ سے پہلے کسی آدمی کو ہمیشگی نہیں دی (اور نہ تیرے لئے ہمیشہ زندہ رہنا ہے)۔ پھر اگر تجھے مرنا ہے تو کیا یہ لوگ ہمیشہ رہنے والے ہیں؟

لہٰذا ان میں الوہیت کا کوئی شائبہ یا مافوق البشر ہونے کا کوئی نشان نہ تھا۔ توہم پرست، کم فہم لوگ

اس بات پر معترض بھی ہوتے کہ رسول دوسرے انسانوں سے الگ تھلگ کچھ اور کیوں نہیں ہیں؟

فَقَالَ الْمَلَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ ۭ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً ښ مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ (۲۳/۲۴)

اس کی قوم کے جن سرداروں نے کفر کی راہ اختیار کی تھی، وہ یہ سُنکر (لوگوں سے) کہنے لگے، "یہ آدمی اس کے سوا کیا ہے کہ تمہارے ہی جیسا ایک آدمی ہے؟ مگر چاہتا ہے کہ تم پر اپنی بڑائی جتائے۔ اگر اللہ کو کوئی ایسی ہی بات منظور ہوتی تو وہ کیا فرشتے نہ اُتار دیتا (وہ ہماری ہی طرح کے ایک آدمی کو اپنا پیامبر کیوں بنانے لگا؟) ہم نے اپنے اگلے بزرگوں سے تو کوئی ایسی بات کبھی سُنی نہیں"۔

لیکن وہ اس حقیقت کو نہ سمجھتے کہ انہیں صحیح راستہ وہی دکھا سکتا ہے جو خود ان میں سے ہو۔ البتہ اسے مبداءِ فیض کی طرف سے یہ راستہ واضح اور بیّن طور پر (بذریعہ وحی) دکھا دیا گیا ہو۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ۝ (۱۸/۱۱۰)

(نیز) کہہ دے "میں تو اس کے سوا کچھ نہیں ہوں کہ تمہارے ہی جیسا ایک آدمی ہوں۔ البتہ اللہ نے مجھ پر وحی کی ہے کہ تمہارا معبود (یعنی حاکم و مطاع) وہی ایک ہے۔ اس کے سوا کوئی نہیں پس جو کوئی اپنے پروردگار سے ملنے کی آرزو رکھتا ہے، چاہیئے کہ اچھے کام انجام دے اور اپنے پروردگار کی عبودیت (اطاعت و محکومیت) میں کسی دوسری ہستی کو شریک نہ کرے"۔

رسول کی فضیلت یہی ہوتی ہے کہ جو علم اس کے پاس ہوتا ہے وہ کسی دوسرے کے پاس نہیں ہوتا۔

يٰٓاَبَتِ اِنِّىْ قَدْ جَآءَنِىْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْٓ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ۝ (۱۹/۴۳)

اے میرے باپ! میں سچ کہتا ہوں، علم کی ایک روشنی مجھے مل گئی ہے جو تجھے نہیں ملی۔

پس میرے پیچھے چل میں تجھے سیدھی راہ دکھاؤں گا۔

اور یہ علم (وحی) کسب و ہنر سے نہیں مل سکتا' اللہ کے چشمۂ فیض سے وہبی طور پر ملتا تھا۔

اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ۚ (۲۲/۷۵)

اللہ نے فرشتوں میں سے بعض کو (انبیاء کی طرف) پیام رسانی کے لئے برگزیدہ کر لیا۔ اسی طرح بعض انسانوں کو بھی (دوسرے انسانوں کی طرف پیغام پہنچانے کے لئے منتخب کر لیا)۔ بلاشبہ اللہ ہی ہے سننے والا' دیکھنے والا۔

اس موہبت کبریٰ میں نسلی امتیاز کو بھی کچھ دخل نہیں ہوتا۔

وَ اِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّيْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ ؕ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ ۝ (۲/۱۲۴)

اور (پھر غور کرو' وہ واقعہ) جب ابراہیم کے لئے اُس کے پروردگار نے خود ذات کے مواقع بہم پہنچائے تھے اور وہ ان میں پورا اُترا تھا۔ جب ایسا ہوا' تو خدا نے فرمایا' اے ابراہیم! میں تجھے انسانوں کے لئے امام بنانے والا ہوں۔ ابراہیم نے عرض کیا' جو لوگ میری نسل میں سے ہوں گے' ان کی نسبت کیا حکم ہے؟ ارشاد ہوا' جو ظلم و معصیت کی راہ اختیار کریں' تو ان کا میرے عہد میں کوئی حصہ نہیں!

نبوت دیئے جانے کا اہل کون ہے' اس کا انتخاب خدا کی طرف سے ہوتا۔ کوئی شخص اپنے کسب و ہنر سے نبوت حاصل نہیں کر سکتا تھا۔

يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اَنْ اَنْذِرُوْٓا اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاتَّقُوْنِ ۝ (۱۶/۲)

وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے' اس غرض سے چُن لیتا ہے کہ اپنے حکم سے فرشتہ الروح کے ساتھ اس پر بھیجے (یعنی وحی کیا تھ بھیجے) اور اسے حکم دے کہ لوگوں کو اس حقیقت سے خبردار کر دو کہ میرے سوا کوئی معبود (حاکم و مطاع) نہیں ہے۔ پس میرے ہی قوانین کی

نگہداشت کرو۔

ایک مرتبہ اس حقیقت کو پھر سمجھ لیجئے کہ رسول اپنی بشریت کے اعتبار سے دوسرے انسانوں جیسے ہوتے تھے۔ لیکن اپنی خصوصیتِ نبوت کے لحاظ سے دوسرے انسانوں سے بالکل الگ تھلگ۔ اس اعتبار سے حضرات انبیاء کرامؑ گویا اپنی ایک مخصوص نوع رکھتے تھے۔ یہ وہ حقیقت ہے جسے اب مغرب کے مفکرین بھی تسلیم کرتے ہیں۔ (KENNETH WALKER اپنی کتاب MEANING AND PURPOSE میں لکھتا ہے،

> یہ روحانی راہ نما دوسرے انسانوں سے اس قدر مختلف ہوتے ہیں کہ انہیں انسانوں کی ایک جداگانہ نوع کہنا چاہیئے۔ یہ اور صرف یہی وہ لوگ ہیں جو انسانی تجربہ کے اس مقام پر پہنچے ہوتے ہیں جو برگسان اور اوسپنسکی کے خیال کے مطابق 'انسانیت کا آخری مقام ہے۔ وہ صفات' جو انسان کو حیوان سے متمیز کرتے ہیں، یعنی شعور اور روحانی اقدار کا علم' ان میں اپنی تکمیل کو پہنچا ہوتا ہے۔ یہ لوگ درحقیقت حیات کی ایک نئی سطح پر جلوہ افروز ہوتے ہیں اور روحانی اعتبار سے دوسرے انسانوں سے اسی طرح مختلف ہوتے ہیں جس طرح تتلیاں ان پتنگوں سے مختلف ہوتی ہیں جن کی ارتقا یافتہ شکل وہ خود ہیں۔ برگسان کا خیال ہے کہ ہم حیات کے ارتقاء کو اسی صورت میں سمجھ سکتے ہیں جب ہم اسے اس نقطۂ نظر سے دیکھیں کہ یہ کسی ایسی منزل کی تلاش میں ہے جو اس کی دسترس سے باہر ہے' وہ منزل جس تک روحانیت والے انسان ہی پہنچ سکتے ہیں۔ اگر اس بلندی تک جس تک یہ مخصوص انسان پہنچ چکا ہے' تمام انسان یا انسانوں کی اکثریت بھی پہنچ سکتی تو فطرت نوعِ انسانی تک ہی رُک نہ جاتی۔ اس لئے کہ یہ انسان دوسرے انسانوں سے یقیناً آگے ہوتے ہیں۔ (P . 96)

اس مقام پر اس حقیقت کی وضاحت ضروری ہے کہ جہاں تک خدا سے نبوت پانے کا تعلق ہے' یہ چیز نبی کو اپنے کسب و ہنر کی بناء پر حاصل نہیں ہوتی تھی۔ وحی' خدا کی موہبت تھی۔ لیکن جب وہ اس وحی کو دوسرے انسانوں تک پہنچا دیتا' تو اس کے بعد' اس میں اور دوسرے انسانوں میں (انسان ہونے کی جہت سے) کوئی فرق نہ رہتا۔ اس کے بعد' وہ اپنی وحی کی روشنی میں جو محیّر العقول کارنامے کر کے دکھاتا'

وہ سب ایک انسان کی حیثیت سے کرتا۔ قرآنِ کریم نے حضرات انبیاء کرامؑ کی بشریت کے اظہار کو اس قدر اصرار و تکرار سے واضح اس لئے کیا ہے کہ دوسرے انسان یہ نہ خیال کر لیں کہ رسول نے جو کچھ کر کے دکھایا ہے وہ کسی مافوق الفطرت قوت کا کرشمہ ہے۔ اسے وہی کر سکتا تھا۔ عام انسان اس قسم کے کارنامے سرانجام نہیں دے سکتے۔ قرآن نے کہا کہ یہ تصور صحیح نہیں۔ رسول جو کچھ کر کے دکھاتا ہے وہ کچھ ہر وہ انسان کر کے دکھا سکتا ہے جو وحی کے اتباع سے اپنی صلاحیتوں کو بیدار کرے۔ رسولؐ کے محیّر العقول کارنامے درحقیقت یہ بتاتے ہیں کہ یہ انسانی ممکنات کا مظاہرہ ہے۔ (یہ وجہ ہے کہ میں نے نبی اکرمؐ کی سیرتِ طیبہ سے متعلق اپنی کتاب کا عنوان — معراجِ انسانیت — رکھا ہے، یعنی حضورؐ کی سیرت اس امر کا اعلان و اظہار ہے کہ انسان ان بلندیوں تک پہنچ سکتا ہے) یہی وہ مقصد ہے جس کے لئے رسول اللہؐ کی سیرت کو دوسرے انسانوں کے لئے اسوۂ حسنہ (بہترین نمونہ — ماڈل) قرار دیا گیا ہے۔ اگر دوسرے انسانوں کے لئے وہ کچھ کر دکھانا ممکن نہ ہوتا تو رسول کی زندگی ان کے لئے ماڈل کس طرح بن سکتی! رسول کی اطاعت بھی اس حیثیت سے ہوتی کہ وہ وحی کے مطابق قائم کردہ حکومت کا اوّلیں سربراہ ہوتا۔

اس عظیم الشان مقصد کو لے کر رسول آتا تھا۔ جب وہ آتا تو اس کے دائرۂ تبلیغ میں حالت یہ ہوتی کہ ہر شعبۂ زندگی میں خدائی قوانین کی جگہ انسانوں کے خودساختہ رسوم و آئینِ عمل بپا ہوتے۔ اسی کا نام فساد ہے۔

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِيْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ○ (۳۰/۴۱)

جو کچھ لوگوں نے اپنے ہاتھوں کیا دھرا اُس کی وجہ سے خشکی اور تری میں فساد پھیل رہا ہے (اور قانونِ مکافات اس کا مقتضی ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو اُن کے کئے کا نتیجہ دکھا دے۔ شاید (اس طرح) یہ لوگ غلط روش سے باز آجائیں!

تبشیر و تنذیر اس کا کام یہ ہوتا کہ وہ انسانوں کے خودساختہ غلط نظام کو توڑ پھوڑ کر رکھ دے۔ اس کی بنیادوں تک کو اکھیڑ دے اور اس کی جگہ بالکل نئی بنیادوں پر ایک جہانِ نو کی تعمیر کرے جس میں ہر شے قوانینِ خداوندی کے مطابق اپنی اپنی جگہ سرگرمِ عمل ہو۔ اس کے لئے وہ

انہیں غیر خدائی آئین و ضوابط کی ہلاکت سامانیوں سے آگاہ کرتا (تنذیر) اور آسمانی نظامِ زندگی کے درخشندہ نتائج کی بشارت دیتا۔ (تبشیر)۔

وَ مَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِیْنَ اِلَّا مُبَشِّرِیْنَ وَ مُنْذِرِیْنَ ۚ فَمَنْ اٰمَنَ وَ اَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝ وَ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا یَمَسُّهُمُ الْعَذَابُ بِمَا كَانُوْا یَفْسُقُوْنَ ۝ (۶/۴۸-۴۹ نیز ۱۸/۵۶)

اور (ہمارا قانون تو یہ ہے کہ) ہم رسولوں کو نہیں بھیجتے مگر اس لئے کہ (ایمان وعمل کی برکتوں کی) خوشخبری سنائیں اور (انکار و بدعملی کے نتائج سے) آگاہ کریں۔ پھر جو کوئی یقین لایا اور اس نے اپنے اندر صلاحیتِ عظیم پیدا کرلی، تو اس کے لئے نہ تو کسی طرح کا اندیشہ ہوگا، نہ کسی طرح کی غمگینی مگر جن لوگوں نے ہمارے قوانین کو جھٹلایا، تو فاسق ہونے کی وجہ سے ضروری ہے کہ ہمارے عذاب کی لپیٹ میں آجائیں۔

لیکن ظاہر ہے کہ اس دعوتِ انقلاب کی ہر طرف سے مخالفت ہوگی۔ جو لوگ دوسروں کے حقوق غصب کئے بیٹھے ہوں وہ بھلا کب چاہتے ہیں کہ شکار کا جانور ان کے پنجہ سے چھوٹ جائے۔ غیر خدائی نظام میں اربابِ قوت و حکومت، اصحابِ سرمایہ و دولت اور ارکینِ مذہب دونوں اپنی اپنی "خدائی" کی مسندوں پر متمکن ہوتے ہیں۔ رسول کی دعوت کا مفہوم یہی ہوتا ہے کہ خدا کے بندوں کو ان مستبد قوتوں کے پنجۂ قہاریت سے

مخالفت

چھڑا کر آزادی کی فضائے بسیط میں اذنِ بال کشائی دے۔ اس لئے ان کی طرف سے مخالفت ہوتی ہے اور سخت ترین مخالفت۔

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِیٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِیْنَ ؕ (۲۵/۳۱)

اور یوں مجرمین کا طبقہ ہر نبی کا دشمن ہوتا رہا۔

اور مجرمین کو دوسری جگہ مترفین کہا گیا ہے۔

وَ مَاۤ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّذِیْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَاۤ اِنَّا بِمَاۤ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝ (۳۴/۳۴)

اور (دیکھو) ہم نے کسی بستی میں (انکار و بدعملی کے نتائج سے) کوئی آگاہ کرنے والا نہیں بھیجا مگر ہمیشہ اس کے مفاد پرست لوگوں نے یہی کہا کہ جن تعلیمات کے ساتھ تمہیں بھیجا

گیا ہے ہم انہیں ماننے والے نہیں۔

مترفین کے معنی ہیں سہل انگاری اور عیش پسندی کی زندگی بسر کرنے والے۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ دوسروں کی کمائی پر زندگی بسر کرنے کے عادی ہو جائیں (خواہ وہ جاگیرداری کی شکل میں ہو یا فتوحاتِ خانقاہی کی صورت میں) انہیں جدوجُہد کی زندگی موت کی مصیبت دکھائی دے گی۔ اس لئے ان سب کی طرف سے اس دعوت کی مخالفت ہوگی۔ سرمایہ دار، جاگیردار، اربابِ حکومت و اقتدار، مسانیدِ فتاویٰ وارشاد کے اجارہ دار، تمام مُتحدہ و مُتفقہ طور پر اس آواز کو دبانے کے لئے محاذ قائم کرلیں گے۔ باقی رہے عوام، سو اُن کے جسم قیصریت کی زنجیروں میں جکڑے اور ان کے دل برہمنیت کے پھندوں میں پھنسے ہوتے ہیں۔ یہ ہوتی ہے وہ فضا جس میں ایک داعیٔ انقلاب دنیا کو حق پرستی کی طرف بلاتا ہے۔ اس سے اندازہ لگایئے کہ رسول کا مقصد کس قدر عظیم اور اس کی مہم کیسی صبر آزما اور زُہرہ گداز ہوتی ہے۔ ہجومِ مخالفت میں ایک بہت بڑا ہمت شکن مقام استہزاء کا ہوتا ہے۔ آپ نہایت متانت و سنجیدگی سے ایک بات کہتے ہیں، متوقع ہیں کہ دوسرا بھی متانت و سنجیدگی سے اس پر غور کرے گا، اپنے شکوک و شبہات کو پیش کرے گا۔ آپ ان کا تسکین بخش جواب دیں گے۔ اسے دعوتِ غور و فکر دیں گے، اس کی بصیرت کو اپیل کریں گے۔ اس راہ میں آپ کو کتنی ہی مشکلات پیش آئیں اور کتنا ہی زیادہ وقت کیوں نہ صرف ہو آپ ہمت نہیں ہاریں گے۔ لیکن اگر آپ کی متانت و سنجیدگی کے جواب میں آپ کا مذاق

استہزاء

اڑا دیا جائے، غور و فکر کے بجائے تمسخر و استہزاء سے پیش آیا جائے۔ آپ کی دعوتِ بصیرت افروز کا استقبال ایک حقارت آمیز ہنسی اور نفرت انگیز قہقہہ سے کیا جائے تو اس ہمت شکن اور صبر آزما مرحلہ سے گزرنے کے لئے کوہ تمثال استقلال اور فلک پیما حوصلہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ رسولوں کو سب سے پہلے اسی وادیٔ جگر سوز سے گذرنا پڑتا تھا۔

وَ لَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَمْلَيْتُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ۝ (۱۳/۳۲)؛ (نیز ۱۵/۱۱؛ ۴۳/۷؛ ۳۱/۴۱)۔

اور (اے پیغمبر!) تجھ سے پہلے بھی ایسا ہی ہو چکا ہے کہ پیغمبروں کی ہنسی اڑائی گئی اور ہم نے (اپنے مقررہ قانون کے مطابق) پہلے ان لوگوں کو ڈھیل دی، پھر گرفتار کر لیا۔ تو دیکھو، ہمارا ٹھہرایا ہوا بدلہ کیسا تھا اور کس طرح ظہور میں آیا؟

کبھی انہیں ساحر کہا جاتا، کبھی مجنون قرار دیا جاتا۔

كَذٰلِكَ مَآ اَتَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ۝ (۵۱/۵۲)

(اور دیکھو) اسی طرح ان سے پہلے بھی کوئی رسول نہیں آیا مگر (اُن کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا کہ) لوگوں نے کہا "یہ تو کوئی) ساحر ہے یا مجنون ہے"۔

"ساحر" کے معنی جادوگر ہی نہیں، جھوٹا اور فریب کار بھی ہیں۔ اس سے آگے بڑھتے تو ان کی عملاً تکذیب کی جاتی۔

وَ اِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّ عَادٌ وَّ ثَمُوْدُ ۝ (۲۲/۴۲ نیز ۲۴–۳۵/۲۵)؛ (۴۵/۳۴)۔

اور (اے پیغمبر!) اگر یہ (منکر) تجھے جھٹلائیں، تو (یہ کوئی نئی بات نہیں) ان سے پہلے کتنی ہی قومیں اپنے وقتوں کے رسولوں کو جھٹلا چکی ہیں، قومِ نوح، قومِ عاد، قومِ ثمود۔

اسلاف پرستی

دوسری طرف اربابِ مذہب (علماء و مشائخ) کو لیجئے۔ وہ اس دعوت کی تکذیب و تردید کے لئے اس سے زیادہ کسی دلیل کی ضرورت ہی نہ سمجھتے کہ یہ تعلیم اس روش کے خلاف ہے جو ان کے آباء و اجداد سے اُن تک متوارث چلی آئی ہے۔ یعنی اسلاف پرستی ہمیشہ حقیقت پرستی پر غالب آتی اور بزرگوں کی اندھی تقلید ہر سچائی کی مخالفت پر آمادۂ پیکار کر دیتی۔

بَلْ قَالُوْٓا اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّ اِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝ وَ كَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِىْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّ اِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ۝ (۲۲–۴۳/۲۳)

(انہوں نے سچائی کو قبول نہیں کیا) بلکہ کہنے لگے "کہ ہم نے اپنے آباء و اجداد کو ایک طریقہ پر چلتے پایا ہے اور ہم لوگ اُن کے نقوشِ قدم پر (چل کر) ہی ہدایت یاب ہو سکتے ہیں"۔ اور (اے پیغمبر!) ہم نے تجھ سے پہلے کسی آبادی میں کوئی (انکار و بدعملی کے نتائج سے) آگاہ کرنے والا نہیں بھیجا مگر (ہمیشہ) اس کے عیش پسند اور تن آسان لوگوں نے یہی کہا "ہم نے اپنے آباء و اجداد کو ایک طریقہ پر چلتے پایا ہے اور ہم لوگ اُن کے نقشِ قدم کی پیروی کرتے رہیں گے"۔

غور کیجئے. یہاں اسلاف پرستی اور کورانہ تقلید کی روش پر چلنے والوں کو بھی مُتْرَفِیْنَ کہا گیا ہے. اس لئے کہ غور و فکر کے بعد کسی راہِ عمل کو اختیار کرنے کے لئے بڑی محنت اور ذہنی جدّوجُہد کی ضرورت ہوتی ہے. اس کے برعکس تقلید کی لکڑی کے سہارے کسی متوارث روش پر آنکھیں بند کرکے چلے جانا نہایت آسان ہے. اس لئے آپ نے دیکھا ہوگا کہ جو لوگ اسلاف پرستی کی راہیں اختیار کئے ہوں ان کے قوائے عملیہ مفلوج اور ذہن کی فکری صلاحیتیں معطل ہو جاتی ہیں. وہ تن آسانی اور سہل انگاری کی زندگی کے عادی بن جاتے ہیں اور مجاہدانہ روش انہیں مصیبت نظر آتی ہے (خواہ یہ جدّوجہد جسمانی ہو یا ذہنی) اُسی طرح جیسے ایک خاندانی امیر کو (جس نے دولت کو خود نہ کمایا ہو بلکہ بلا استعداد و اہلیت ورثہ میں پا لیا ہو) محنت و مشقت کی سپاہیانہ زندگی چھلاوا بن کر ڈراتی ہے. قرآن کریم نے جہاں (پہلی آیات میں) اس قسم کے سہل انگاروں اور عیش پسندوں کو مترفین کہا ہے وہاں (مؤخر الذکر آیات میں) اسلاف پرستی کی روش میں ذہنی سہل انگاری کی زندگی بسر کرنے والوں کو بھی مترفین قرار دیا ہے. ویسے بھی مذہبی راہ نما خود کوئی کام نہیں کرتے. وہ دوسروں کی کمائی پر جیتے ہیں اور اس انداز سے کہ لوگ انہیں نذرانے بھی دیتے ہیں اور پاؤں بھی چومتے ہیں. لیکن قرآن نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ اس روشِ زندگی کا انجام ہلاکت اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا.

فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ۞

(۴۳/۲۵)

چنانچہ ہم نے اُنہیں اُن کی غلط روش کی سزا دی، تو (اے پیغمبر!) دیکھو ان جھٹلانے والوں کا انجام کیسا رہا؟

مُترفین

مترفین کے ٹکڑے پر ایک بار پھر غور کیجئے. یہ وہ تن آسانی کی زندگی بسر کرنے والے ہیں جو دوسروں کی محنت کی کمائی سے اپنی عیش پرستی کے سامان فراہم کرتے ہیں. قرآن کریم نے انہیں دو جماعتوں میں تقسیم کیا ہے. ایک مجرمین، جو اپنی کثرتِ مال و اولاد (قوت و حشمت) پر نازاں ہوتے ہیں اور دوسرے اربابِ مذہب (علماء و مشائخ) جو اسلاف پرستی کے مقدس نقاب میں حق کی مخالفت کرتے ہیں. تاریخِ عالم پر غور کیجئے. دعوتِ انقلاب کی مخالفت ہمیشہ انہی دو گوشوں سے اُبھرتی نظر آئے گی. ایک گوشہ ملکیت والوں کا (خواہ وہ قیصر ہو یا سرمایہ دار) اور دوسرا گوشہ مذہبی پیشواؤں کا (خواہ وہ اربابِ شریعت ہوں یا ارکانِ طریقت). اس لئے کہ یہ دونوں گوشے دوسروں کی گاڑھے پسینہ کی کمائی پر تن آسانی اور سہل انگاری

کی زندگی بسر کرنے کے خوگر ہوتے ہیں۔ ذرا اندازہ لگایئے کہ ایک شخص دس ہزار ایکڑ قطعۂ اراضی کا مالک ہے جو اسے بلا محنت و مشقت ورثہ میں مل گئی ہے۔ ہزاروں کاشت کار صبح سے شام کپکپاتے جاڑے اور چلچلاتی دھوپ میں لہو پانی ایک کردیتے ہیں۔ لیکن ان کے حصہ میں سوکھے ٹکڑے بھی نہیں آتے اور یہ تن آسان (مترف) حریر و اطلس کے نرم و نازک لباسوں میں ملفوف، افرنگی صوفوں اور ایرانی قالینوں پر بیٹھنے والا بلا محنت و مشقت ان غریبوں کا خون چوس لیتا ہے۔ یہ قیصریت کی ایک چھوٹی سی جھلک ہے۔ دوسری طرف برہمنیت کو دیکھئے تو ان کا غلبہ و استیلا، قیصریت سے بھی بڑھ کر محکم اور استوار ہوتا ہے۔ قیصریت کی حکومت جسموں پر ہوتی ہے اور اسے قائم رکھنے کے لئے بہت سی تدابیر کرنی پڑتی ہیں۔ لیکن برہمنیت کی حکومت دلوں پر ہوتی ہے اور اس کے لئے سوائے اس کے کہ عوام کو اندھی عقیدت اور اوہام پرستی کی جہالت میں رکھا جائے اور کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ قیصریت کو پھر بھی یہ فکر دامنگیر رہتی ہے کہ محکوم کہیں اپنی زنجیریں توڑ کر بھاگ نہ جائے۔ لیکن برہمنیت کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ اگر کسی اسیر حلقۂ عقیدت کی زنجیر کو توڑ بھی دیجئے تو وہ آنسوؤں سے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں اور لرزتے ہوئے دل سے گڑگڑاتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ اس ٹوٹی ہوئی زنجیر کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو مژگانِ عقیدت سے چنتا اور زنجیر کو کسی نہ کسی طرح جوڑ کر نہایت عجز و الحاح سے پھر اپنے گلے میں ڈال لیتا ہے۔ سوچئے کہ اس گوشۂ برہمنیت (خانقاہیت و ملائیت) سے حضرات انبیاء کرامؑ کے پیغام انقلاب کی مخالفت کیوں نہ ہوگی؟ اس لئے کہ دعوتِ انقلاب میں تمام مترفین (دوسروں کی کمائی پر تن آسانی کی زندگی بسر کرنے والوں) کی موت پوشیدہ ہوتی ہے۔ لہٰذا قیصریت اور خانقاہیت دونوں کی طرف سے اس کی مخالفت ہوتی ہے اور سخت ترین مخالفت۔ اور بسا اوقات یہ دونوں مل کر اس دعوت کے خلاف متحدہ محاذ قائم کرلیتے ہیں۔ قیصریت کے پاس مادّی قوت موجود ہوتی ہے لیکن برہمنیت کے پاس اس سے بھی کہیں زیادہ مؤثر حربے ہوتے ہیں۔ وہ عوام کو یہ کہہ کر مشتعل کرتے ہیں کہ دیکھو! یہ شخص کہتا ہے کہ وہ طریقہ جس پر تمہارے آباء و اجداد، تمہارے بڑے بزرگ، مقدس اسلاف چلتے آئے ہیں، وہ طریقہ غلط ہے۔ میرا طریقہ صحیح ہے! یہ ایسا حربہ ہے کہ اس میں نہ کسی مادّی قوت کی ضرورت پڑتی ہے نہ دلیل و برہان کی۔ انہوں نے عوام کے دلوں پر اسلاف پرستی کی عقیدت اس درجہ گہرے طریق پر نقش کر رکھی ہوتی ہے کہ اُن کے جذبات فوراً مشتعل ہوجاتے ہیں اور وہ اپنی پوری قوتوں کے ساتھ اس دعوت کی مخالفت پر اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ چونکہ قیصریت، برہمنیت کی اس قوت سے واقف ہوتی ہے، اس لئے وہ اس

کے ساتھ گہرا گٹھ جوڑ رکھتی ہے کھشتری (راجہ) برہمن کی رکھشا (حفاظت) کرتا ہے اور برہمن اسے ایشور کا اوتار قرار دے کر اسے اشیر باد دیتا ہے۔ پادری' بادشاہ کو "ایمان کا محافظ" DEFENDER OF FAITH قرار دے کر اس کے الوہیاتی حقوق DIVINE RIGHTS کا مبلغ بنتا ہے اور بادشاہ' کلیسا کے لئے جاگیریں وقف کرتا ہے۔ مُلّا سلاطین کو ظل اللہ علی الارض (زمین پر خدا کا سایہ) قرار دے کر محراب و منبر پر اس کے حق میں دعائیں کرتا ہے اور سلطان ان کے وظیفے مقرر کرتا ہے۔ یہ سلسلہ شروع سے اسی طرح چلا آتا ہے۔ قیصریت' داعیٔ انقلاب کے مقابلہ میں خود آگے نہیں بڑھتی' برہمنیت کو پیش پیش رکھتی ہے۔ آپ نے نہیں دیکھا کہ صاحبِ ضربِ کلیم کے مقابلہ میں فرعون خود نہیں آیا۔ اس نے ہامان کے جیوش و عساکر کو آگے کیا تھا۔

اس سے آپ نے یہ بھی اندازہ لگا لیا ہوگا کہ حضرات انبیاء کرامؑ کی دعوت سے مقصود فقط چند اخلاقی ضوابط کا پیش کرنا یا پوجا پاٹ (پرستش) کی چند رسومات کا رائج کرنا نہیں ہوتا بلکہ اس پورے نظام کو الٹ دینا ہوتا ہے جس کی رُو سے مجرمین کے گروہ انسانی حقوق کو غصب کئے ہوتے ہیں۔ وہ نوعِ انسانی کے غصب شدہ حقوق کو ان غاصبوں کے دستِ تغلّب سے چھین کر اس مقام میں بطور امانت رکھ دیتے ہیں جہاں سے ان کی تقسیم صحیح عدل و انصاف کے خطوط پر ہوتی ہے۔ ورنہ آپ سمجھتے ہیں کہ اگر حضرات انبیاء کرامؑ کی دعوت سے مقصود فقط اتنا ہو کہ لوگو! جھوٹ نہ بولو، زنا مت کرو، ایک گوشہ میں بیٹھ کر یوں اللہ اللہ کر لیا کرو۔ تو دنیا میں کون ہے جو اس تعلیم کی یوں مخالفت کرے گا؟ اس میں شبہ نہیں کہ وہ اخلاق کے ضوابط بھی سکھاتے ہیں۔ لیکن اس سے مقصد اسی قسم کے انسان تیار کرنا ہوتا ہے جو اپنی سیرت کی پاکیزگی اور کردار کی بلندی سے' قوانینِ خداوندی کو دنیا میں عملاً رائج کرنے کے قابل ہو سکیں۔ چونکہ حضرات انبیاء کرامؑ کو اس قسم کے سرکش مجرمین کے تغلّب و تسلّط کو توڑ کر اس کی جگہ نظامِ خداوندی کو قائم کرنا ہوتا ہے اس لئے اس عظیم الشان مقصد کے لئے انہیں بڑی قوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی لئے فرمایا کہ

وَ اذْكُرْ عِبٰدَنَآ اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ اُولِي الْاَيْدِيْ وَ الْاَبْصَارِ ۝ (۳۸/۴۵)

اور (اے پیغمبر! کتاب میں) ہمارے مخلص بندوں ابراہیم' اسحاق اور یعقوب کا ذکر کرو جو صاحبِ قوت اور مالکِ بصیرت تھے۔

قوتوں کے مالک

اس میں کسے کلام ہے کہ جہاں تک سیرت و کردار کی قوتوں کا تعلق ہے حضرات انبیاء کرام شرفِ انسانیت کے معراجِ کمال پر ہوتے تھے۔ لیکن وہ انقلاب جو ان کے ہاتھوں سے معرضِ وجود میں آنے والا ہوتا تھا اس کے لئے خارجی (مادی) قوتوں کی بھی ضرورت ہوتی تھی۔ کیرکٹر کی قوت بہت بڑی قوت ہے۔ اور پھر "کیرکٹر" بھی محض مغربی اصطلاح میں نہیں بلکہ وہ سیرت جو تقوٰے سے مستحکم ہوتی ہو۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ مادی قوتیں بھی لاینفک ہیں۔ اگر یہ انقلاب محض سیرت کی قوتوں سے پیدا ہو سکتا، تو حضرات انبیاء کرامؑ اور ان کے رفقاء کی مقدس جماعتوں کو اُولی الایدی (اصحابِ دست و بازو) ہونے کی ضرورت نہ تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس باب میں ان حضرات کا مسلک ایک عجیب و غریب امتزاج سامنے لاتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اگر منتہائے نگاہ محض "تزکیۂ نفس" کی رُو سے انفرادی نجات سمجھا جائے تو یہ رہبانیت ہے۔ اگر مادی قوتوں کو قوانینِ خداوندی سے الگ کر دیا جائے تو یہ چنگیزیت۔ اور

مادی قوتیں

اگر ان دونوں کو یکجا کر دیا جائے تو یہ اسلام ہے۔ اس لئے حضرات انبیاء کرامؑ کی تعلیم کی رُو سے تقوٰے اور مادی قوتوں دونوں کا ساتھ ساتھ چلنا نہایت ضروری ہے۔ ایسی مادی قوتیں جن کے متعلق فرمایا۔

وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ○ (۸/۶۰)

اور (مسلمانو!) جہاں تک تمہارے بس میں ہے قوت پیدا کر کے اور گھوڑے تیار رکھ کر دشمنوں کے مقابلہ کے لئے اپنا ساز و سامان مہیا کئے رہو کہ اس طرح مستعد رہ کر تم اللہ کے (کلمۂ حق کے) اور اپنے دشمنوں پر اپنی دھاک بٹھائے رکھو گے، نیز ان لوگوں کے سوا اوروں پر بھی جن کی تمہیں خبر نہیں۔ اللہ انہیں جانتا ہے۔ اور (یاد رکھو) اللہ کی راہ میں (یعنی جہاد کی تیاری میں) تم جو کچھ بھی خرچ کرو گے وہ تمہیں پورا پورا مل جائے گا۔ ایسا نہ ہو گا کہ تمہاری حق تلفی ہو۔

برّ و بحر (خشکی اور تری۔ حکومت اور مذہب) کی ان فساد انگیزیوں میں خدا کا رسولؑ اپنی دعوتِ انقلاب

لے کر اُٹھنا اور مخالفتوں کے اس ہجوم اور مزاحمتوں کی اس یورش میں اپنی پکار کو برابر جاری رکھنا اُس لئے کہ استقامت و استقلال اور ہمت اور حوصلہ ان حضرات کی سب سے بڑی خصوصیت تھی۔

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَ لَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ ۚ كَأَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَ مَا يُوعَدُونَ ۙ لَمْ يَلْبَثُوا إِلَّا سَاعَةً مِّن نَّهَارٍ ۚ بَلَاغٌ ۚ فَهَلْ يُهْلَكُ إِلَّا الْقَوْمُ الْفَاسِقُونَ ﴿۴۶/۳۵﴾

(تو اے پیغمبرِ اسلام!) تم بھی (ان لوگوں کی مخالفت کے علی الرغم) اسی طرح ثابت قدم رہو جیسے (تم سے پہلے بہت سے اولوا العزم پیغمبر ثابت قدم رہے ہیں۔ ان کے لئے (مکافاتِ عمل میں) جلدی نہ کرو، جس دن وہ عذاب انہیں نظر آئے گا جس سے انہیں آگاہ کیا گیا ہے تو (ان کا اس طرح نام و نشان مٹ جائے گا) گویا وہ (دنیا میں) دن کے ایک گھنٹہ سے زیادہ ٹھہرے ہی نہیں۔ (یاد رکھو) یہ ایک اظہارِ حقیقت ہے (فرضی دھمکی نہیں ہے) چنانچہ صرف نافرمان قومیں ہی ہیں جو ہلاک کر دی جایا کرتی ہیں۔

نصرتِ خداوندی

یاؤں میں استقامت اور نگاہیں قوانینِ خداوندی کے نتائج کی طرف۔ اسی کو خدا کی نصرت کہتے ہیں۔

أَمْ حَسِبْتُمْ أَن تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَ لَمَّا يَأْتِكُم مَّثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِن قَبْلِكُم ۖ مَّسَّتْهُمُ الْبَأْسَاءُ وَ الضَّرَّاءُ وَ زُلْزِلُوا حَتَّىٰ يَقُولَ الرَّسُولُ وَ الَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتَىٰ نَصْرُ اللَّهِ ۗ أَلَا إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ قَرِيبٌ ﴿۲/۲۱۴﴾

پھر کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ (محض ایمان کا زبانی دعوےٰ کر کے) تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے (اور مومن ہونے کے لئے سعی و عمل کے میدان میں کامیاب ہونا ضروری نہیں؟) حالانکہ ابھی تو تمہیں ان تصادمات کا سامنا ہی نہیں کرنا پڑا جو تم سے پہلے لوگوں کو پیش آ چکے ہیں۔ ہر طرح کی سختیاں اور محنتیں انہیں پیش آئیں۔ شدتوں اور ہولناکیوں سے اُن کے دل دہل گئے۔ یہاں تک کہ اللہ کے رسول اور جو لوگ ایمان لائے تھے پکار اٹھے "نصرتِ الٰہی! تراوقت

کب آئے گا؟" (اور اپنے وقت پر خدا کی نصرت یہ کہتی ہوئی نمودار ہوگئی) " ہاں گھبراؤ نہیں، خدا کی نصرت تم سے دُور نہیں!"

قوم کی طرف سے مخالفت اور مزاحمت کی انتہا ہو جاتی (۴۰/۵۱)، لیکن ان کے پائے استقلال میں ذرا لغزش نہ آتی۔

وَ لَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَ اُوْذُوْا حَتّٰۤى اَتٰىهُمْ نَصْرُنَا ۚ وَ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ وَ لَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِی الْمُرْسَلِیْنَ ۝ (۶/۳۴)

اور (دیکھو) یہ واقعہ ہے کہ تم سے پہلے بھی خدا کے رسول جھٹلائے گئے۔ سو انہوں نے لوگوں کے جھٹلانے اور اذیّت دینے پر استقامت کا ثبوت دیا۔ یہاں تک کہ (بالآخر) ہماری مدد آپہنچی۔ اور (یاد رکھو، یہ اللہ کا مقرر کردہ قانون ہے)۔ کوئی نہیں جو اس کی (ٹھہرائی ہوئی) باتوں کو بدل دینے والا ہو۔ اور رسولوں کے حالات میں سے بعض کے حالات تو تم تک پہنچ ہی چکے ہیں۔

مصالحت کی کوشش

جب مخالفت سے کام نہ چلتا تو مخالفین کی طرف سے کوشش کی جاتی کہ رسول اپنے اصولوں میں کچھ تبدیلی کردیں اور ان کی غلط روش کی کچھ رعایت رکھ دیں۔ کچھ وہ جھکیں، کچھ یہ بڑھیں اور یوں بین بین ان سے صلح کر لی جائے۔ لیکن حق تو کہتے ہی اسے ہیں جو اپنی جگہ پر اٹل ہو۔ اس لئے اس کی باطل سے مفاہمت کیسی؟ کیا آپ نے کبھی روشنی اور اندھیرے میں مفاہمت کا سُنا ہے؟ حق اور باطل کی آمیزش ناممکن ہے۔ یعنی یہ اصول ہی غلط ہے کہ اگر ۵۱ فی صد حق اور ۴۹ فی صد باطل ہو تو اس کا نام حق ہوگا۔ ۵۱ تو ایک طرف، اگر ۹۹ فی صد حق اور ایک فیصد باطل ہو تو بھی وہ حق نہیں کہلا سکتا۔ حق کا دعویٰ ہے کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں۔ باطل کہتا ہے کہ دو اور دو تین ہوتے ہیں۔ فرض کیجئے ان میں مفاہمت کی صورت نکالی جائے تو یہی کہہ سکیں گے کہ کچھ حق نیچے اترے، کچھ باطل آگے بڑھے اور فیصلہ اس پر ہو کہ دو اور دو ساڑھے تین ہوتے ہیں۔ کہیے اس کا نام حق ہوا یا باطل کا باطل ہی رہا؟ اس لئے حق اور باطل میں جب بھی مفاہمت ہوگی وہ باطل کی فتح اور حق کی شکست ہوگی۔ اس لئے کہ حق اسی وقت تک حق ہے جب تک اپنے مقام پر اٹل اور محکم قائم ہے۔ اس نے اپنی جگہ چھوڑی اور باطل قرار پاگیا۔ یہی وجہ ہے کہ حق میں کبھی لچک نہیں ہوتی۔ وہ مداہنت جانتا ہی نہیں۔ اگر اس نے کبھی

[1] فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر دیکھئے۔

ایسا کر لیا تو اس کا نتیجہ فساد ہی فساد ہوگا. زمین، چاند، سورج اور دیگر اجرام سماوی کی ایک خاص انداز کے مطابق گردش اور حرکت 'حق' ہے. اگر وہ باطل سے مفاہمت کر کے اپنی گردش اور رفتار میں تھوڑی سی تبدیلی بھی پیدا کر لیں تو جو نتیجہ بر آمد ہوگا اُسے فساد کے علاوہ اور کیا کہیں گے؟ اور جب خارجی کائنات میں حق و باطل کی مفاہمت و مداہنت کا نتیجہ یہ نکلے گا تو کیا انسانوں کی دنیا میں اس کا نتیجہ کچھ اور نکل سکے گا؟ یہ ناممکن ہے. اسی لیے فرمایا:

وَ لَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ وَ مَنْ فِيْهِنَّ ؕ بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ؕ (۲۳/۷۱)

اور اگر ایسا ہوتا کہ حق لوگوں کی خواہشوں کی پیروی کرتا، تو یقیناً آسمان و زمین اور وہ سب جو ان میں ہے یک قلم درہم برہم ہو جاتا. ہم نے اُن کے لیے ان کی نصیحت کی بات مہیا کر دی. تو یہ اپنی نصیحت کی بات سے اعراض برت رہے ہیں.

لہٰذا رسولؑ باطل کی طاغوتی قوتوں کے ساتھ (خواہ وہ تاجِ شاہی ہو یا مسندِ خانقاہی) کبھی مفاہمت نہیں کر سکتا. اس کا اعلان یہ ہوتا ہے.

اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَ مِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ز كَفَرْنَا بِكُمْ وَ بَدَا بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَ الْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ...... (۶۰/۴)

(یاد رکھو) ہم تم سے اور تمہارے ان آقاؤں اور حاکموں سے جن کی تم خدا کے علاوہ اطاعت و پیروی کرتے ہو (قطعاً) بری الذمہ ہیں. ہم تمہارے مسلک کا انکار کرتے ہیں اور ہمارے

(سابقہ صفحے کا فٹ نوٹ). علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں:

"اسلام ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کے اصول کی حیثیت میں کوئی لچک اپنے اندر نہیں رکھتا اور ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کے کسی اور آئین سے کسی قسم کا راضی نامہ یا سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں. بلکہ اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ ہر وہ دستور العمل جو غیر اسلام ہو نامعقول اور مردود ہے." (مولانا حسین احمد کے نظریۂ وطنیت کے جواب میں بیان)

تمہارے درمیان عداوت اور بغض ہمیشہ کے لئے واضح اور آشکار ہو چکا ہے تا آنکہ تم لوگ (اپنی اس کجروی سے باز آکر) خدائے یگانہ و یکتا پر ایمان لے آؤ!

اس لئے کہ رسول کی دعوت یہ ہوتی ہے کہ تمام انسانی قوانین سے منہ موڑ کر فقط ایک اللہ کے آئین کی محکومیت اختیار کی جائے۔ اگر وہ اس پر راضی ہو جائے کہ کچھ معاملات میں خدا کا قانون اور کچھ میں انسانوں کا قانون نافذ العمل ہو تو یہ شرک ہے یعنی خدا کی حکومت میں دوسروں کو شریک کرنا[1]

وَ اِنَّ الشَّیٰطِیۡنَ لَیُوۡحُوۡنَ اِلٰۤی اَوۡلِیٰٓئِهِمۡ لِیُجَادِلُوۡکُمۡ ۚ وَ اِنۡ اَطَعۡتُمُوۡهُمۡ اِنَّکُمۡ لَمُشۡرِکُوۡنَ ؑ (۶/۱۲۱)

اور (دیکھو) شیطان تو اپنے مددگاروں کے دلوں میں وسوسے ڈالتے رہتے ہیں تاکہ تم سے کج بحثی کریں۔ اگر تم نے ان کا کہا مان لیا، تو پھر سمجھ رکھو تم بھی شرک کرنے والوں میں ہو۔

اور اس کا نتیجہ جہنم۔

ذٰلِکَ مِمَّاۤ اَوۡحٰۤی اِلَیۡکَ رَبُّکَ مِنَ الۡحِکۡمَۃِ ؕ وَ لَا تَجۡعَلۡ مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ فَتُلۡقٰی فِیۡ جَهَنَّمَ مَلُوۡمًا مَّدۡحُوۡرًا ﴿۱۷/۳۹﴾

(اے پیغمبر!) یہ اُن حکمت کی باتوں میں سے ہیں جو تیرے پروردگار کی جانب سے تجھ پر وحی کی گئی ہیں اور (تمام باتوں کی اصل یہ ہے کہ) اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا آقا اور حاکم نہ ٹھہراؤ کہ بالآخر دوزخ میں ڈالے جاؤ، ملامت کے مستوجب اور ٹھکرائے ہوئے!

سورۂ شعراء میں ہے۔

فَلَا تَدۡعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ فَتَکُوۡنَ مِنَ الۡمُعَذَّبِیۡنَ ۚ

(۲۶/۲۱۳)

چنانچہ (اے پیغمبر!) اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا آقا اور حاکم نہ ٹھہراؤ کہ اس طرح تم عذاب دیئے ہوئے لوگوں میں سے ہو جاؤ گے!

---

[1] وَّ لَا یُشۡرِکُ فِیۡ حُکۡمِهٖۤ اَحَدًا (۱۸/۲۶) اللہ اپنی حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ اور مومن کا شیوہ یہی ہے کہ ــــ وَّ لَا یُشۡرِکۡ بِعِبَادَۃِ رَبِّهٖۤ اَحَدًا ع (۱۸/۱۱۰)
وہ اپنے ربّ کی حاکمیت میں کسی کو شریک نہیں کرے۔

لہذا رسولؑ ان سرکش قوتوں سے کسی قسم کی مفاہمت نہ کرتا۔ وہ مصیبتوں کے ہجوم اور مخالفتوں کے سیلاب میں اپنی دعوت کو برابر جاری رکھتا، بے غل وغش اور بے کم وکاست۔

وَ مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ ؕ وَ مَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝ (۳/۱۶۰)

اور (دیکھو) خدا کے نبی سے یہ بات کبھی نہیں ہوسکتی کہ وہ (ادائے فرضِ نبوت میں) کسی طرح کی خیانت کرے (کیونکہ جو نبی ہوگا وہ خائن نہیں ہوسکتا) اور جو کوئی خیانت کرتا ہے تو جو کچھ اس نے خیانت کی ہے (اُسے دنیا میں لوگوں کی نظروں سے کتنا ہی چھپائے لیکن) قیامت کے دن نہیں چھپا سکے گا۔ وہ اس کے ساتھ آئے گی۔ پھر ہر جان کو اس کی کمائی کے مطابق پورا پورا بدلہ ملتا ہے۔ یہ نہ ہوگا کہ کسی کے ساتھ بھی ناانصافی کی جائے۔

معاوضہ نہیں مانگتا اور اس پر کسی سے معاوضہ یا "حق الخدمت" کا خواہاں نہیں ہوتا۔

قُلْ مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ۝ (۲۵/۵۷)

(اے پیغمبرِ اسلام!) تم کہہ دو کہ میں اپنی اس خدمت پر اس کے سوائے اور کوئی اجر نہیں مانگتا کہ (تم میں سے) جو چاہے وہ اپنے پروردگار تک پہنچنے کے لئے راستہ بنالے۔

قوم اس کی دعوت کا انکار کرتی۔ انکار ہی نہیں بلکہ سخت ترین مخالفت کرتی تو اس پر اس کا دل کڑھتا۔ اس لئے نہیں کہ اس کی بات کا انکار کیوں کیا جاتا ہے۔ بلکہ اس لئے کہ اس کی نگہ حقیقت بیں ان کے اس انکار وجحود کے ہلاکت انگیز مآل کو دیکھ رہی ہوتی ہے۔ اسی طرح جیسے ایک طبیبِ مشفق کسی ضدی مریض کی ضد پر اس کے دوائی پینے سے انکار اور پرہیز توڑنے پر اصرار سے افسردہ خاطر ہوجاتا ہے۔ اس لئے نہیں کہ مریض

غمخواری اس کا حکم کیوں نہیں مانتا بلکہ اس لئے کہ وہ اس ضد اور انکار میں اس کی موت کو پنہاں دیکھتا ہے۔ رسولؑ ان کے غم میں اپنی جان گھلا لیتا اور چاہتا کسی نہ کسی طرح انہیں آنے والے طوفانِ بلا سے بچالے۔

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا

الْحَدِيثِ أَسَفًا ۝ (۱۸/۶)

(اے پیغمبر!) تیری حالت تو ایسی ہو رہی ہے کہ جب لوگ یہ (واضح) بات بھی نہ مانیں، تو عجب نہیں ان (کی ہدایت) کے پیچھے مارے افسوس کے تو اپنی جان کو ہلاکت میں ڈال لے۔

لیکن ہدایت ایسی چیز نہیں جسے کسی کو گھول کر زبردستی پلا دیا جائے۔ اس کے لئے قلبِ سلیم کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسے وہی اختیار کرتا ہے جو اپنے دل کو تمام تعصبات سے پاک اور صاف کرکے اس پیغام پر سکون و سکوت سے غور و فکر کرے۔ اور جب اس طرح اس پر اس کی صداقت واضح ہو جائے تو اسے دل کے پورے جھکاؤ کے ساتھ تسلیم کرلے۔ رسول کا فریضہ راستہ دکھا دینا ہوتا ہے، کسی کو راستے پر لگا دینا نہیں ہوتا۔ اس لئے رسول سے کہہ دیا جاتا ہے کہ

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰهُمْ (۲/۲۷۲)

انہیں ہدایت پر لے آنا تمہارے ذمہ نہیں۔

تمہارے ذمہ فقط احکامات کا پہنچانا ہے۔

فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ۚ (۳/۲۰)

تمہارے ذمہ جو کچھ ہے، وہ پیامِ حق پہنچا دینا ہے۔

رسول اپنا پیغام پہنچاتے چلا جاتا اور جس جس زمین میں بالیدگی کی صلاحیت ہوتی، وہ لالہ زار بنتی چلی جاتی۔

معیارِ تفریق یوں چند دنوں میں زمینِ شور اور زرخیز خطے ایک دوسرے سے الگ الگ دکھائی دینے لگ جاتے۔ بس یہ ہے وہ معیارِ تفریق جس کی بنا پر وہ انسانوں کو دو جماعتوں میں تقسیم کر دیتا۔ ایک وہ جو اپنے آپ کو خدائی نظامِ حکومت کے تابع لے آئیں (مؤمن) اور دوسرے وہ جو اس سے انکار کر دیں (کافر)۔ ان کے علاوہ آئینِ خداوندی میں انسانوں کی کوئی تیسری جماعت نہیں، کوئی قوم نہیں۔ اس تفریق پر جغرافیائی حدود و قیود، نسلی تعلقات، رنگ اور زبان کے اختلافات کبھی اثر انداز نہیں ہوتے۔ یہی تفریق، باپ کو بیٹے سے، بھائی کو بھائی سے، خاوند کو بیوی سے، دوست کو دوست سے یوں الگ کرکے رکھ دیتی ہے جیسے ریت کے ڈھیر سے لوہے کے ذرات مقناطیسی پتھر سے الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ ہر وہ ذرہ جو مقناطیس کا اثر قبول کرلے، ایک قوم کا فرد ہے اور جو یہ اثر قبول نہ کرے، دوسری قوم سے متعلق۔ پہلے رسول تنہا ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس کے ساتھ قلبی ہم آہنگی رکھنے والے ذرات

جمع ہو کر ایک جماعت بن جاتے ہیں۔ قرآن اس جماعت کو حزب اللہ کہتا ہے اور فریقِ مقابل کو حزب الشیطان۔

اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ فَاَنْسٰهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ الشَّيْطٰنِ ؕ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ الشَّيْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ○ (۵۸/۱۹)

شیطان ان پر چھا گیا ہے۔ چنانچہ اُس نے خدا کی یاد سے انہیں غافل کر دیا۔ یہی لوگ شیطان کی جماعت (کے لوگ) ہیں۔ یاد رکھو! شیطان کی جماعت (کے لوگ) ہی خسارہ میں رہنے والے لوگ ہیں!

اور دوسری جماعت۔

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ لَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَ اَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ ؕ وَ يُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ ؕ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ ؕ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○ (۵۸/۲۲)

(اے پیغمبر!) تم ان لوگوں کو جو اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں اس حال میں نہ پاؤ گے کہ وہ ان لوگوں کو دوست رکھتے ہوں جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہوں خواہ یہ لوگ ان کے ماں باپ ہوں، بیٹے ہوں، بھائی ہوں یا اہلِ خاندان۔ (درحقیقت) یہی ہیں وہ لوگ جن کے دلوں میں خدا نے ایمان لکھ دیا ہے اور اپنی طرف سے خدا نے وحی کے ذریعہ سے ان کی مدد فرمائی ہے اور جنہیں وہ ایسے باغات میں داخل کر دے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ یہ لوگ اُن باغات میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ خدا اُن سے راضی ہو گیا اور وہ لوگ خدا سے راضی ہو گئے۔ یہ ہیں خدا کی جماعت (کے لوگ)، یاد رکھو! بے شک خدا کی جماعت والے ہی فلاح پانے والے لوگ ہیں!

ان دونوں جماعتوں کا سلسلۂ تصادم و تزاحم بڑھتا جاتا۔ حق اور باطل کی کشمکش زیادہ ہوتی جاتی۔ مریض کی ضد اور اصرار شدت اختیار کرتے جاتے لیکن اس کے ساتھ ساتھ مرض کے جراثیم بھی پھیلتے جاتے۔ کبھی کبھی مریض کی تکلیف اتنی بڑھ جاتی کہ خیال پڑتا کہ وہ طبیب کی طرف رجوع کرے گا۔

وَ مَآ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّبِیٍّ اِلَّاۤ اَخَذْنَاۤ اَهْلَهَا بِالْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ یَضَّرَّعُوْنَ ○ (۷/۹۴)۔

اور ہم نے جب بھی کسی بستی میں کوئی نبی بھیجا (تو اس کے ارباب دولت و قوت نے اس کی مخالفت کی۔ جب تک ان کی غلط روش اس نقطہ تک نہ پہنچ جاتی کہ وہ ان کی آخری تباہی کا موجب بن جائے)، ان پر ہلکی ہلکی مصیبتیں اور مشکلات آئیں۔ مقصود اس سے یہ ہوتا کہ وہ اپنی غلط روش کے نقصان رساں نتائج دیکھ کر اس سے باز آ جائیں۔

لیکن تھوڑے سے عرصہ کے بعد وہ مریض پھر اسی انکار و سرکشی پر اُتر آتا۔ حتیٰ کہ مرض کا زہر اس کے رگ و پے میں سرایت کر جاتا اور اسے ہلاکت چاروں طرف سے یوں گھیر لیتی کہ اُسے محسوس بھی نہ ہوتا کہ وہ کب موت کے آغوش میں پہنچ جاتا (۷/۹۵)۔ اس کا نام عذاب ہے۔ اور یہ سب کچھ ایک خاص قاعدہ اور قانون کے مطابق واقع ہوتا ہے جسے قانونِ مکافاتِ عمل کہتے ہیں (۴۲-۳۵/۴۳)۔ رسول کے آنے سے حجت پوری ہو جاتی تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ ہمارے ہاں طبیب ہی نہیں تھا، ہم علاج کس سے کراتے؟

رُسُلًا مُّبَشِّرِیْنَ وَ مُنْذِرِیْنَ لِئَلَّا یَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِیْزًا حَكِیْمًا ○ (۴/۱۶۵)

یہ تمام رسول (صحیح اعمال کے نتائج کی) خوش خبری دینے والے اور (انکارِ حق کے نتائج سے) آگاہ کرنے والے تھے (اور اس لئے بھیجے گئے تھے) کہ ان کے آنے (اور نیک و بد بتلانے) کے بعد لوگوں کے پاس کوئی حجت باقی نہ رہے جو وہ خدا کے حضور پیش کر سکیں (یعنی یہ عذر نہ کر سکیں کہ راہِ حق کی طرف کسی نے دعوت نہیں دی تھی)، اور خدا اپنے تمام کاموں میں سب پر غالب اور حکمت رکھنے والا ہے۔

اور یہ ہے بھی نہایت ضروری۔ جب انسان کو ایسی فضا میں چھوڑا گیا جہاں ہر قسم کے مؤثرات اس پر

اثر انداز ہو کر اسے غلط راہوں پر لگانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں تو اسے ان راستوں کی خطرناک گھاٹیوں سے آگاہ کرنا بھی ضروری تھا۔ اس تنبیہہ اور تنذیر کے بعد اگر کوئی دیدہ دانستہ ان ہلاکت کے عمیق گڑھوں میں گرنا چاہے تو اسے کون بچا سکتا ہے؟ اسی لئے فرمایا۔

ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّ اَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ ○ (۶/۱۳۱)

یہ (پیغمبروں کا ظہور اور دعوتِ حق کا اعلان) اس لئے ہوا کہ تمہارے پروردگار کا یہ شیوہ نہیں کہ وہ ظلم و ناانصافی سے بستیوں کو ہلاک کر دے، درآنحالیکہ وہاں کے رہنے والے (راہِ حق سے) بے خبر ہوں!

رسول کا فریضہ یہ تھا کہ وہ زندگی کے ہر دوراہے پر جلی حروف میں راہ نما کھمبے نصب کر دے۔ اس کے بعد جس کا جی چاہے سرفرازیوں اور کامرانیوں کی جنت کا راستہ اختیار کر لے اور جس کا جی چاہے ذلت و رسوائی کے جہنم کی طرف چل دے۔

مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ؕ وَ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ؕ وَ مَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ○ (۱۷/۱۵) (نیز ۴۹—۵۰/۴۰)

جو سیدھے رستے چلا، تو اپنے ہی لئے چلا اور جو بھٹک گیا تو بھٹکنے کا خمیازہ بھی وہی اٹھائیگا۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا (ہر جان کو خود اپنے ہی اعمال کا بوجھ اٹھانا ہے) اور ہم کبھی ایسا نہیں کرتے کہ (کسی قوم کو) عذاب دیں، مگر اسی وقت، جبکہ اس میں ایک رسول پیدا کر دیتے ہیں (اور پھر بھی لوگ سرکشی و فساد سے باز نہیں آتے) تاکہ جہنم کی ہلاکت سامانیوں میں گھرنے کے بعد یہ گلہ نہ رہے کہ ہمیں راستہ بتانے والا ہی کوئی نہ تھا۔

یہ ہے مقصدِ بعثتِ انبیاء کرامؑ۔ جو لوگ ان کے پیغام کے مطابق اور اُن کے نظام کے تابع زندگی بسر کرتے ہیں، دنیا بھر کی خوش بختیاں ان کے قدم چومتی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ان کے جوہرِ انسانیت میں ایسی جِلا اور بالیدگی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اس زندگی سے اگلی زندگی میں بھی سرفراز و شادکام رہتے ہیں۔ اس کے

برعکس جو ان کی تکذیب کرتے ہیں اُن کے فقط افسانے باقی رہ جاتے ہیں۔

ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا ۭ كُلَّمَا جَآءَ اُمَّةً رَّسُوْلُهَا كَذَّبُوْهُ فَاَتْبَعْنَا بَعْضَهُمْ بَعْضًا وَّ جَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ ۚ فَبُعْدًا لِّقَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝ (۲۳/۴۴)

پھر ہم نے لگاتار، یکے بعد دیگرے، اپنے رسول بھیجے۔ لیکن جب کبھی کسی قوم میں اس کا رسول ظاہر ہوا، معاً وہ جھٹلانے پر آمادہ ہوگئی۔ پس ہم بھی ان کو ان کے اعمال کے نتیجہ میں ایک کے بعد ایک کرکے تباہ کرتے گئے، تاآنکہ ان کی ہستیاں (روایت کا) افسانہ بن گئیں کیونکہ ان کے لئے محرومی و نامرادی ہی ہے جو قوانینِ خداوندی پر یقین نہیں کرتے!

واضح رہے کہ اس عذاب کی صورت یوں نہیں ہوتی تھی کہ اللہ کا رسول آتا، یہ لوگ اسے جھٹلاتے، اس پر (معاذ اللہ) خدا کو غصہ آجاتا اور ان پر عذاب مسلط کردیتا۔ یہ تصور ہی باطل ہے۔

عذاب

بات بالکل سیدھی اور قانونِ فطرت کے مطابق ہے۔ رسول کہتا کہ یہ سنکھیا ہے۔ جو شخص اسے کھائے گا ہلاک ہوجائے گا۔ ایک شخص اس کی بات کو صحیح مانتا (ایمان) اور اس زہر سے اجتناب برتتا۔ ظاہر ہے کہ وہ اس کی ہلاکت سے محفوظ رہتا۔ دوسرا کہتا کہ یہ جھوٹ کہتا ہے (تکذیب)، اس کی بات مت مانو (کفر)، یہ سنکھیا نہیں شکر کی ڈلی ہے اور یہ کہہ کر اسے نگل جاتا۔ انجام ظاہر ہے۔ اس انجام کا نام ہے عذاب۔

جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے اسے قرآن نے سورۂ یٰسین کی چند آیات میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے، یعنی (۱۳ — ۳۶/۳۳) میں۔ انہیں دیکھ لیا جائے، نیز آیات (۵۹ — ۳۹/۶۱)؛ (۵۳/۷)

سعید روحوں نے ان حضرات انبیاء کرامؑ کی دعوت کو قبول کیا اور اپنی قوم کو سمجھانے کی کوشش کی۔

وَجَآءَ مِنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ رَجُلٌ يَّسْعٰى قَالَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِيْنَ ۝ اتَّبِعُوْا مَنْ لَّا يَسْـَٔلُكُمْ اَجْرًا وَّ هُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝ وَمَا لِيَ لَآ اَعْبُدُ الَّذِيْ فَطَرَنِيْ وَ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ ءَاَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً اِنْ يُّرِدْنِ الرَّحْمٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ عَنِّيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا وَّ لَا يُنْقِذُوْنِ ۝ اِنِّيْٓ اِذًا

لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ○ (۲۰ ــ ۳۶/۲۴)۔

اور (دیکھو) شہر کے آخری کنارے سے ایک آدمی دوڑتا ہوا آیا۔ کہنے لگا "اے میری قوم کے لوگو! ان رسولوں کی پیروی کرو۔ ان کی پیروی کرو جو تم سے (اپنی راہنمائی کا) کوئی بدلہ نہیں مانگتے اور وہ خود راہ یاب ہیں۔ (ہاں ہاں) مجھے کیا ہوا کہ میں اس خدا کی محکومیت اختیار نہ کروں جس نے مجھے پیدا کیا ہے اور جس کی طرف تم سب لوٹائے جاؤ گے۔ کیا میں اس کے علاوہ کچھ اور آقا اور حاکم گھڑلوں کہ اگر خدا مجھے کوئی تکلیف پہنچانا چاہے تو نہ مجھے ان حاکموں اور آقاؤں کی) سفارش ہی کچھ کام دے سکے اور نہ ہی وہ (خدا کے عذاب سے) بچا سکیں؟ (اگر میں ایسا کرنے لگوں، تو) پھر تو میں بڑی کھلی گمراہی میں پڑ گیا۔ (نہیں، اے خدا کے فرستادہ پیغمبرو!) میں تمہارے پروردگار پر ایمان لے آیا۔ چنانچہ میرا یہ اقرار سُن رکھو!

لیکن انہوں نے اس پکارنے والے کی پکار پر لبیک کہنے کے بجائے اسے قتل کر ڈالا۔ اس کا تو کچھ بگڑا نہیں اس لئے کہ اسے اس مقام سے بلند ترین مقام مل گیا۔

قِیْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ ؕ قَالَ یٰلَیْتَ قَوْمِیْ یَعْلَمُوْنَ ○ بِمَا غَفَرَلِیْ رَبِّیْ وَ جَعَلَنِیْ مِنَ الْمُكْرَمِیْنَ ○ (۲۶ ــ ۲۷/۳۶)

کہا گیا "جا، تُو تو جنت میں داخل ہو جا۔" وہ بولا "اے کاش! میری قوم جانتی کہ میرے پروردگار نے میری حفاظت کر دی اور مجھے (اپنے نزدیک) معزز لوگوں میں سے کر دیا۔

لیکن اس قوم کے اعمال کے ظہورِ نتائج کا وقت آ گیا۔ اس کے لئے آسمان سے فرشتے نہیں اُترے۔

وَ مَاۤ اَنْزَلْنَا عَلٰى قَوْمِهٖ مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ جُنْدٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَ مَا كُنَّا مُنْزِلِیْنَ ○ (۳۶/۲۸)

اور (یاد رکھو) ہم نے اُس کے بعد اس کی قوم پر آسمان سے کوئی (فرشتوں کی) فوج نہیں اتاری اور نہ ہی ہم اتارنے والے تھے۔

ایک آواز اور بس خاتمہ۔

اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَیْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ خٰمِدُوْنَ ○ (۳۶/۲۹)

ایک چیخ (کی آواز) کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ چنانچہ وہ سب یک بارگی بے حس و حرکت

پڑے تھے۔

کیسا حسرتناک ہے یہ انجام۔

يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ ۚ مَا يَأْتِيهِمْ مِّن رَّسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ ○ (۳۶/۳۰)

ہائے رے افسوس ان بندوں پر! ان کے پاس کوئی رسول بھی آتا تھا یہ لوگ اس کا مذاق ہی اڑاتے تھے۔

انجام اُن لوگوں کا جنہوں نے اپنے سے پہلے گزرنے والی اقوام کے انجام و عواقب کی داستانوں (تاریخی شواہد) سے بھی فائدہ نہ اٹھایا۔

أَلَمْ يَرَوْا كَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُم مِّنَ الْقُرُونِ أَنَّهُمْ إِلَيْهِمْ لَا يَرْجِعُونَ ○ وَإِن كُلٌّ لَّمَّا جَمِيعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُونَ ○ (۳۶/۳۲-۳۱)

کیا انہوں نے دیکھا نہیں کہ ہم نے ان سے پہلے کتنی نسلیں (محض اسی وجہ سے) تباہ کر دی ہیں کہ وہ اُن (رسولوں) کی طرف پلٹتے نہیں تھے اور بلاشبہ وہ سب کے سب ہمارے حضور میں جمع کیے جائیں گے!

اس آخری آیت پر غور فرمائیے۔ یعنی اس دنیا میں ایسا عبرت انگیز انجام اور اس کے بعد اگلی منزل کی کامرانیوں سے محرومی! یہاں بھی اصول و قانون کے مطابق، وہاں بھی آئین و دستور کے موافق۔

بَلَىٰ قَدْ جَاءَتْكَ آيَاتِي فَكَذَّبْتَ بِهَا وَاسْتَكْبَرْتَ وَكُنتَ مِنَ الْكَافِرِينَ ○ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ تَرَى الَّذِينَ كَذَبُوا عَلَى اللَّهِ وُجُوهُهُم مُّسْوَدَّةٌ ۚ أَلَيْسَ فِي جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِينَ ○ (۳۹/۶۰-۵۹)

کیوں نہیں؟ تیرے پاس میری آیتیں آچکی ہیں، پس تو انہیں جھٹلا چکا، غرور کا اظہار کر چکا اور نہ ماننے والوں میں سے بن چکا ہے (اور اے پیغمبر!) قیامت کے روز تم ان لوگوں کو دیکھو گے جو خدا پر جھوٹ بولتے تھے کہ ان کے چہرے سیاہ ہو گئے ہوں گے۔ کیا جہنم میں مغرور لوگوں کا ٹھکانہ نہیں ہے؟ (ہے اور ضرور ہے)۔

یہ ہے مفہوم رسول کی تکذیب سے اور یہ ہے مقصود عذابِ خداوندی سے۔ محکمۂ موسمیات METROLOGICAL DEPARTMENT کی طرف سے یہ انتظام ہوتا ہے کہ جونہی انہیں معلوم ہو کہ دُور سیکڑوں میل پر طوفان کے آثار ہیں اور پانی کی رفتار بتا رہی ہے کہ سیلاب اتنے وقت میں فلاں فلاں مقام تک آپہنچے گا تو وہ اُن مقامات پر متعین شدہ اہلکاروں کو بذریعہ تار اس کی اطلاع دے دیتے ہیں۔ وہ اہل کار ارد گرد کے گاؤں والوں کو متنبہ کر دیتے ہیں کہ فوراً اپنے بال بچوں کو لے کر یہاں سے نکل جاؤ ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے۔ اب جو لوگ ان کی بات کی تصدیق کر کے ان پر عمل پیرا ہوں گے وہ طوفان سے بچ جائیں گے۔ لیکن جو ان کی تکذیب کریں گے اور کہیں گے کہ یہ یونہی کہتے ہیں، تو ظاہر ہے کہ وہ نذرِ سیلاب ہو جائیں گے۔ یہ ہے (تمثیلاً) تکذیبِ رسل۔ اگر وہ لوگ رسولوں کی تنذیر پر کان دھر کر اپنی غلط رَوِش کو بدل دیں، تو ہلاکت سے بچ جائیں۔ اور اگر رسول کی اس تنذیر کی ہنسی اڑائیں اور اپنی اُسی روِش پر قائم رہیں، تو ہلاکت آمیز عذاب میں گرفتار ہو جائیں۔

اس طرح یہ سلسلۂ رشد و ہدایت قائم رہا۔ جب دنیا ہنوز اپنے عہدِ طفولیت میں تھی، تو سلسلۂ رسل و رسائل اور نامہ و پیام کا یہ انتظام نہ تھا کہ کمرے کے ایک گوشے میں بیٹھنے والے کی آواز بیک وقت دنیا کے ہر کنارے تک جا پہنچے۔ اُس وقت تو ایک بستی کی بات کا دوسری بستی تک پہنچنا مشکل تھا۔ اس لئے قریہ قریہ، بستی بستی، قبیلہ قبیلہ کی طرف الگ الگ رسول آئے[1]۔

وَ لِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ○ (۱۰/۴۷؛ نیز ۱۳/۷؛ ۱۶/۳۶؛ ۳۵/۲۴)۔

---

[1] صرف اس لئے ہی نہیں کہ اُس زمانہ میں سلسلۂ رسل و رسائل ایسا عالمگیر نہ تھا، بلکہ اس لئے بھی کہ ابھی انسانی ہیئتِ اجتماعیہ نے اتنی ترقی نہیں کی تھی کہ وہ بین الاقوامی روابط سے ایک عالمگیر برادری کے افراد بن سکیں۔ اُس وقت اس امر کی ضرورت تھی کہ ان کے چھوٹے چھوٹے گروہوں کی الگ الگ تربیت کر کے ان میں وحدتِ خلق و وحدتِ خالق کا صحیح تصور پیدا کیا جائے اور اس طرح ان کی انسانیت میں وسعت پیدا ہوتی جائے۔

اور (یاد رکھو) ہر امت کے لئے ایک رسول تھا (جو اُن میں پیدا ہو کر انھیں دینِ حق کی طرف بلاتا تھا)۔ پھر جب کسی امت میں اس کا رسول ظاہر ہوگیا، تو (ہمارا قانون یہ ہے کہ) اُن کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جاتا ہے اور ایسا نہیں ہوتا کہ ناانصافی ہو۔

ہر قریہ میں رسول

ہر قریہ میں[1]

وَ مَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا لَهَا مُنْذِرُوْنَ (۲۶/۲۰۸)

اور ہم نے کسی آبادی کو ہلاک و برباد نہیں کیا مگر یہ کہ اس کے لئے انکار و بدعملی کے نتائج سے) ڈرانے والے تھے!

اور جب دنیا ذرا اور آگے بڑھ آئی تو علاقہ کے صدر مقام میں رسول آتے رہے جہاں سے اُن کی آواز اپنے اپنے دائرہ تبلیغ میں پہنچتی رہی۔

وَ مَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۚ وَ مَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰٓى اِلَّا وَ اَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ ○ (۲۸/۵۹)

اور (اے پیغمبر اسلام!) تمہارا پروردگار آبادیوں کو اُس وقت تک ہلاک و برباد کرنے والا نہیں جب تک اُن آبادیوں کے صدر مقام میں اپنا کوئی رسول نہ بھیج دے جو اُن کے سامنے ہماری آیتیں پڑھ کر سنا دے۔ اور ہم آبادیوں کو بجز اس صورت کے ہلاک کرنے والے نہیں ہیں کہ اُن آبادیوں والے (خود) ہی ظالم ہوں (اور اس طرح اس سزا کے مستحق ہو جائیں)۔

یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا، تا آنکہ وہ وقت آ گیا جس کے بعد انسانیت نے ایک نئے دور میں داخل ہو جانا تھا۔ یعنی اس سے پہلے ذہنِ انسانی عالمِ طفولیت میں تھا۔ اب اُسے صاحبِ شعور بن جانا تھا چنانچہ

---

[1] ہر رسول کے پیغام کی زبان وہی ہوتی تھی جو اس قوم کی زبان تھی۔

وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ؕ (۱۴/۴)

اور ہم نے کوئی پیغامبر دنیا میں نہیں بھیجا، مگر اس طرح کہ اپنی قوم ہی کی زبان میں پیامِ حق پہنچانے والا تھا تاکہ لوگوں پر مطلب واضح کردے۔

اس وقت اس نبیؐ آخر الزمانؐ کی باری آئی جسے تمام نوعِ انسانی کے لئے رسول بن کر آنا تھا اور جس کے ساتھ نبوت کا سلسلہ بھی ختم ہو جانا تھا (تفصیل اس اجمال کی "معراجِ انسانیت" میں ملے گی)۔ ایک رسول آتا

رسولؐ کے بعد

اور اپنے مقصدِ رسالت کی تکمیل کے بعد چلا جاتا۔ جب جاتا تو اپنا پیغام یعنی وہ ضابطۂ قوانین جس کے ماتحت انسانوں کو اپنی زندگی بسر کرنی تھی، اپنے متبعین کے سپرد کر جاتا۔ کچھ عرصہ تک وہ اس نظام کے مطابق زندگی بسر کرتے لیکن آہستہ آہستہ مختلف امیال وعواطف اور متنوع اسباب وعلل کے ماتحت وہ اس نظام سے کنارہ کشی کرتے جاتے۔ اربابِ قوت واقتدار رفتہ رفتہ پھر اسی انسانی حکومت کو لوگوں پر مسلط کر دیتے جسے حکومتِ الٰہیہ میں بدلا گیا تھا۔ اراکینِ مذہب چپکے ہی چپکے اس ضابطۂ قوانین (کتاب اللہ) میں تبدیلیاں کرتے رہتے جس کے وہ وارث بنائے گئے تھے۔ اور رفتہ رفتہ ایسا وقت آجاتا کہ کتاب (انسانی تحریف والحاق کا مجموعہ بن کر رہ جاتی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ مجموعۂ قوانین ارضی وسماوی حوادث کی نذر ہو جاتا اور دنیا میں اس کا اصلی وجود کہیں باقی نہ رہتا اور دین کی جگہ وہ رسومات وروایات لے لیتیں جو انسانی دماغوں نے وضع کر کے دین کا جزو بنا رکھی تھیں (اور جو دلچسپ اور نظر فریب ہونے کے اعتبار سے عوام کے دل کی گہرائیوں میں اُتر چکی تھیں۔

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ۭ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ۝ (۶/۱۱۲)۔

اور (اے پیغمبرؐ!) اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لئے (جب اس کی دعوت کا ظہور ہوا، تو) حضری اور بدوی آبادیوں کے سرکش سرغنوں کو دشمن ٹھہرا دیا جو ایک دوسرے کو خوشنما باتیں سکھاتے تاکہ لوگوں کو فریب دیں۔ اور اگر تمہارا پروردگار چاہتا تو (یقیناً ایسا کر سکتا تھا کہ) وہ دشمنی نہ کرتے (مگر اس نے انسان کو صاحبِ اختیار وارادہ پیدا کیا ہے) پس (ان کی مخالفت سے دل گرفتہ نہ ہو اور) انہیں اُن کی افترا پردازیوں میں چھوڑ دو۔

جب حالت یہ ہو جاتی کہ نہ وہ قوم آئینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرتی اور نہ ان میں وہ ضابطۂ قوانین ہی اپنی اصلی شکل میں باقی رہتا، تو پھر ایک اور رسول آجاتا جو انہیں پھر سے آئینِ خداوندی کے مطابق

نیا رسول زندگی بسر کرنے کی دعوت دیتا اور سابقہ (محرّف شدہ) مجموعۂ قوانین سے (وحیِ الٰہی کی روشنی میں) انسانی تحریفات و تلبیسات کو الگ کرکے اس کی اصلی صورت میں پیش کرتا۔

وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّ لَا نَبِیٍّ اِلَّاۤ اِذَا تَمَنّٰۤی اَلْقَی الشَّیْطٰنُ فِیْۤ اُمْنِیَّتِهٖ ۚ فَیَنْسَخُ اللّٰهُ مَا یُلْقِی الشَّیْطٰنُ ثُمَّ یُحْكِمُ اللّٰهُ اٰیٰتِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِیْمٌ حَكِیْمٌ ۙ (۲۲/۵۲)

اور (اے پیغمبر!) ہم نے تجھ سے پہلے جتنے رسول اور نبی بھیجے سب کے ساتھ یہ معاملہ ضرور پیش آیا کہ حق کی مخالف قوتوں نے ان کی تلاوت کردہ (وحی) میں آمیزش کر دی۔ اس کے بعد اللہ نے (ایک دوسرا رسول بھیج کر) ان کی آمیزش کو مٹا ڈالا اور اپنے قوانین کو اور زیادہ مضبوط کر دیا۔ وہ سب کچھ جاننے والا (اپنے سارے کاموں میں) حکمت والا ہے۔

اس کی پھر اسی طرح مخالفت ہوتی جس طرح رسولِ ماسبق کی ہوئی تھی۔ مسخ شدہ دین اور محرّف کتاب پر جم کر بیٹھنے والے اس "نئے" مسلک کے خلاف شدید ترین محاذ قائم کر لیتے اور اس کے لئے دلیل یہ لاتے کہ یہ مسلک اس مسلک کے خلاف ہے جو ان میں ان کے اسلاف سے متوارث چلا آرہا ہے (دیکھئے ۲۲/۵۴ — ۵۳)۔

جزئیات میں ارتقا تحریف کے علاوہ، اس سلسلۂ تجدید کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ چونکہ دنیا اپنے ابتدائی ادوار طے کرتی ہوئی من حیث الکل اوپر کو ابھرتی چلی آرہی تھی اس لئے اگر انسانی حیاتِ اجتماعیہ کے ان بڑھتے ہوئے تقاضوں کے پیشِ نظر، سابقہ تعلیم کی بعض جزئیات کو بدلنا مقصود ہوتا تو انہیں منسوخ کرکے، اس نئے رسول کی وساطت سے، دوسری جزئیات و تفاصیل دے دی جاتیں[1]۔

---

[1] یہ ضروری نہیں کہ سابقہ تفاصیل و جزئیات (شریعت کے احکام) کو بہ تمام و کمال بدل دیا جاتا۔ کسی ایک حکم کے بدلنے سے بھی سابقہ شریعت، جدید شریعت بن جاتی۔ اس لئے کہ جن احکام کو خود خدا نے نافذ فرمایا ہو وہ خدا ہی کے حکم سے بدلے جا سکتے ہیں اور خدا کا یہ حکم انبیائے کرامؑ کی وساطت سے انسانوں تک پہنچتا۔ لہٰذا اگر کوئی رسول کسی سابقہ

(بقیہ فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر)

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ؕ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ○ (۲/۱۰۶)

ان (اہلِ کتاب) کا ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ جب خدا کی کتابیں پہلے سے موجود تھیں، تو پھر ایک نئی کتاب (قرآن) کی ضرورت کیوں پڑگئی۔ نیز یہ بھی کہ اگر یہ کتاب خدا ہی کی طرف سے ہے تو اس میں ایسے احکام کیوں ہیں جو خدا کی پہلی وحی (تورات) کے خلاف ہیں۔

ان سے کہہ دو کہ ہماری طرف سے وحی کا انداز یہ ہے کہ کسی سابقہ رسول کی وحی کے ایسے احکام، جو وقتی طور پر نافذ العمل رہنے کے لئے دیئے گئے تھے، انہیں، بعد میں آنے والے رسول کی وحی کے احکام سے بدل دیا جاتا ہے؛ اور یہ نئے احکام، پہلے احکام سے بہتر ہوتے ہیں۔ جن سابقہ احکام کے متعلق اس کا فیصلہ ہوتا ہے کہ انہیں علیٰ حالہ رہنے دیا جائے یا جنہیں سابقہ رسولوں کی قومیں ترک یا فراموش کر دیتی ہیں یا ان میں اپنی طرف سے آمیزش کر دیتی ہیں (۲۲/۵۲)، ان کی جگہ انہی جیسے احکام، جدید وحی میں دے دیئے جاتے ہیں (۱۶/۱۰۱)؛ اور یہ سب کچھ ہمارے مقرر کردہ اندازوں کے مطابق ہوتا ہے جن پر ہمارا پورا پورا کنٹرول ہے۔

انہی اندازوں کے مطابق اب یہ آخری ضابطۂ حیات دیا گیا ہے جس میں تمام سابقہ سچائیاں آگئی ہیں جو ہر طرح سے مکمل ہے (۵/۴۰، ۶/۱۱۶) اور جو ہمیشہ محفوظ رہے گا (۱۵/۹)۔

لیکن یہ نیا رسول، خواہ اسی ضابطۂ قوانین کی تجدید کرتا جو اس سے پیشتر نازل ہوا تھا یا اس میں کچھ ردّ و بدل ہو جاتا، بہرحال، اب ایمان و اطاعت اسی کی واجب ہوتی، ان پر بھی جو اپنے آپ کو سابقہ رسول کی طرف منسوب کرتے تھے اور دوسروں پر بھی۔ اس لئے کہ

(۱) یہ رسول بھی اسی خدا کی طرف سے آیا تھا جس خدا نے سابقہ رسول بھیجا تھا۔ اگر سابقہ رسول کی طرف نسبت اور اس کی مزعومہ اطاعت ہی کافی ہوتی تو اس نئے رسول کی بعثت کی ضرورت ہی نہ تھی۔ اطاعت تو

(گذشتہ صفحے کا فٹ نوٹ)

تعلیم کے ایک حکم کو بھی بدلتا ہے تو وہ ایک نئی شریعت لاتا ہے اور اگر پچھلا ضابطۂ قوانین اپنی اصلی شکل میں موجود ہو اور اس میں کسی قسم کا ردّ و بدل بھی متصور نہ ہو تو پھر کسی رسول (یا نبی) کے آنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔

درحقیقت خدا کی ہے۔ جب خدا کا یہ حکم ہے کہ میری اطاعت اس ضابطہ کی رُو سے ہوگی جو اس رسول کی وساطت سے بھیجا گیا ہے تو خدا کی اطاعت کرنے والوں کو اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟ نئے رسول سے انکار درحقیقت اس جذبہ پر مبنی ہوتا ہے کہ یہ رسول اپنے دعوائے رسالت میں (معاذ اللہ) جھوٹا ہے ـــ یا (خاکم بدہن) اس خدا کا بھیجا ہوا نہیں جس خدا نے سابقہ رسول کو بھیجا تھا۔ اور یہی وہ تکذیب ہے جس کا مآل (جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں) ہلاکت ہے۔

(۱۱) ہر نیا ضابطہ، گذشتہ ضابطۂ قوانین کا نیا ایڈیشن ہوتا جس کا ہر حرف اور لفظ یقینی طور پر منجانب اللہ ہوتا۔ اس لئے یقین کو چھوڑ کر ظن کا اتباع حق پرستی نہیں، باطل پر اڑے رہنا ہے۔

اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنْ هُمْ اِلَّا یَخْرُصُوْنَ ۝ (۶/۱۱۷)

وہ پیروی نہیں کرتے مگر محض گمان کی اور وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ شک و گمان میں قیاس آرائیاں کرتے ہیں۔

(۱۱۱) تبدیلی و تجدید کا یہ سلسلہ خود مشیتِ خداوندی کے ماتحت واقع ہوتا تھا۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ کسی ضابطۂ قوانین کو اللہ تعالیٰ دستبردِ انسانی اور حوادثِ ارضی و سماوی سے محفوظ و مصئون رکھنا چاہے اور کوئی قوت اس میں ردّ و بدل پیدا کر دے! کس میں یہ قوت ہے کہ ایسا کر سکے؟[1] اس لئے اگر ایک ضابطۂ قوانین اپنی اصلی شکل میں دنیا میں نہیں رہا تو اس کا مطلب یہی ہے کہ وہ ابدالآباد تک نافذ العمل رہنے کے لئے دیا ہی نہیں گیا تھا۔ اس لئے دوسرا ضابطہ آتا ہی اس وقت تھا جب پہلے کا نافذ العمل رکھا جانا مقصود نہیں ہوتا تھا۔ لہٰذا ایک جدید رسول کی آمد پر کسی سابقہ رسول اور اس کی کتاب سے تمسّک، اس نظامِ رشد و ہدایت کی مخالفت ہے جو اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ نے تجویز فرمایا ہے۔

(۷) اس نئے رسول کی وحی میں سابقہ رسول کی وحی کا وہ تمام حصہ موجود ہوتا ہے جسے علیٰ حالہٖ رکھا جانا اللہ کو مقصود تھا۔ سابقہ وحی کا جو حصہ منسوخ کیا جاتا، اس کی جگہ اس سے بہتر احکام و ضوابط دیئے جاتے اور

---

[1] قرآن کو ہمیشہ تک کے لئے نافذ العمل رکھنا مقصود تھا، اس لئے اس کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے لے لیا اور آج تک کسی میں اتنی جرأت نہیں ہو سکی کہ اس کے ایک حرف کو بھی اپنی جگہ سے بدل دے۔ قرآن کس طرح قیامت تک کے لئے نصابِ زندگی ہے، اس کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی۔

اُس (سابقہ وحی) میں سے جو حصّہ دستِ بردِ زمانہ کے ہاتھوں سے ضائع ہو چکا ہوتا' اُسے اس نئی وحی میں دوبارہ دیدیا جاتا۔ لہٰذا وحیِ خداوندی کا یہ نیا ایڈیشن' سابقہ ایڈیشن کے مقابلہ میں بہرنوع ہوتا اور یہ سب کچھ خدا کی طرف سے کیا جاتا۔

(۷) اور پھر یہ کہ' جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے' ایک رسول' صرف قانون کی کتاب دینے کے لئے ہی نہیں آتا بلکہ اس کے ساتھ ہی اُسے عملی طور پر متشکل کرنے کے لئے بھی آتا ہے اور اس کی عملی تشکیل کی صورت فقط ایک ہے کہ سب سے پہلے مرکزِ حکومتِ الٰہیّہ کی اطاعت کی جائے۔ اسی لئے فرمایا کہ

وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ۔۔۔۔
(۴/۶۴)

اور (اے پیغمبر!) ہم نے جس کسی کو بھی منصبِ رسالت دے کر دنیا میں کھڑا کیا' تو اسی لئے کیا کہ ہمارے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔

لہٰذا' اس رسول کے متعیّن فرمودہ نظامِ زندگی کی موجودگی میں اپنے نظامِ کہن پر قائم رہنا حکومتِ الٰہیّہ کے متوازی ایک دوسری حکومت PARALLEL GOVT قائم کرنا ہے جو صریحاً شرک ہے۔

کیا تمام مذاہب سچے ہیں

ان تصریحات کی روشنی میں یہ حقیقت واضح ہے کہ ایک نئے رسول کی بعثت پر کسی سابقہ رسول کی طرف نسبت یا (بزعمِ خویش) اس کی شریعت کا اتباع میزانِ خداوندی میں کبھی قابلِ قبول نہیں ہو سکتا اس لئے کہ یہ روش تدبیرِ خداوندی کی کھلی ہوئی تکذیب ہے جس کے ماتحت اُس نے یکے بعد دیگرے رسول بھیجے۔ یہ روش اس امر کا اعلان ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فعل (معاذ اللہ) بے سود اور لاحاصل تھا۔ لہٰذا' آج یہ کہنا کہ عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہیں[1]' کھلی ہوئی گمراہی' قرآن کے عظیم الشان اصول کی بیّن تکذیب اور سلسلۂ رشد و ہدایت کی تدبیرِ خداوندی کے بے سود و لاحاصل ہونے کا واضح اعلان ہے۔ ہر مذہب میں اپنے اپنے وقت میں عالمگیر سچائیاں موجود تھیں۔ لیکن جب ان سچائیوں کا ضابطہ اپنی اصلی شکل میں موجود نہ رہا اور مشیّتِ ایزدی کو منظور ہوا کہ اس کی جگہ دوسرا ضابطۂ قوانین بھیجدے تو اب سچائیاں جدید

---

[1] مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) نے اپنی تفسیر (ترجمان القرآن) میں یہی کہا ہے۔

ضابطہ میں محصور ہو کر آگئیں یعنی یہ دوسرا ضابطہ آیا ہی اس وقت جب مشیت کو یہ منظور ہوا کہ اس کی جگہ دوسرا ضابطۂ قوانین بھیجدے۔ تو اب سچائیاں جدید ضابطہ میں محصور ہو کر آگئیں۔ یعنی یہ دوسرا ضابطہ آیا ہی اس وقت جب مشیت کو یہ منظور ہوا کہ دوسرا ضابطہ پہلے کی جگہ لے لے۔ ورنہ اگر پہلا ضابطہ ہمیشہ کے لئے کافی سمجھا جاتا تو اللہ تعالیٰ کے لئے اسے ہمیشہ تک محفوظ رکھنے میں کونسی دقت تھی[1]؟

دنیائے مذاہب میں عام طور پر دو ہی قسم کے نظریئے پائے جاتے ہیں۔

(i) یا تو ہر مذہب کے پیرو یہ سمجھتے ہیں کہ سچائیاں صرف اُنہی کو ملی تھیں۔ کسی دوسرے مذہب کو سچائیاں ملی ہی نہ تھیں۔ یعنی اُن کے بانیٔ مذہب کے علاوہ کوئی اور مدعیٔ رسالت و نبوت (معاذ اللہ) سچا نہ تھا۔ اور

(ii) یا برہمو سماجی قسم کے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ عالمگیر سچائیاں ہر مذہب میں یکساں طور پر موجود ہیں۔ اس لئے اگر ہر مذہب کے پیرو اپنے اپنے مذہب کی تعلیم پر کاربند ہو جائیں تو منشائے خداوندی پورا ہو جائے گا۔

لیکن قرآن کو ماننے والا ان میں سے کسی نظریہ کی بھی تائید نہیں کر سکتا۔ اس کے نزدیک پہلا نظریہ اس لئے غلط ہے کہ اس کا ایمان ہے کہ تمام حضرات انبیائے کرامؑ اپنے اپنے وقت میں خدا کی طرف سے سچی تعلیم لائے تھے اس لئے وہ سچے تھے۔ ان کی تعلیم سچی تھی اور ان کے پیرو سچے تھے۔

اور دوسرے نظریہ کی اس لئے تائید نہیں کی جا سکتی کہ دوسرا رسول بھیجا ہی اس وقت جاتا تھا جب پہلے رسول کی تعلیم اپنی اصلی شکل میں باقی نہیں رہتی تھی اور مشیتِ ایزدی کو منظور ہوتا تھا کہ پہلے ضابطہ کی تجدید

---

[1] ہم نے یہ لکھا ہے کہ ایک جدید ضابطۂ قوانین اس وقت آتا جب پہلا ضابطہ اپنی اصلی شکل میں موجود نہ رہتا۔ اس سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ دوسرا ضابطہ اس لئے آتا کہ پہلا ضابطہ اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں رہا تھا۔ بلکہ یہ کہ چونکہ پہلا ضابطہ ہمیشہ کے لئے نافذ العمل رہنے کے لئے بھیجا ہی نہیں گیا تھا اس لئے دوسرا ضابطہ بھیجا جانا ضروری تھا۔ یہ تمام وقتی ضوابط تھے جن کی جزئیات و تفاصیل میں انسانی داعیات و مقتضیات کے ساتھ ساتھ ارتقائی تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ آخری ضابطۂ قوانین (قرآن مجید) انسان کے تمام مقتضیات کو سامنے رکھ کر عطا کیا گیا اس لئے اس کے بعد کسی (دور تجدید کی) ضرورت نہیں رہی۔ اس میں وہ سب کچھ بھی ہے جو پہلے ضوابط میں تھا اور ان کے علاوہ وہ سب کچھ بھی جس کی تکمیل کی شرفِ انسانیت کے لئے ضرورت ہے۔

اور اس میں مناسب حک و اضافہ کے بعد ایک نیا ایڈیشن بھیجا جائے۔ اس لئے دوسرے رسول (یا صاحبِ) کی آمد پر اس پر ایمان اور اس کے پیغام کی اطاعت ضروری ہو جاتی۔ چونکہ ان سب کے آخر میں محمدؐ رسول اللہ مبعوث ہوئے اس لئے ہر ایک کے لئے آپ پر ایمان لانا اور آپ کے آوردہ ضابطۂ قوانین کی اطاعت کرنا ضروری قرار دیا گیا۔ اور چونکہ مشیت کی اسکیم کے مطابق اس آخری ضابطۂ قوانین کو ہمیشہ کے لئے نصابِ زندگی رہنا تھا، اسے اس انداز سے محفوظ و مصئون رکھا گیا کہ اس کا ایک نقطہ بھی اِدھر اُدھر نہیں ہو سکا، نہ ہو سکے گا۔ اس اجمال کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ یہ تفاصیل اپنے مقام پر آئیں گی۔ سرِدست انہی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ ماحصل یہ کہ ہر رسول اپنے اپنے وقت میں خدائی ضابطۂ قوانین اپنے ساتھ لاتا تھا (اسے الدین کہتے ہیں) اور اس کی عملی تشکیل سے بتا دیتا تھا کہ اس نظام کی اطاعت سے حکومتِ الٰہیہ کا قیام کس طرح ہو گا (اسے الاسلام کہئے)۔ لہٰذا دینِ خداوندی شروع سے ایک ہی تھا۔ لیکن رسولؐ کے بعد اس کے پیرو اس میں اختلافات پیدا کر دیتے تھے اس لئے دوسرے رسول کے ذریعے (مناسب تغیرات کے ساتھ) اسی ضابطۂ حیات کی تجدید کرا دی جاتی تھی۔ اسی حقیقتِ کبریٰ کو قرآنِ کریم نے ان درخشندہ الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ ۗ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ۗ وَمَن يَكْفُرْ بِآيَاتِ اللَّهِ فَإِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ (3/19)

بلاشبہ "الدین" (یعنی اصل دین) اللہ کے نزدیک "الاسلام" ہی ہے (اس ایک دین کے سوا اور کوئی دین نہیں) اور یہ جو اہلِ کتاب نے باہمد گر اختلاف کیا (اور گروہ بندیاں کر کے الگ الگ دین بنا لئے) تو (یہ اس لئے نہیں ہوا کہ اس دین کے سوا انہیں کسی دوسرے دین کی راہ دکھلائی گئی تھی یا دین کی راہ مختلف ہو سکتی ہے، بلکہ) اس لئے کہ علم (وحی) کے حصول کے بعد وہ آپس کی ضد اور عناد سے الگ الگ ہو گئے۔ اور یاد رکھو جو کوئی اللہ کے قوانین سے انکار کرتا ہے (اور ہدایت پر گمراہی کو ترجیح دیتا ہے) تو اللہ کا قانونِ جزا بھی حساب لینے میں سست رفتار نہیں!

دوسرے مقام پر ہے۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَ مَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَ لَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ؕ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ؕ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ وَ مَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ؕ (۱۳ — ۴۲/۱۴)

(دیکھو خدا نے) تمہارے لئے الدّین سے وہ سب کچھ واضح کر دیا ہے جس کا اُس نے نوح کو حکم دیا تھا اور جو کچھ ہم نے (اے پیغمبرِ اسلام!) تمہاری طرف وحی بھیجی ہے اور (اسی کے ساتھ ساتھ) وہ سب کچھ بھی جس کی ہم نے ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کو حکم دیا تھا (جس کا بنیادی اصول یہ ہے) کہ الدّین کو قائم رکھو اور اس کے بارہ میں فرقہ فرقہ نہ بن جاؤ۔ یہ بات جس کی طرف تم لوگوں کو بلا رہے ہو، مشرکین کو بڑی گراں گزر رہی ہے (کہ خدا نے ہمیں چھوڑ کر اس کام کے لئے محمدؐ کا انتخاب کیوں کیا)۔ اللہ جسے چاہتا ہے اپنی طرف برگزیدہ کر لیتا ہے اور جو اس کی طرف رجوع ہوتا ہے اسی کو ہدایت دیتا ہے۔ اور (دیکھو) یہ لوگ فرقوں فرقوں میں تقسیم نہیں ہوئے مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس (خدا کی طرف سے) علم (کا نور) آچکا تھا (اور وہ بھی کیوں؟) محض آپس کی عداوت کی وجہ سے!

ان حقائق کو سامنے رکھنے کے بعد قرآنِ کریم کی اس مرکزی تعلیم کا مفہوم بآسانی سمجھ میں آسکے گا۔ فرمایا۔

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَ لَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ۞ (۳/۸۳)

پھر کیا یہ لوگ چاہتے ہیں، اللہ کا دین چھوڑ کر کوئی دوسری راہ ڈھونڈ نکالیں؟ حالانکہ آسمان و زمین میں جو کوئی بھی موجود ہے، طوعاً و کرہاً سب اسی کے حکم کے فرمانبردار ہیں اور بالآخر سب اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں!

یہاں ایک اصول بیان فرمادیا۔ اس کے بعد ارشاد ہے۔

قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَ مَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ

وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰى وَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۠ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۡ وَ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ○ (۳/۸۴)

(اے پیغمبر!) تم کہہ دو (ہماری راہ تو یہ ہے کہ) ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں اور جو کچھ ابراہیمؑ اسمٰعیلؑ، اسحٰقؑ، یعقوبؑ اور یعقوب کی اولاد پر نازل ہوا تھا، اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ نیز جو کچھ موسیٰ کو اور عیسیٰ کو اور خدا کے تمام نبیوں کو خدا کی طرف سے ملا تھا، اس سب پر بھی ہمارا ایمان ہے۔ ہم ان رسولوں میں سے کسی ایک کو (بہ حیثیت منصب رسالت) دوسروں سے جدا نہیں کرتے۔ ہم خدا کے فرمانبردار ہیں (اس کی سچائی جہاں کہیں بھی اور جس کی زبانی بھی آئی تھی، سچائی تھی) اور ہم اللہ کی اطاعت کرنے والے ہیں!

یہ ہے وہ سلسلۂ رشد و ہدایت جو نوعِ انسانی کی راہ نمائی کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے قائم ہوا۔ اس لئے ہر اس شخص کے لئے جو اس آئین کے مطابق زندگی بسر کرنے کا اقرار کرتا ہے، اس حقیقت کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ تمام انبیائے کرامؑ کا سرچشمۂ تعلیم ایک ہی تھا اور وہ سب اپنے دعوائے رسالت و نبوت میں سچے تھے۔ ان کی تعلیم بھی سچی تھی، لیکن وہی تعلیم جو اُن پر نازل ہوئی تھی، نہ وہ جو دوسرے رسول کے آنے کے وقت رسولِ ماسبق کے نام لیواؤں کے پاس تھی۔ اسی لئے مَا اُنْزِلَ عَلٰى اِبْرٰهِيْمَ (جو کچھ ابراہیمؑ پر نازل کیا گیا تھا) اور وَ مَا اُوْتِيَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰى (جو موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دیا گیا تھا) پر ایمان ضروری ہے نہ کہ اس تعلیم پر جو ان حضرات کی طرف بعد میں منسوب کر دی گئی۔ اگر ان کی مسخ کردہ تعلیم پر ایمان ضروری (یا کافی) ہوتا تو کسی جدید رسول کے آنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ یہ ہے الدّین اور یہ ہے الاسلام۔ لہٰذا

وَ مَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَ هُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ○ (۳/۸۵)

اور (دیکھو) جو کوئی اسلام کے سوا (جو خدا کی طرف سے نصابِ زندگی کا آخری ایڈیشن اور مکمل نصابِ زندگی ہے) کسی دوسرے دین کا خواہشمند ہوگا، تو وہ کبھی قبول نہیں کیا جائیگا اور آخرت کے دن اس کی جگہ ان لوگوں میں ہوگی جو تباہ و نامراد ہوں گے!

اور یہ الاسلام، اب قرآن کی دفتین کے باہر کہیں نہیں۔

یہ ہے وہ سلسلۂ رسالت جو اس زمانہ سے شروع ہوا جب انسانی شعور نے اپنی آنکھ کھولی اور جادہ بجادہ، منزل بہ منزل آگے بڑھتا ہوا حضرت عیسیٰؑ تک آپہنچا۔

ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا (۲۳/۴۴)

پس ہم نے لگاتار یکے بعد دیگرے اپنے رسول بھیجے۔

آنے والے کی تصدیق

یہ سلسلہ یوں تھا کہ ہر جانے والا رسول اپنے متبعین کو تاکید کر جاتا کہ اس کے بعد جو رسول آئے اس کا اتباع کرنا۔ کیونکہ (ہر چند تمہیں اس کی تعلیم، اس مسخ شدہ تعلیم سے جو اُس وقت تمہارے پاس ہوگی، مختلف نظر آئے گی لیکن) وہ درحقیقت میری ہی تعلیم کی تصدیق کرے گا اور اسی سلسلۃ الذہب کی اگلی کڑی ہوگا۔

وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَ اَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ ؕ قَالُوْۤا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَ اَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝ (۳/۸۱)

یہ سلسلۂ ہدایت کوئی نئی چیز نہیں، بلکہ ایک ہی پیغام ہے جو شروع سے اخیر تک مسلسل چلا آرہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ انبیاء کے ذریعے ان کی اُمتوں سے عہد کر لیا کرتا تھا کہ تمہیں یہ کتاب و حکمت دی گئی ہے، لیکن اس کے بعد جب ہم (عند الضرورت) کوئی دوسرا رسول بھیجیں، جو اس تعلیم کو سچا کر دکھائے جو تمہیں دی گئی تھی، تو تم نے گروہ بندانہ تعصب کی بنا پر اس کی مخالفت نہ شروع کر دینا، بلکہ اس کی صداقت پر ایمان لانا اور اُس کی مدد کرنا۔

یہ اس قدر اہم اصول تھا کہ اللہ اُن سے بتاکید پوچھتا کہ کیا تم اس کا اقرار کرتے ہو اور مجھ سے اِس کا عہد کرتے ہو (کہ ایسا ہی کرو گے)؟ وہ کہتے کہ ہم اس کا اقرار کرتے ہیں (یعنی یہ چیزیں ان کا جزوِ ایمان ہوتی تھیں)۔ اس پر اللہ ان سے کہتا کہ اب تم اپنے اس عہد و اقرار کی نگرانی کرنا اور میں بھی اس کی نگرانی کروں گا (کہ تم اسے نباہتے ہو یا نہیں)۔

یہ اقرار، اُمم سابقہ سے لیا جاتا تھا (ایک اقرار خود انبیاء سے بھی لیا جاتا تھا جس کا ذکر

(۷/۳۳) میں آئے گا)۔

سورۂ انعام میں اس واستانِ زرّیں کو ایک ہی مقام پر یوں سمٹا کر رکھ دیا گیا ہے جیسے آسمان آنکھ کے تِل میں. فرمایا.

وَ تِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ ؕ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ○ (۶/۸۳)

اور (دیکھو) یہ ہماری حجت ہے جو ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم پر دی تھی۔ ہم جس کے مرتبے بلند کرنا چاہتے ہیں (اُسے علم و بصیرت دے کر) بلند کر دیتے ہیں اور یقیناً تمہارا پروردگار حکمت والا، علم رکھنے والا ہے !

اس کے بعد۔

وَ وَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ ؕ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ وَ نُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَ سُلَيْمٰنَ وَ اَيُّوْبَ وَ يُوْسُفَ وَ مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ ؕ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ۙ وَ زَكَرِيَّا وَ يَحْيٰى وَ عِيْسٰى وَ اِلْيَاسَ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۙ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ الْيَسَعَ وَ يُوْنُسَ وَ لُوْطًا ؕ وَ كُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۙ (۸۴ — ۶/۸۶)

اور ہم نے ابراہیم کو اسحاق اور (اسحاق کا بیٹا) یعقوب دیا۔ ہم نے ان سب کو راہِ راست دکھائی اور ابراہیم سے پہلے نوح کو دکھا چکے ہیں۔

اور ابراہیم کی نسل میں سے داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ، ہارون کو بھی (یہی) راہ دکھائی۔ ہم اسی طرح نیک کرداروں کو ان کی نیک کرداری کا بدلہ دیتے ہیں۔

اور زکریا، یحییٰ، عیسیٰ اور الیاس کو کہ یہ سب صالح انسانوں میں سے تھے۔ اور نیز اسمٰعیل، الیسع، یونس اور لوط کو، کہ ان سب کو ہم نے دنیا والوں پر برتری دی تھی۔

پھر تفصیل سے ہٹ کر اجمال آگیا۔

وَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَ ذُرِّيّٰتِهِمْ وَ اِخْوَانِهِمْ ۚ وَ اجْتَبَيْنٰهُمْ وَ هَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ○ (۶/۸۷)

اور اُن کے آباء و اجداد اور ان کی نسل اور ان کے بھائی بندوں میں سے بھی کتنوں ہی کو ہم نے اسی راہ پر چلایا ۔ ان سب کو ہم نے برگزیدہ کیا تھا اور (فلاح و سعادت کی) سیدھی راہ ان پر کھول دی تھی۔

یہ تمام حضرات اللہ کی طرف سے ہدایت لے کر آئے تھے۔

ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِىْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَ لَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (۶/۸۸)

یہ اللہ کی ہدایت ہے، اپنے بندوں میں سے جسے چاہے اس کی روشنی دکھا دے۔ اور اگر یہ لوگ (توحید کی راہ کو چھوڑ کر) شرک کرتے، تو (یقین کرو کبھی فلاح و سعادت کی راہ نہ پاتے اور) ان کا سارا کیا دھرا ضائع ہو جاتا۔

انہیں کتاب اور حکومت عطا ہوئی تھی۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ۚ فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَآءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِيْنَ ۝ (۶/۸۹)

(اے پیغمبر!) یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ہم نے کتاب اور حکومت اور نبوت (کی نعمت) عطا فرمائی۔ پھر اگر یہ (مشرکین عرب) اس نعمت سے انکار کرتے ہیں (تو انکار کریں۔ ان کے انکار سے کچھ بگڑنے والا نہیں) ہم نے اس کی پیروی و حفاظت ایک ایسے گروہ کے حوالے کر دی ہے جو (ان لوگوں کی طرح) سچائی سے انکار کرنے والا نہیں (بلکہ اس کا شناسا اور قدر شناس ہے)۔

یہی وہ ضابطۂ ہدایت ہے جس کی اقتدار آج بھی ضروری ہے۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ؕ قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ ۝ (۶/۹۰)

(اے پیغمبر!) یہ وہ لوگ ہیں جنہیں خدا نے راہِ حق دکھا دی۔ بس انہی کی راہ کی تم بھی پیروی کرو۔ تم کہہ دو " میں اس (راہنمائی) پر تم سے کوئی بدلہ نہیں مانگتا۔ یہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ تمام دنیا کے لئے (ایک فراموش کردہ حقیقت کی) یاددہانی ہے (اور جب صورت یہ ہے تو تم مجھے کتنی ہی تکلیف و اذیت دو، میں ادائے فرض سے باز آنے والا نہیں)۔

اب یہ ضابطہ قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہے، اس کے باہر صفحۂ ہستی پر اور کہیں نہیں۔ پہلی کتابوں کی اصلی تعلیم بھی اسی کے اندر محفوظ ہے۔

وَ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیۡہِ مِنَ الۡکِتٰبِ وَ مُہَیۡمِنًا عَلَیۡہِ فَاحۡکُمۡ بَیۡنَہُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ وَ لَا تَتَّبِعۡ اَہۡوَآءَہُمۡ عَمَّا جَآءَکَ مِنَ الۡحَقِّ ؕ لِکُلٍّ جَعَلۡنَا مِنۡکُمۡ شِرۡعَۃً وَّ مِنۡہَاجًا ؕ وَ لَوۡ شَآءَ اللّٰہُ لَجَعَلَکُمۡ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً وَّ لٰکِنۡ لِّیَبۡلُوَکُمۡ فِیۡ مَاۤ اٰتٰىکُمۡ فَاسۡتَبِقُوا الۡخَیۡرٰتِ ؕ اِلَی اللّٰہِ مَرۡجِعُکُمۡ جَمِیۡعًا فَیُنَبِّئُکُمۡ بِمَا کُنۡتُمۡ فِیۡہِ تَخۡتَلِفُوۡنَ ﴿ۙ۴۸﴾ (۵/۴۸)

اب' ان تمام کتبِ سابقہ کے بعد' (جب وہ اپنی اصلی حالت پر نہ رہیں اور مشیّت کے پروگرام کے مطابق وہ وقت آگیا کہ تمام نوعِ انسان کے لئے واحد اور مکمل ضابطۂ حیات دے دیا جائے جو ہمیشہ تک اُنکی راہنمائی کرے) ہم نے تیری طرف یہ کتاب نازل کی ہے جو تمام ٹھوس حقیقتوں کو اپنے آغوش میں رکھتی ہے۔ اُن تمام وعدوں اور دعووں کو سچ کر کے دکھانے والی ہے جو کتبِ سابقہ میں کئے گئے تھے اور اس اصولی تعلیم کی جامع اور نگران و نگہبان ہے جو اس سے پہلے وقتاً فوقتاً دی جاتی رہی اور جس کا ہمیشہ کے لئے غیر متبدّل رکھنا مقصود ہے۔

یہ ہے اس کتابِ عظیم کی پوزیشن۔ لہٰذا' اب تم لوگوں کے معاملات کے فیصلے اسی کتاب کے مطابق کرو اور اس قسم کے حقائق مل جانے کے بعد لوگوں کے خیالات اور خواہشات کے پیچھے مت چلو۔

اس مقام پر' ممکن ہے تمہارے دل میں یہ سوال پیدا ہو کہ اگر خدا نے تمام انسانوں کے لئے' شروع سے اخیر تک اُصولاً ایک ہی ضابطۂ حیات

تجویز کیا تھا، تو ایسا انتظام کیوں نہ کر دیا کہ تمام لوگ اس ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرتے رہتے۔ اگر خدا چاہتا تو ایسا بھی کر سکتا تھا کہ انسانوں کو، حیوانوں اور پتھروں کی طرح مجبور کر دیتا اور وہ اس کی طرف سے مقرر کردہ روش پر طوعاً وکرہاً چلتے رہتے۔ لیکن اس کے قانونِ مشیئت کا یہ تقاضا نہیں تھا۔ اس نے انسان کو صاحبِ اختیار وارادہ پیدا کیا کہ وہ جونسا راستہ جی چاہے اختیار کرلے۔ یہ وجہ ہے کہ ہم، تم میں سے ہر ایک کو، اس کے اپنے اختیار کردہ منہاج اور طریقے پر چھوڑ دیتے ہیں اور سب کو ایک ہی راستے پر چلنے کے لئے مجبور نہیں کرتے۔ انسان کا اختیار وارادہ ہی ایسے مواقع پیدا کرتا ہے کہ وہ نوعِ انسان کی بھلائی کے کاموں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ جائیں اور اس طرح خود ان کی ذات میں وسعت پیدا ہوتی جائے۔

لیکن انسان کے اختیار وارادہ کے یہ معنی نہیں کہ یہ ہمیشہ غلط راستے پر چلتا رہے گا۔ غلط راستوں پر چلنے کے تباہ کن نتائج (جنہیں زمانے کے تقاضے کہہ کر پکارا جاتا ہے) اور وحیٔ خداوندی سے متأثر فضا اسے رفتہ رفتہ بتدریج صحیح راستے کی طرف لئے چلے جائیں گے اور یوں لوگوں کی خودساختہ مختلف روشیں، زندگی کی صحیح شاہراہ میں آکر ملتی جائیں گی۔

یہ طریق کار (جسے عقل کا تجرباتی طریق کہتے ہیں) بہت طویل طویل ہوتا ہے اور اس طرح انسان کو صحیح راستے تک پہنچنے کے لئے بڑی بڑی جانکاہ مصیبتوں اور جگرپاش مشقتوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اگر انسان چاہتا ہے کہ ان تباہیوں اور بربادیوں میں سے گزرے بغیر بخیر وخوبی منزلِ مقصود تک پہنچ جائے تو اس کا طریق یہ ہے کہ وہ وحیٔ خداوندی کا اتباع کرے اور اپنے معاملات کے فیصلے اسی کے مطابق کرائے۔

یہ ہیں اس شجرِ طوبیٰ کے برگ و بار جس کی جڑیں پاتال ہیں محکم و مضبوط اور شاخیں عرش کے کنگروں کو چھو رہی ہیں۔ نوعِ انسانی کے وہ مشفق و غم گسار جنہوں نے ساری دنیا کی مصیبتیں اور مشکلیں اپنے سر پر لیں تاکہ دنیا بھر کے مصیبت زدوں کی مصیبتیں اٹھ جائیں، انہوں نے اپنے نالۂ نیم شبی اور آہِ سحر گاہی سے کائنات کی روح کو تھرتھرا دیا تاکہ جاہل اور ظالم انسان ہلاکتوں اور بربادیوں کے جہنم سے بچ جائے۔ انہوں نے اپنی مضطربانہ دعاؤں اور بے تابانہ التجاؤں سے رحمتِ الٰہی کے سحابِ کرم کو کھینچ کھینچ کر بلایا کہ انسانیت کا حاصلِ مزرع جور و استبداد کی بادِ سموم سے جھلس کر نہ رہ جائے۔ انہوں نے سرِ مژگاں چمک جانے والے ستاروں اور مقدس رخساروں پر ڈھلک آنے والی آبشاروں سے انسانی بدبختیوں کے ظلمت ناک دھبوں کو دھوڈالنے کی کوشش کی لیکن جب سرکش اور متمرد انسانوں نے اپنی روشِ تغلّب و استیلا، کو کسی طرح نہ چھوڑنا چاہا تو وہ جلالِ آسمانی کی آتشیں شمشیر لے کر آگے بڑھے اور ہر طاغوتی قوت پر برقِ خاطف بن کر گرے اور یوں ان کمزور و ناتواں انسانوں کو جنہیں زمانہ اس جرم کی پاداش میں ہدفِ جور و ستم بنا رہا تھا کہ وہ قوانینِ خداوندی کے سامنے کیوں جھکتے ہیں، خاک کی پستیوں سے اٹھا کر آسمان کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ دنیا میں انسانی قوانین کی جگہ خدائی نظامِ زندگی نے لے لی جس کے سایۂ عاطفت میں انسانیت، بڑھتی، پھولتی، پھلتی اس مقام کی طرف رواں دواں جادہ پیما ہوئی جو اس کا منتہیٰ و مقصود تھا۔ خدا کی رحمت ہو ان برگزیدہ انسانوں پر جنہوں نے دنیا کو بتا دیا کہ زمین پر اللہ کی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے؟

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝ وَ سَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ۝ وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (۱۸۰ — ۳۷/۱۸۲)

(اے پیغمبرِ اسلام!) تیرا پروردگار، پروردگارِ عزت بہت بلند ہے، اُس سے بھی بڑھ کر جو لوگ بیان کرتے ہیں۔ اور (اس کے) رسولوں پر سلامتی ہو اور ہر قسم کی تعریفیں خدا، ربّ العٰلمین ہی کو سزاوار ہیں۔

حضور خاتم النبیینؐ کے بعد[1] (کوئی رسول اور نبی نہیں آسکتا)۔ یہ سلسلۂ حکومتِ خداوندی کس طرح آگے

---

[1] "ابلیس و آدم" عنوان رسالت میں بیان کیا جا چکا ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے رسول اور نبی میں کوئی فرق نہیں اور تشریعی

(بقیہ فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر)

چلے گا اور کس طرح قرآنِ کریم تمام نوعِ انسانی کے لئے عملی زندگی بنے گا' اس کی تفصیل "معراجِ انسانیت" میں ملے گی۔

اُمّت آگے بڑھنے سے پہلے ایک ضروری نکتہ کی وضاحت ضروری ہے۔ الدّین تو شروع سے ایک ہی چلا آتا ہے لیکن انسانوں کی اُمت اُس رسول کی نسبت سے ہوتی ہے جسے وہ خدا کا آخری رسول مانتے ہیں۔ مثلاً عیسائی' یہودیوں کی طرح تمام انبیائے بنی اسرائیل کو بھی مانتے ہیں لیکن وہ یہودیوں سے الگ اور متمیز امّت اس لئے قرار پاتے ہیں کہ وہ آخر میں حضرت عیسیٰؑ پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔ وہ اپنے اس ایمان کی جہت سے ایک الگ امّت قرار پاتے ہیں۔ اسی طرح ایک عیسائی جب نبیٔ اکرمؐ پر ایمان لاکر مسلمان ہوجاتا ہے تو وہ امّتِ نصاریٰ کا فرد نہیں رہتا' امّتِ محمدیہ کا فرد قرار پاجاتا ہے کیونکہ وہ حضرت عیسیٰؑ کے بعد ایک اور رسول پر بھی ایمان لے آیا ہے۔ ہم امّتِ محمدیہؐ تمام انبیائے سابقہ کے بعد نبیٔ اکرمؐ پر ایمان کی رُو سے قرار پاتے ہیں۔ اس سے واضح ہے کہ اگر کوئی شخص' نبیٔ اکرمؐ سمیت تمام انبیائے سابقہ پر بھی ایمان رکھتا ہے لیکن نبیٔ اکرمؐ کے بعد کسی اور کو بھی نبی تسلیم کرتا ہے تو وہ (اوپر بیان کردہ اصول کے مطابق) اُمّتِ محمدیہ کا فرد نہیں رہتا، اس نئے نبی کی نسبت سے ایک الگ امّت کا فرد قرار پاجاتا ہے۔ نبیٔ اکرمؐ کو خاتم الانبیاء تسلیم کرنے کے معنی یہ ہیں کہ خدا کی طرف سے دیئے گئے الدّین کی رُو سے امّتِ محمدیہ خاتم الامم بھی ہے: قرآن خدا کی آخری کتاب' محمدؐ رسول اللہ خدا کے آخری رسول اور اُمّتِ محمدیہ آخری اُمّت۔

(گذشتہ صفحے کا بقیہ فٹ نوٹ)۔

اور غیر تشریعی کی تفریق بھی ذہنِ انسانی کی خود ساختہ ہے۔ ہر رسول یا نبی خدا کا پیغام لے کر آتا ہے اور وہی پیغام اس کی کتابِ شریعت ہوتا ہے۔

اور یہ ہیں اُممِ گذشتہ

باز خوانم قصّۂ پارینہ اَت
تازہ سازم داغہائے سینہ اَت

تِلکَ اُمَّۃٌ قَد خَلَت

(اور یہ ہیں ــــــ اقوامِ سابقہ)

نور و نکہت کے اس کاروانِ رشد و ہدایت کی جمال آفرینیوں اور جلال انگیزیوں میں ہم اس درجہ محو رہے کہ ان وادیوں اور شاخساروں کی تفصیلات کو اچھی طرح دامنِ نگاہ میں نہ سمیٹ سکے جن سے یہ قافلہ گزرا ہے۔ آیئے ایک طائرانہ نگاہ ان پر بھی ڈالتے چلیں' اس لئے کہ حضرات انبیائے کرامؑ کے سلسلۂ تعلیم و تبلیغ کے ساتھ جب تک ان اقوام و ملل کے احوال و ظروف سامنے نہ آجائیں جن کی طرف وہ حضرات مبعوث ہوتے تھے' وہ مقصد پورا نہیں ہو سکتا جس کے لئے قرآنِ کریم نے اس سلسلہ کو اس شرح و بسط سے بیان کیا ہے۔ اقوامِ سابقہ کی تفاصیل جوئے نور' برقِ طور اور زیرِ نظر کتاب کے سابقہ اوراق میں آچکی ہیں۔ آیندہ سطور میں فقط ان اصول و اساسات کی یاد تازہ کرائی جائے گی جن کے ماتحت وہ واقعات ظہور پذیر ہوتے تھے۔

انسان کا سب سے بڑا شرف علم ہے اور حصولِ علم کے اہم گوشے مشاہدات و تجربات۔ مشاہدات' انسان کی اپنی نگاہ تک محدود ہوتے ہیں اور تجربات اس کی اپنی عملی زندگی میں محصور۔ لیکن جب ایک فرد یا ایک زمانہ کے تجارب و مشاہدات کو اگلی نسلوں تک منتقل کر دیا جائے تو اسے تاریخ کہتے ہیں۔ تاریخ دنیائے انسانیت کا اہم ترین شعبہ ہے۔ انسان کی تمام ترقیوں کا راز اسی میں مضمر ہے۔ زمانہ اپنی ارتقائی منازل اسی کے سہارے طے کرتا ہے۔ انسان کی علمی سطح اسی کے بل بوتے پر بلند ہوتی ہے۔ تہذیب و تمدّن کی جس قدر متاعِ گراں

اور علم و سائنس کی جس قدر تابناک روشنی آپ کو آج (یا جب اور جہاں کہیں) نظر آئے وہ تاریخ ہی کی رہینِ منت ہوگی۔

علمِ تاریخ تاریخ کیا ہے؟ قرنہا قرن کی انسانی جد و جُہد کا ماحصل، ہزار ہا سال کی مسلسل و متواتر تگ و دَو کا نچوڑ، اقوام و ملل کی سینکڑوں پشتوں اور نسلوں کا اندوختہ، ایک دریائے علم و ہنر جو اپنے منبع کے قریب ایک جوئے کم آب سے زیادہ نہ تھا لیکن جوں جوں آگے بڑھتا گیا ساحل ناآشنا ہوتا چلا گیا۔ آج آپ بلا تامّل و کاوش سنکھیا کی ڈلی کو دور پھینک دیتے ہیں اور شکر کی ڈلی کو مُنہ ڈال لیتے ہیں لیکن آپ کو کیا معلوم کہ سنکھیا اور شکر میں تمیز کرنے کے لئے زمانے کو کتنی قربانیاں دینی پڑی ہوں گی۔ آج آپ کا موٹر بلا تکان ساٹھ میل فی گھنٹے کی رفتار سے فرّاٹے بھرتا اُڑے چلا جاتا ہے لیکن آپ کیا جانیں کہ پہیئے کی ایجاد سے لے کر موٹر کی ساخت تک ذہنِ انسانی کو کن کن سنگلاخ وادیوں اور ناہموار پتھریلی شاہراہوں سے گذرنا پڑا ہوگا۔

لیکن یہ سب ترقی کس طرح ہو رہی ہے؟ اس عروج و ارتفاع کا راز کیا ہے؟ انسان اپنے تاریخی سرمایہ (یعنی آباء و اجداد کے تجربات و مشاہدات) سے کس طرح اتنا بیش بہا فائدہ اٹھا رہا ہے؟ اس کا جواب ایک اور فقط ایک ہے اور وہ یہ کہ فطرت کے قوانین اٹل ہیں[1]۔ آج سے دس ہزار سال پیشتر انسان نے دیکھا کہ سمّ الفار انسانی زندگی کے لئے مہلک ہے۔ ہم آج بھی اس کی ہلاکت آفرینی پر بلا تردّد و تامّل یقینی حکم لگا دیتے ہیں۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ ہمیں معلوم ہے کہ مرورِ زمانہ سے سمّ الفار (سنکھیا) کی تاثیر نہیں بدل سکتی۔ اگر یہ دس ہزار سال پیشتر زہر تھا تو آج بھی زہر ہی ہے۔ اگر افریقہ میں زہر تھا تو امریکہ میں بھی زہر ہے۔ اس لئے کہ فطرت کے قوانین اٹل ہیں۔ یہ تمام سلسلۂ کائنات صرف اسی ایک عمود پر گھوم رہا ہے کہ فطرت کے قوانین اٹل ہیں۔

پھر یہ کہ فطرت کے قوانین کا دائرہ عمل فقط طبیعی دنیا PHYSICAL WORLD تک ہی محدود نہیں۔ انسانی حیاتِ اجتماعیہ سے متعلق بھی قوانین اسی طرح اٹل ہیں۔ اگر صحیح قوانین کے خلاف زندگی بسر کرنا جوہرِ انسانیت کی بالیدگی کے لئے دس ہزار سال پیشتر مہلک تھا تو آج بھی اسی طرح مہلک ہے۔ یہ فطرت کا اٹل قانون ہے۔ اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے اگر طبیعی دنیا میں تاریخ (یعنی

---

[1] یہ کن معانی میں اٹل ہیں، اس کی طرف "ابلیس و آدم" عنوان "وحی" میں اشارہ کیا جا چکا ہے۔

انسانی مشاہدات وتجارب کا آگے منتقل ہوتے جانا)، انسانی عروج وارتقاء کا نقطۂ ماسکہ ہے تو دنیائے عمرانیت واجتماعیت میں بھی تاریخ یہی اہمیت لئے ہوئے ہے۔

قرآنِ کریم قدم قدم پر تاریخی مطالعہ پر زور دیتا ہے۔ وہ اپنے محکم اور اٹل دعاوی کی تائید میں تاریخی نظائر و شواہد پیش کرتا ہے اور ہر صاحبِ بصیرت کو دعوتِ غور و فکر دیتا ہے کہ جب فلاں قسم کی روشِ زندگی نے فلاں فلاں وقت میں فلاں قسم کا

تاریخ اور قرآن

نتیجہ پیدا کیا تھا تو کیا وہی روشِ زندگی آج بھی اسی قسم کا نتیجہ پیدا نہ کرے گی؟ یہ ہے مقصد قرآنِ کریم میں اُممِ سابقہ اور اقوامِ گذشتہ کے احوال وظروف بیان کرنے کا! حقیقت یہ ہے کہ تاریخ کو ایک سائنس کی حیثیت سے سب سے پہلے قرآنِ کریم ہی نے پیش کیا، ورنہ اس سے بیشتر تاریخ وقائع نگاری کی حد سے آگے نہ بڑھی تھی۔ سائنس کہتے ہی اسے ہیں کہ آپ مشاہدہ اور تجربہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچیں کہ فلاں قانون (یا اصول) کے مطابق کام کرنے سے فلاں قسم کا نتیجہ مرتب ہوتا ہے یا جب کوئی واقعہ آپ کے سامنے آئے تو آپ یہ کہہ سکیں کہ یہ فلاں قانون یا اصول کے مطابق ظہور میں آیا ہے۔ اقوامِ عالم کے سلسلہ میں اس کو ان الفاظ میں پیش کیا جاتا ہے کہ "تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے"؛ یعنی ہم نے دیکھا کہ فلاں زمانہ میں فلاں قوم میں اس قسم کی نفسیاتی تبدیلیاں پیدا ہوئیں تو ان سے اس قسم کے نتائج ظہور میں آئے۔ اس کے بعد جب بھی اس قسم کے اسباب پیدا ہوں گے، اسی قسم کے نتائج مرتب ہوں گے اور یہ سب اس لئے کہ نگارخانۂ ہست وبود یونہی اتفاقیہ وجود میں نہیں آگیا، بلکہ ایک خاص مقصد کے ماتحت عمل میں لایا گیا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جو چیز کسی خاص منتہیٰ کو پیشِ نظر رکھ کر پیدا کی گئی ہو اس کی ہر حرکت ایک خاص قاعدہ اور قانون کے تحت واقع ہونی چاہیئے۔ اسی کو قانونِ فطرت کہتے ہیں۔ سورۃ انبیاء کی مندرجہ ذیل آیات پر غور فرمایئے اور دیکھئے کہ اس حقیقتِ کبریٰ کو قرآنِ کریم نے کس حسن وزیبائی سے چند جملوں میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔

وَ كَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَّ اَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ٥ فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَأْسَنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَرْكُضُوْنَ ٥ؕ لَا تَرْكُضُوْا وَ ارْجِعُوْٓا اِلٰى مَآ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ وَ مَسٰكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْئَلُوْنَ ٥ قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ٥

فَمَا زَالَتْ تِّلْكَ دَعْوٰىهُمْ حَتّٰى جَعَلْنٰهُمْ حَصِيْدًا خٰمِدِيْنَ۝

(۲۱/۱۵—۱۱)

اور کتنی ہی بستیاں جو ظلم و فساد میں غرق تھیں ہمارے قانونِ مکافات کے مطابق تباہ ہوگئیں اور ان کے بعد ہم نے دوسرے گروہوں کو اٹھا کھڑا کیا. جب ہمارا عذاب انہوں نے محسوس کیا تو وہ اپنی بستیوں سے بھاگ اٹھے. لیکن ہمارے قانونِ مکافات نے آواز دی کہ اب بھاگتے کہاں ہو؟ اسی عیش و عشرت میں لوٹو (جس نے تمہیں اس قدر سرشار کر رکھا تھا) اور انہی مکانوں میں (جن کی مضبوطی کا تمہیں غرّہ تھا). وہاں تم سے پوچھا جائے گا (کہ تمہیں اس عیش پرستی کا حق کیسے حاصل تھا). بستیوں کے باشندوں نے پکارا، افسوس ہم پر. ہم بلاشبہ ظلم کرنے والے تھے. تو دیکھو وہ برابر یہی پکارا کئے. یہاں تک کہ ہمارے قانونِ مکافات کے مطابق وہ ہلاک ہوگئیں کٹے ہوئے کھیت کی طرح، بجھے ہوئے انگاروں کی طرح.

ان آیات کو سرسری نگاہ سے نہ دیکھئے. ان پر ایک مرتبہ پھر بنگاہِ تدبر غور کر لیجئے اس لئے کہ ان میں قانونِ فطرت کا ایک نہایت اہم گوشہ سامنے لایا گیا ہے، یعنی قانونِ مکافات جو فطرت کے ہر قانون کی طرح اٹل اور محکم ہے. اس کے بعد فرمایا.

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ۝ لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ۝ (۲۱/۱۷—۱۶)

اور دیکھو ہم نے آسمان و زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، کچھ کھیل تماشا کرتے ہوئے نہیں بنایا ہے. اگر ہمیں کھیل تماشا بنانا منظور ہوتا تو (ہمیں اس سے کون روک سکتا تھا؟) ہم خود اپنی جانب سے ایسا ہی کارخانہ بناتے. مگر ہم ایسا کرنے والے نہ تھے.

آپ نے غور فرمایا کہ سابقہ آیات اور ان آیات میں کیسا ربطِ مضمون ہے، کس قدر گہرا تعلق ہے! فرمایا کہ یہ تمام سلسلۂ کائنات ایک خاص مقصد کے ماتحت عمل میں لایا گیا ہے. اس لئے یہاں ایک عالمگیر قانون کام کر رہا ہے. اور وہ قانون ہے حق و باطل کی باہمی کشمکش کا.

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ؕ

وَ لَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ ۝ (۲۱/۱۸)

بلکہ (یہاں حقیقتِ حال ہی دوسری ہے) ہم حق سے باطل پر چوٹ لگاتے ہیں تو وہ باطل کا سر کچل ڈالتا ہے اور اسے فنا کر دیتا ہے۔ افسوس تم پر۔ تم کیسی کیسی باتیں بیان کرتے ہو!

دنیا میں جو چیز حق پر ہے (یعنی قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کر رہی ہے) وہ باقی رہے گی۔ وہ آگے بڑھے گی۔ جو اس کے خلاف روش اختیار کرے گی، رُک جائے گی، مٹ جائے گی۔ عالمِ آفاق کی کوئی شے ہو یا انسانوں کی کوئی جماعت، سب کے لئے ایک ہی قانون نافذ العمل ہے۔ کائنات کیا ہے، اس اہم قانون کے زندہ شواہد کا مجموعہ۔ اور سچی تاریخ کیا ہے، اس قانون کی عملی صداقتوں کا صحیفہ! اس لئے قرآن کریم نے جہاں اس عالمگیر قانون کو پیش کیا ہے جس کے ماتحت حق و باطل کے تصادم و تزاحم کے فیصلے ہوتے ہیں، وہاں وہ امم سابقہ کی تاریخ کو بھی سامنے لایا ہے، تاکہ اس قانون کی صداقت پر خود انسانی سرگذشت شہادت دیدے۔

وَ لَقَدْ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكُمْ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ وَّ مَثَلًا مِّنَ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ وَ مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ع (۲۴/۳۴)

(اے پیروانِ دعوتِ ایمانی!) بلاشبہ ہم نے تمہاری طرف حقیقت کو واضح کرنیوالے قوانین اور ان قوموں کی مثالیں جو تم سے پہلے گزر چکی ہیں اور تقویٰ شعار لوگوں کے لئے نصیحت (کی باتیں) اتار دی ہیں (تاکہ تم ان پر غور کرو اور اس سے فائدہ اٹھاؤ)۔

سُنّۃ اللہ

یہ عالمگیر قانون جو قوموں کی موت و حیات اور عروج و زوال کو منضبط کرتا ہے، سنت اللہ (یعنی خدا کا مقرر کردہ قاعدہ) کہلاتا ہے۔ سورۂ مومن میں ہے۔

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ كَانُوْۤا اَكْثَرَ مِنْهُمْ وَ اَشَدَّ قُوَّةً وَّ اٰثَارًا فِي الْاَرْضِ فَمَاۤ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ (۴۰/۸۲)

(اے پیغمبرِ اسلام) کیا یہ منکرینِ دعوتِ ایمانی زمین میں گھومے پھرے نہیں کہ ان لوگوں کا انجام دیکھ لیتے جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں۔ وہ لوگ تعداد میں بھی ان سے زیادہ اور طاقت اور زمینی استحکامات میں بھی ان سے بڑھ کر مضبوط تھے (مگر کیا ہوا؟ جب خدا کا فیصلہ یعنی

قانونِ مکافات کے مطابق ظہورِ نتائج کا وقت آیا) تو جو کچھ (استحکامات وغیرہ) وہ کرتے رہتے تھے (خدا کے عذاب کے مقابلہ میں) ان کے کسی کام نہ آسکے۔

ایسا کیوں ہوا؟ اس لئے کہ

فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ○ (۴۰/۸۲)

جب ان کے پاس ان کے رسول واضح قوانین کو لے کر آئے (تو ان پر غور و خوض کرنے کے بجائے) اپنے اُس (ناقص و ناکارہ) علم پر اترانے لگے جو ان کے پاس (آبار و اجداد سے چلا آرہا) تھا اور ان کی وہ باتیں خود انہی پر مسلط ہو کر رہیں جن کے ساتھ وہ لوگ (انبیاء کا) مذاق اڑایا کرتے تھے۔

اس پر جب ان کے اعمال کے ظہورِ نتائج کا وقت آگیا تو وہ چلا اُٹھے کہ

فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَ كَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ ○ (۴۰/۸۴)

پھر جب انہوں نے ہمارے عذاب کو دیکھا تو چلانے لگے کہ ہم خدائے یکتا و یگانہ پر ایمان لائے اور ہم نے اُن (جھوٹے خداؤں) کا انکار کیا جن کو ہم خدا کے ساتھ شریک کرنے والے تھے۔

لیکن مُہلت کا وقفہ گزر جانے کے بعد نتائج برآمد ہو کر رہتے ہیں۔ یہ اللہ کا مقررہ قاعدہ (سنّت اللہ) ہے۔

فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا ؕ سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ ۚ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ ○ (۴۰/۸۵)

لیکن جب تباہی ان کے سر پر آن کھڑی ہوئی تو ان کا یہ ایمان انہیں نفع دینے والا نہیں تھا یہی اللہ کا قانون ہے جو اس کے بندوں میں چلا آرہا ہے اور یہاں (یعنی اس حد تک پہنچ کر) انکار کرنے والے (ہمیشہ) خسارہ ہی میں رہے۔

یہ سنّت اللہ (مقررہ قاعدہ) کسی ایک جماعت، ایک زمانہ یا ایک جگہ تک محدود نہ تھا۔ یہ مکافاتِ عمل کا عالمگیر قانون ہے۔ اس لئے جہاں جہاں انسان تھا، یہ قاعدہ کارفرما رہا، اممِ گذشتہ میں بھی اور آج بھی۔

سُنَّةَ اللّٰهِ فِى الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ

تَبْدِيْلًا ○ (۳۳/۶۲)

ان لوگوں میں جو پہلے گزر چکے ہیں، اللہ کا مقررہ قانون یہی تھا اور (اے پیغمبر اسلام! آیندہ بھی) تم اللہ کے مقررہ قانون میں ہرگز ہرگز کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے!

اس لئے کہ اللہ کے قوانین محکم اور اٹل ہوتے ہیں۔

مَا كَانَ عَلَى النَّبِيِّ مِنْ حَرَجٍ فِيمَا فَرَضَ اللّٰهُ لَهٗ ۚ سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا ۙ○ (۳۳/۳۸)

ایسا کام کرگزرنے میں نبی پر کوئی مضائقہ نہیں ہے جسے اللہ نے اس کے لئے مقرر کر دیا ہے۔ ان لوگوں میں جو پہلے ہو گزرے ہیں یہی اللہ کا مقررہ قانون رہا ہے اور اللہ کا ہر کام اندازہ پر مقرر کیا ہوا ہے۔

اس قانون میں کبھی تبدل و تحول نہیں ہو سکتا۔

نِ اسْتِكْبَارًا فِي الْاَرْضِ وَمَكْرَ السَّيِّئِ ۚ وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ ۚ فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّتَ الْاَوَّلِيْنَ ۚ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا ○

(۳۵/۴۳ نیز ۲۳/۴۸)

(خدا کی) زمین میں تکبر کرنے اور تخریب کی خفیہ تدابیر کی وجہ سے (ان کی بیزاری ہی بڑھتی رہی) اور (یاد رکھو) تخریب کی خفیہ تدابیر اپنے کرنے والوں کے سوا کسی اور پر مسلط نہیں ہوتیں۔ تو کیا یہ لوگ پہلے لوگوں کے طریقہ ہی کا انتظار کر رہے ہیں۔ (اگر ایسا ہے تو اے پیغمبر!) تم ہرگز ہرگز خدا کے مقررہ قانون میں نہ کوئی تبدیلی اور نہ ہی اس کے مقررہ قاعدے میں کسی قسم کا تغیر پاؤ گے۔

اسی طرح حق پرستوں کی جماعت کے متعلق فرمایا۔

سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا ۧ (۱۷/۷۷)

ہم تجھ سے پہلے جو پیغمبر بھیج چکے ہیں ان سب کے معاملہ میں ہمارا ایسا ہی قاعدہ رہا ہے
اور تو ہمارے ٹھہرائے ہوئے قاعدوں کو کبھی بدلتا ہوا نہ پائے گا۔

اور ان کی مخالفت کرنے والے سرکشوں کے متعلق۔

وَ مَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰى
وَ يَسْتَغْفِرُوْا رَبَّهُمْ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ اَوْ
يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا ۝ (۱۸/۵۵ نیز ۸/۳۸)

اور جب لوگوں کے سامنے ہدایت آگئی، تو ایمان لانے اور طلب گارِ حفاظت ہونے سے انہیں
کونسی بات روک سکتی ہے؟ مگر یہی کہ اگلی قوموں کا سا معاملہ انہیں بھی پیش آجائے یا ہمارا
عذاب سامنے آکھڑا ہو۔

اس لئے کہ زمانہ کے بدل جانے سے طریقِ کار کی شکلوں میں تبدیلی ہو سکتی ہے، اصل روح ہر جگہ وہی کارفرما رہتی ہے۔ سورۂ ذاریات میں ہے۔

كَذٰلِكَ مَآ اَتَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا
سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ۝ اَتَوَاصَوْا بِهٖ ۚ بَلْ هُمْ قَوْمٌ
طَاغُوْنَ ۝ (۵۲-۵۳/۵۱)

بالکل اسی طرح ان سے پہلی قوموں کے پاس کوئی رسول نہیں آیا مگر انہوں نے (ہمیشہ) یہی
کہا کہ یہ جھوٹا ہے یا کوئی پاگل ہے۔ کیا اس جواب کی یہ ایک دوسرے کو نصیحت کرتے چلے
آئے ہیں؟ (نہیں) بلکہ یہ لوگ دراصل سرکش قوم (کے افراد) ہیں (اور خوئے سرکشی ان سب
کی گفتگو تک میں یکسانیت پیدا کرتی چلی آئی ہے)۔

یعنی اس کی ضرورت نہیں کہ پہلی سرکش اور گمراہ قومیں آنے والی قوموں کے لئے وصیت چھوڑ جائیں کہ جب تمہیں حق کی دعوت دی جائے تو تم اس قسم کی روش اختیار کرنا۔ سرکش جذبات کا ہر جگہ تقاضا ہے کہ وہ اسی قسم کی روش اختیار کریں۔ سانپ کا بچہ کتابیں پڑھ کر ڈسنا نہیں سیکھتا۔ یہ اس کی فطرت کی گہرائیوں میں مضمر ہوتا ہے۔ اس لئے حق و باطل کے معرکہ میں ہر مقام پر اور ہر زمانہ میں تزاحم و تصادم بھی اپنی روح کے اعتبار سے ایک جیسا ہوگا اور نتیجہ بھی یکساں۔ فرق صرف طریقِ کار میں ہوگا۔

نہ ستیزہ گاہ جہاں نئی، نہ حریف پنجہ فگن نئے
وہی فطرتِ اسد اللٰہی، وہی مرحبی، وہی عنتری

ایک بنیادی اصول

یہ سنت اللہ کیا ہے؟ بالکل سیدھی سادی بات واضح، بیّن، غیر مبہم اور نہایت آسانی سے سمجھ میں آجانے والی۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۙ وَ اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۙ (۸/۵۳)

(اور) یہ بات اس لئے ہوئی کہ اللہ کا مقررہ قانون ہے کہ جو نعمت وہ کسی گروہ کو عطا فرماتا ہے اسے پھر کبھی نہیں بدلتا جب تک کہ اس گروہ کے افراد اپنی نفسیاتی کیفیت نہ بدل لیں۔ یہ اس لئے کہ اللہ (سب کی) سنتا اور (سب کچھ) جانتا ہے!

نعمتیں ملتی اسے ہیں جو اس کا اہل ہوتا ہے۔ پھر جب تک کوئی قوم اپنے اندر اہلیت رکھتی ہے، ان نعمتوں سے سرفراز رہتی ہے۔ لیکن جب وہ اپنے تصوراتِ زندگی (مَا بِاَنْفُسِهِمْ) آئینِ حیات (مَا بِاَنْفُسِهِمْ) نفسیاتی کیفیات (مَا بِاَنْفُسِهِمْ) کو بدل ڈالتی ہے اور اسے قوانینِ خداوندی کے بجائے انسانوں کے خود ساختہ آئین کے تابع لے آتی ہے، تو اس تبدیلی کا فطری نتیجہ انعاماتِ الٰہیہ سے محرومی ہوتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ؕ (۱۳/۱۱)

اللہ کبھی اس حالت کو نہیں بدلتا جو کسی گروہ کو حاصل ہوتی ہے، جب تک کہ وہ خود ہی اپنی نفسیاتی کیفیت نہ بدل ڈالے۔

ایمان کا مفہوم

یہی نفسیاتی کیفیت (مَا بِاَنْفُسِهِمْ) ہے جسے قرآن کی اصطلاح میں ایمان کہا جاتا ہے۔ خارجی تبدیلی اس داخلی تبدیلی کا فطری نتیجہ ہوتی ہے۔ ذہنی تصورات اور قلبی کیفیات کے بدل جانے سے باہر کی پوری دنیا بدل جاتی ہے۔ اس لئے جسے "خدا کا عذاب" کہا جاتا ہے، وہ کہیں خارج سے نازل نہیں ہوتا۔ انہی داخلی کیفیات و تصورات کے بدل جانے سے صلاحیت اور اہلیت ختم ہو جاتی ہے اور خارج کی وہ معاندانہ قوتیں جو اس سے بیشتر ان

کی داخلی صلاحیت وقوت کی وجہ سے ان کے مقابل آنے کی ہمت نہیں باقی تھیں، اُبھر کر سامنے آجاتی ہیں اور غلبہ پالیتی ہیں۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ ایک قوم اپنے اندر زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کی صلاحیتیں رکھے اور وہ ہلاک کردی جائے۔

وَ مَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّ اَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ (۱۱/۱۱۷)

اور (یاد رکھو) ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا کہ تمہارا پروردگار آبادیوں کو ناحق ہلاک کردے درآنحالیکہ اس کے باشندوں میں زندہ رہنے کی صلاحیت موجود ہو۔

ہلاکت کیسے ہوتی ہے

ہلاکت تو ہوتی ہی اس وقت ہے جب وہ قوم سلامتی کی راہ کو چھوڑ کر غیر خداوندی راہیں (فسق) اختیار کرلیتی ہے۔

فَهَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ (۴۶/۳۵)

تو کیا غیر خداوندی راہیں اختیار کرنے والی قوم کے سوا کوئی اور بھی ہلاک کئے جاسکتے ہیں؟ (ہرگز نہیں)۔

اس حقیقت کو اچھی طرح یاد رکھئے کہ اس کارگہ سعی وعمل میں جو زندہ رہتا ہے، دلیل وبرہان کے ماتحت زندہ رہتا ہے۔ جو ہلاک ہوتا ہے وہ بھی قاعدہ اور قانون کے ماتحت ہلاک ہوتا ہے۔

لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّ يَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ۙ (۸/۴۲)

اس لئے کہ جسے ہلاک ہونا ہے، دلیل وبرہان کے مطابق ہلاک ہو اور جو زندہ رہنے والا ہے دلیل وحجت کے مطابق زندہ رہے۔ بلاشبہ اللہ سب کی سنتا اور سب کچھ جانتا ہے!

نہ یونہی (بلا ایمان اور سعی وعمل) سرفرازیاں حاصل ہوتی ہیں نہ ہی اندھا دھند نکبت وزوال کا رسواکن عذاب نازل ہوجاتا ہے۔ یہ نظامِ کائنات، عدل وانصاف پر چل رہا ہے، ظلم وجور پر نہیں چل رہا۔

---

[1] اس میں شبہ نہیں کہ بعض اوقات یہ تباہی حوادثِ ارضی وسماوی کی شکل میں بھی آتی ہے۔ مثلاً سیلاب، زلزلہ، کوہِ آتش فشاں کی ہلاکت سامانی، لیکن اس کی وجہ "جوئے نور" میں (عنوان حضرت نوحؑ میں) بیان کی جاچکی ہے۔ وہاں دیکھ لیجئے۔ یہ ضروری ہے۔

فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَ لٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝

(۹/۷۰ ؛ نیز ۲۹/۴۰ ؛ ۹۹ — ۱۱/۱۰۱)

اور ہرگز ایسا نہیں ہو سکتا تھا کہ اللہ ان پر ظلم کرتا، مگر وہ خود ہی اپنے اوپر ظلم کرتے تھے۔

خدا کا قانون یہ ہے کہ ہلاکت اور تباہی ہمیشہ انسان کے اپنے کاموں کی وجہ سے آتی ہے۔

وَ مَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَ يَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ؕ (۴۲/۳۰)

اور (یاد رکھو) جو کچھ مصیبت تمہیں پہنچتی ہے وہ خود تمہارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہے اور بہت سی باتوں کو تو خدا معاف کر دیتا ہے[1]۔

اگر قوم نوح غرق ہوئی تھی تو اپنی ہی خطاؤں کے باعث۔

مِمَّا خَطِيْٓـٰٔتِهِمْ اُغْرِقُوْا (۷۱/۲۵)

(دیکھو) وہ خود اپنی ہی خطاؤں کے باعث غرق کئے گئے

اور اگر قوم ثمود تباہ ہوئی تھی تو اپنے ہی جرائم کی وجہ سے۔

فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا ۙ۬ فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا ۝ (۹۱/۱۴)

پھر انہوں نے اللہ کے رسول کو جھٹلایا۔ چنانچہ ناقہ کی کونچیں کاٹ ڈالیں۔ پس ان کے پروردگار نے اپنے قانونِ مکافات کی رُو سے' ان کی غلط روش کی وجہ سے ان کو ملیا میٹ کر دیا اور (زمین کے) برابر کر ڈالا۔

وقس علیٰ ہذا۔ ورنہ اگر کوئی قوم صحیح راہوں پر چلتی جائے تو اللہ کو کیا پڑی ہے کہ انہیں خواہ مخواہ تباہ و برباد کر دے۔ یہ اس کے قانونِ عدل و انصاف کے خلاف ہے۔

مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَ اٰمَنْتُمْ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ۝ (۴/۱۴۷)

---

[1] معاف کر دینے کے معنی یہ ہیں کہ کوئی صحیح عمل اس طرح کیا جائے کہ اس کے اچھے اثرات مضر اثرات پر غالب آجائیں۔

(لوگو!) اگر تم شکر کرو (یعنی خدا کی نعمتوں کی قدر کرو اور انہیں ٹھیک ٹھیک کام میں لاؤ) اور خدا پر ایمان رکھو، تو خدا کو تمہیں عذاب دے کر کیا کرنا ہے؟ یعنی وہ کیوں خواہ مخواہ تمہیں عذاب دے؟) خدا تو (انسانی اعمال کا) قدر شناس اور (ان کی حالت کا) علم رکھنے والا ہے۔

ہلاکت و بربادی تو آتی ہی اس وقت ہے جب کوئی قوم قوانینِ الٰہیہ سے مُنہ موڑ کر اپنے آپ کو اللہ کی حفاظتؐ صیانت سے باہر لے جاتی ہے اور پھر دنیا میں کوئی ایسی قوّت نہیں ہوتی جو ان کی پشت و پناہ بن سکے۔

اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا کَیْفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِہِمْ ؕ دَمَّرَ اللّٰہُ عَلَیْہِمْ ۫ وَ لِلْکٰفِرِیْنَ اَمْثَالُہَا ○ ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰہَ مَوْلَی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ اَنَّ الْکٰفِرِیْنَ لَا مَوْلٰی لَہُمْ ○ (۱۰ — ۴۷/۱۱)

کیا وہ لوگ زمین میں گھومے پھرے نہیں کہ (اچھی طرح نگاہِ عبرت سے) دیکھ لیتے کہ ان لوگوں کا جو اُن سے پہلے گزر چکے ہیں کیسا (دردناک) انجام ہوا ہے۔ خدا کے قانونِ مکافات نے انہیں تباہ و برباد کر ڈالا۔ اور (یاد رکھو ان) انکار کرنے والوں کے لئے بھی ان ہی جیسا (انجام) ہونا ہے۔ یہ محض اسی لئے ہے کہ خدا (صرف) اُن کا حامی و ناصر ہے جو اس کے قوانین کی صداقت پر ایمان لے آئے ہیں اور ان انکار کرنے والوں کا کوئی بھی حامی و ناصر نہیں ہے۔

خدا کے علاوہ کوئی اور نہیں جو ہلاکت سے بچا سکے، خواہ عقیدت و عظمت کی کتنی ہی نسبتیں ان کی طرف کیوں نہ کر دی جائیں۔ سورۂ احقاف میں ہے۔

وَ لَقَدْ اَہْلَکْنَا مَا حَوْلَکُمْ مِّنَ الْقُرٰی وَ صَرَّفْنَا الْاٰیٰتِ لَعَلَّہُمْ یَرْجِعُوْنَ ○ فَلَوْ لَا نَصَرَہُمُ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ قُرْبَانًا اٰلِہَۃً ؕ بَلْ ضَلُّوْا عَنْہُمْ ۚ وَ ذٰلِکَ اِفْکُہُمْ وَ مَا کَانُوْا یَفْتَرُوْنَ ○ (۲۷ — ۴۶/۲۸)

(اور اے مخاطبینِ دعوتِ ایمانی دیکھو!) جو جو آبادیاں تمہارے اردگرد تھیں ہم نے ان سب کو اپنے قانونِ مکافات کے مطابق برباد کر دیا (ان کو دیکھ کر عبرت حاصل کرو) اور ہم (اُن برباد شدہ آباد کاروں کے سامنے) اپنے قوانین کو بار بار لائے کہ شاید وہ حق کی طرف لوٹ

آئیں (مگر وہ باز نہ آئے اور بالآخر اپنے مکافاتِ عمل کو پہنچے) تو (اے مخاطبین! غور کرو کہ) ان معبودوں نے ان کی کیوں امداد نہ کی جنہیں انہوں نے خدا کے سوا خدائی تقرب کے لئے گھڑ رکھا تھا (وہ ان کی امداد تو کیا کرتے) بلکہ ان سے کھوئے گئے۔ اور یہ سب کچھ ان کا ایک جھوٹ تھا اور وہ باتیں تھیں جن کو وہ (بلا دلیل) افترا کیا کرتے تھے۔

فرقہ بندی سب سے بڑا عذاب

اعمال کی یہ سزا مختلف انداز میں ظہور پذیر ہوتی ہے لیکن ان میں سب سے زیادہ عبرت انگیز صورت یہ ہوتی ہے کہ قوم فرقوں میں بٹ جائے اور باہمی سر پھٹول میں مصروف رہے۔

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلَىٰ أَنْ يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِنْ فَوْقِكُمْ أَوْ مِنْ تَحْتِ أَرْجُلِكُمْ أَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَيُذِيقَ بَعْضَكُمْ بَأْسَ بَعْضٍ ۗ انْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْآيَاتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُونَ ۝ (۶/۶۵)

(اے پیغمبر!) کہہ دو، وہ اس پر قادر ہے کہ تم پر اوپر سے کوئی عذاب بھیجدے یا تمہارے پیروں تلے سے کوئی عذاب پیدا کردے یا ایسا کرے کہ تم گروہ گروہ ہو کر آپس میں لڑ پڑو اور ایک (گروہ) دوسرے (گروہ) کی شدت کا مزہ چکھے۔ سو دیکھو! کس طرح ہم گوناگوں طریقوں سے آیتیں بیان کرتے ہیں تاکہ وہ سمجھیں بوجھیں!

اوپر سے عذاب سے مراد یہ ہے، کہ قوم کے بالائی طبقہ میں ایسی خرابیاں پیدا ہو جائیں کہ وہ نظم و نسق کو بگاڑنے کا موجب بن جائیں۔ اور "نیچے سے عذاب" سے مراد یہ ہے کہ قوم کا نچلا طبقہ اٹھ کر نظام کو درہم برہم کردے یا یہ دونوں طبقے مخلوط ہو کر خانہ جنگی میں مصروف ہو جائیں۔ بہرحال اس کی شکل کوئی بھی ہو، قوم میں فرقہ پرستی اور گروہ سازی تخریب کے لئے سب سے بڑا حربہ ہوتا ہے جو قوموں کی ہلاکت کا باعث بنتا ہے۔

وَقُلْ لِعِبَادِي يَقُولُوا الَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ۚ إِنَّ الشَّيْطَانَ يَنْزَغُ بَيْنَهُمْ ۚ إِنَّ الشَّيْطَانَ كَانَ لِلْإِنْسَانِ عَدُوًّا مُبِينًا ۝ (۱۷/۵۳)

اور (اے پیغمبر!) میرے بندوں سے کہہ دو (یعنی ان سے جو دعوتِ حق پر ایمان لائے ہیں کہ)
جو بات کہو، ایسی کہو کہ خوبی کی بات ہو۔ شیطان لوگوں کے درمیان فساد ڈالتا ہے۔ یقیناً
شیطان انسان کا صریح دشمن ہے۔

لیکن عذاب کی صورت کوئی ہو، نتیجہ بہر حال ذلت و رسوائی ہوتا ہے۔ ایسی قوم سے اللہ کی نعمتیں ایک ایک کر کے چھین لی جاتی ہیں۔

وَ اِذْ تَاَذَّنَ رَبُّکُمْ لَئِنْ شَکَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّکُمْ وَ لَئِنْ
کَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِیْ لَشَدِیْدٌ ○ (۱۴/۷)

اور کیا وہ وقت بھول گئے جب تمہارے پروردگار نے (اپنے اس قانون کا) اعلان کیا تھا کہ
اگر تم نے شکر کیا یعنی ہر نعمت کو اس مقصد کے مطابق صرف کیا جس کے لئے وہ دی گئی تھی
تو میں تمہیں اور زیادہ نعمتیں بخشوں گا اور اگر ناشکری کی، تو پھر یاد رکھو، میرا عذاب بھی بڑا سخت ہے۔

محکومی اور بے عملی کی لعنت ان پر مستولی ہو جاتی ہے (ضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ وَ الْمَسْکَنَةُ ۲/۶۱)
اور یہ تبدیلی اس طرح آہستہ آہستہ غیر شعوری طور پر، بتدریج، رونما ہوتی ہے کہ اس کا احساس تک بھی نہیں ہوتا کہ ان کی دنیا بدل کیسے گئی۔

فَذَرْنِیْ وَ مَنْ یُّکَذِّبُ بِهٰذَا الْحَدِیْثِ ؕ سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ
حَیْثُ لَا یَعْلَمُوْنَ ○ (۶۸/۴۴)

پس (اے پیغمبرِ اسلام!) ان لوگوں کو جو اس بات (یعنی آیاتِ قرآنی) کو جھٹلاتے ہیں میرے
قانونِ مکافات کے حوالے کر دو۔ یہ ان سے خود نپٹ لے گا۔ ہم انہیں آہستہ آہستہ ایسی
جگہ سے کسیں گے جس کے متعلق وہ (کچھ بھی) نہیں جانتے!

غیر محسوس انقلاب

کسی درخت کے پاس سالہا سال تک کھڑے رہیئے۔ اس طرح بیج پھوٹنے سے پھل لانے تک کے تمام مراحل آپ کی آنکھوں کے سامنے طے پائیں گے۔ لیکن آپ کبھی محسوس نہ کر سکیں گے کہ یہ تبدیلیاں ہو کیسے رہی ہیں اور ایک حالت سے دوسری حالت کب بدلتی ہے، آہستہ آہستہ۔ بتدریج۔ مِنْ حَیْثُ لَا یَشْعُرُوْنَ ○ (۱۶/۴۵) ان راہوں سے جن کا تمہیں شعور تک نہ ہو۔ بیج، پھل کی صورت اور عمل، نتیجہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور اس کا پتا اس

وقت چلتا ہے جب اس سطوت و حکومت کی مالک قوم کی جگہ ایک دوسری قوم لے لیتی ہے۔ یوں دبے پاؤں، چپکے چپکے، جیسے سینۂ صحرا سے مہتاب کی چادر لپٹتی اور اس کی جگہ اندھیرے کی چادر بچھتی چلی جائے۔ کس قدر المناک ہے یہ کیفیت اور کیسی عبرت انگیز ہے یہ تبدیلی!

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ ؕ اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِى الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ ○ اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ وَّ يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَ لَا تَضُرُّوْهُ شَيْئًا ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○

(۹/۳۹ — ۳۸)

مسلمانو! تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں قدم اٹھاؤ، تو تمہارے پاؤں بوجھل ہو کر زمین پکڑ لیتے ہیں! کیا مستقبل کی فکر کو چھوڑ کر تم صرف قریبی مفاد کی زندگی ہی پر ریجھ گئے ہو؟ (اگر ایسا ہی ہے، تو (یاد رکھو) قریبی مفاد کی زندگی کی متاع تو مستقبل کے مقابلہ میں کچھ نہیں ہے مگر بہت تھوڑی! اگر قدم نہ اٹھاؤ گے، تو یاد رکھو! وہ تمہیں ایک ایسے عذاب میں ڈالے گا جو دردناک ہوگا اور تمہاری جگہ کسی دوسرے گروہ کو لا کھڑا کرے گا اور تم (دفاع سے غافل ہو کر) اللہ کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکو گے (اپنا ہی نقصان کرو گے) اور اللہ تو ہر بات پر قادر ہے۔

ایک کی جگہ دوسری قوم

یہ نہیں کہ اندھیرے کی جگہ اندھیرا آجائے، یعنی جو نئی قوم، مٹنے والی قوم کی جگہ لے وہ بھی انہی جیسی خصوصیات کی مالک ہو۔ اگر ایسا ہو تو پھر یہ تبدیلی ہی کیوں ہو؟ وہ مٹے ہی کیوں اور یہ بڑھے کیسے؟ مٹتی تو وہ ہے جس میں زندہ رہنے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی۔ آگے وہ بڑھتی ہے جس میں حرکت اور حرارت کے چشمے اُبلتے ہیں۔ اس لئے یہ آنے والی قوم جانے والی قوم کے مثل نہیں ہوتی۔

هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ ۚ وَ مَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ

الْغَنِيُّ وَ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ ۚ وَ اِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ ۠ (۴۷/۳۸)

دیکھو، تم ہی تو وہ لوگ ہو جن کو دعوت دی جا رہی ہے کہ اپنی دولت کو اللہ کی راہ میں کھلا رکھو۔ (مگر) تم میں وہ لوگ بھی ہیں جو بخل کرتے ہیں۔ اور (یاد رکھو) جو بخل کرتا ہے وہ خود اپنے آپ کے خلاف بخل کرتا ہے (کیونکہ خدا کی راہ میں جو روپیہ خرچ کیا جاتا ہے وہ درحقیقت تمہارے ہی اجتماعی مصالح پر خرچ ہوتا ہے) اور اللہ تو (تمہارے اس روپیہ سے) بے نیاز ہے اور (دراصل) تم خود ہی اس کے محتاج ہو۔ (یاد رکھو! اے پیروانِ دعوتِ ایمانی!) اگر تم صحیح راستے سے منہ موڑ لو گے تو تمہاری جگہ خدا کوئی دوسری قوم لے آئے گا۔ پھر وہ تمہارے جیسی نہیں ہو گی!

ربِ مشارق و مغارب اس پر شاہد ہوتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوتی ہے۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشٰرِقِ وَ الْمَغٰرِبِ اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ ۙ عَلٰٓى اَنْ نُّبَدِّلَ خَيْرًا مِّنْهُمْ ۙ وَ مَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ ۝ (۷۰/۴۰—۴۱)

پس (اس حقیقتِ کبریٰ پر) مشارق و مغارب کا پروردگار شاہد ہے کہ ہم یقیناً اس پر قادر ہیں کہ ان سے بہتر (اقوام) کو ان کی بجائے بدل کر لے آئیں اور ہم عاجز کئے ہوئے نہیں ہیں!

یہ قومِ صالح بڑھتی پھیلتی جاتی ہے اور اس غیر صالح قوم پر چاروں طرف سے زمین تنگ ہوتی جاتی ہے اور رفتہ رفتہ وہ پورے طور پر مغلوب و محکوم ہو جاتی ہے۔ رفتہ رفتہ اور بتدریج اس لئے کہ قوموں کی زندگیاں صبح اور شام کے پیمانوں سے نہیں ناپی جاتیں۔ ان کے بننے اور بگڑنے کے لئے صدیاں درکار ہوتی ہیں۔

وَ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ وَ لَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ ؕ وَ اِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝ (۲۲/۴۷)

اور (اے پیغمبر!) یہ لوگ تجھ سے تباہی کے مطالبہ میں جلدی مچا رہے ہیں (یعنی کہتے ہیں کہ اگر سچ مچ کو عذاب آنے والا ہے تو کیوں نہیں آچکتا؟)۔ اور اللہ کبھی ایسا کرنے والا نہیں کہ اپنا وعدہ پورا نہ کرے مگر تیرے پروردگار کے یہاں ایک دن کی مقدار ایسی ہے جیسے تم

لوگوں کی گنتی میں ایک ہزار برس۔

ظہورِ نتائج کا وقت

لیکن صدی ہو یا ہزار سال، جب اعمال کے ظہورِ نتائج کا وقت آجاتا ہے تو پھر ایک ثانیہ بھی آگے پیچھے نہیں ہو سکتا۔

وَ يَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○ قُلْ لَّاۤ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ؕ اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّ لَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ○ (۱۰/۴۹-۴۸)

اور یہ لوگ کہتے ہیں " اگر تم سچے ہو تو بتلاؤ" یہ وعدہ (یعنی انکارِ حق کا نتیجہ) کب سامنے آئے گا۔ (اے پیغمبر!) تم کہہ دو (یہ معاملہ کچھ میرے اختیار میں نہیں کہ بتلا دوں، کب واقع ہوگا) میں تو خود اپنی جان کا بھی نفع نقصان اپنے قبضہ میں نہیں رکھتا۔ یہ سب کچھ خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہوتا ہے۔ ہر قوم کے اعمال کے نتائج سامنے آنے کے لئے ایک مہلت کا وقفہ ہوتا ہے۔ جب وہ مدت ختم ہو جاتی ہے تو پھر نہ تو ایک گھڑی پیچھے رہ سکتے ہیں، نہ ایک گھڑی آگے۔

اُس وقت تقدیم و تاخیر کسی کے بس میں نہیں ہوتی۔ مٹنے والی قوم مٹ کر رہتی ہے۔

مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَ مَا يَسْتَاْخِرُوْنَ ؕ

(۲۳/۴۳)

کوئی قوم مہلت کے وقفہ سے نہ آگے بڑھ سکتی ہے نہ پیچھے رہ سکتی ہے۔

اس لئے کہ یہ سب کچھ ایک مقررہ قاعدہ اور قانون کے ماتحت ہوتا ہے۔

وَ مَاۤ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا وَ لَهَا كِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ ○ مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَ مَا يَسْتَاْخِرُوْنَ ○ (۱۵/۵-۴)

ہم نے کبھی کسی بستی کے باشندوں کو ہلاک نہیں کیا، مگر اسی طرح کہ اس کے لئے ایک ایسا قانون مقرر تھا جس کا انہیں علم دے دیا گیا تھا۔ کوئی امت نہ تو اپنے مہلت کے وقفہ سے آگے بڑھ سکتی ہے نہ پیچھے رہ سکتی ہے!

اس " وقتِ معیّن" کے معنی یہ نہیں کہ ان کی " تقدیر" میں پہلے ہی سے یہ لکھا ہوتا ہے کہ انہوں نے فلاں

وقت پر تباہ ہو جاتا ہے۔ اس سے مطلب یہ ہے کہ ہر عمل کے ظہور کا ایک وقت ہوتا ہے جیسے بیج سے کھیتی پکنے تک کی مدت معین ہوتی ہے۔ جب اعمال کے نتائج ظاہر ہونے کا وقت آجاتا ہے تو پھر اس میں ایک ثانیہ کی بھی کمی بیشی نہیں ہوتی۔ یہ وقت اُس قوم کی ہلاکت کا ہوتا ہے۔ اسی کو "آنے والی گھڑی" کہتے ہیں۔ جو قوم اس آنے والی گھڑی کو جھٹلاتی ہے اور اپنے آپ کو فریب دے کر سمجھ لیتی ہے کہ ہمارے ساتھ ایسا نہیں ہوگا وہ سب سے زیادہ بدبخت ہے۔

فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ كَفَرُوا مِن يَوْمِهِمُ الَّذِي يُوعَدُونَ ○ (۵۱/۶۰)

تو افسوس ہے ان لوگوں پر جو اپنے اس (ظہورِ نتائج کے اعمال کے) وقت سے انکار کردیں جس سے انہیں آگاہ کیا جا رہا ہو۔

ظہورِ نتائج کی ساعت (آنے والی گھڑی) آکر رہتی ہے۔ اس وقت قوموں کی موت و حیات کے فیصلے ہو جاتے ہیں۔ سورۂ جاثیہ کے آخری رکوع کو دیکھئے۔ اس حقیقتِ عظمیٰ کو کس قدر واضح الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

وَلِلَّهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ يَخْسَرُ الْمُبْطِلُونَ ○ (۴۵/۲۷)

یہ سب کچھ اس خدا کے قانون کے مطابق ہوتا ہے جس کا اقتدار تمام کائنات کو محیط ہے۔ جب وہ انقلابِ عظیم واقع ہوگا، تو یہ لوگ جو باطل کی روش پر چل رہے ہیں، سخت نقصان اٹھائیں گے۔

جب ہر قوم کے مستقبل کا فیصلہ ان کے اعمال کے مطابق کیا جائے گا۔

وَتَرَىٰ كُلَّ أُمَّةٍ جَاثِيَةً ۚ كُلُّ أُمَّةٍ تُدْعَىٰ إِلَىٰ كِتَابِهَا ۖ الْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ○ هَٰذَا كِتَابُنَا يَنطِقُ عَلَيْكُم بِالْحَقِّ ۚ إِنَّا كُنَّا نَسْتَنسِخُ مَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ○ (۴۵/۲۸-۲۹)

اُس وقت، ہر مخالف قوم کی قوت ٹوٹ چکی ہوگی اور تو دیکھے گا کہ وہ گھٹنوں کے بل جھکی ہوئی ہوگی۔ ہر قوم کو بلایا جائے گا کہ وہ اپنے اعمال نامہ کو دیکھ لے۔ اُس وقت ہر قوم کے اعمال کے نتائج اس کے سامنے آجائیں گے اور اسے ان کا ٹھیک ٹھیک بدلہ ملے گا (۱۹/۶۸)۔

(ان سے کہا جائے گا کہ) جو کچھ تم کیا کرتے' وہ سب اس رجسٹر میں لکھ لیا جاتا تھا۔ اس لئے یہ جو کچھ کہے گا ٹھیک ٹھیک کہے گا ــــ نہ کم نہ زیادہ، بالکل صحیح۔

جنہوں نے اپنے اعمال سے اپنے اندر شادکامی و کامرانی کی زندگی بسر کرنے کی صلاحیت پیدا کر لی ہوگی، وہ کھلی ہوئی کامیابی سے بہرہ افروز ہوں گے۔

فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَیُدْخِلُهُمْ رَبُّهُمْ فِیْ رَحْمَتِهٖ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْمُبِیْنُ ۝ (۴۵/۳۰)

(اعمال نامہ کے مطابق ہر ایک کا فیصلہ ہوگا) جو لوگ ہمارے قوانین کی صداقت پر ایمان رکھتے ہیں اور ہمارے متعین کردہ صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہوتے ہیں' ان کا نشوونما دینے والا' انہیں اپنی رحمتوں کے سائے میں جگہ دے گا اور یہ بہت بڑی کامیابی ہوگی۔

لیکن جنہوں نے قوانینِ الٰہیہ سے سرکشی برتی ہوگی، وہ مجرموں کے کٹہرے میں کھڑے ہوں گے۔

وَ اَمَّا الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ۟ اَفَلَمْ تَكُنْ اٰیٰتِیْ تُتْلٰی عَلَیْكُمْ فَاسْتَكْبَرْتُمْ وَ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّجْرِمِیْنَ ۝ (۴۵/۳۱)

اور جو لوگ ان قوانین سے انکار کرتے ہیں' ان سے کہا جائے گا کہ تمہارے سامنے میرے قوانین پیش کئے جاتے تھے' لیکن تم ان سے سرکشی برتتے تھے اور ہر قسم کے جرائم کا ارتکاب کرتے تھے۔

وہ لوگ کہ

وَ اِذَا قِیْلَ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ السَّاعَةُ لَا رَیْبَ فِیْهَا قُلْتُمْ مَّا نَدْرِیْ مَا السَّاعَةُ ۙ اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّ مَا نَحْنُ بِمُسْتَیْقِنِیْنَ ۝ (۴۵/۳۲)

اور جب تم سے کہا جاتا تھا کہ یاد رکھو! خدا کا وعدہ حق ہے۔ جو کچھ تم سے کہا جا رہا ہے اسی طرح واقع ہو کر رہے گا اور یہ انقلاب آ کر رہے گا۔ اس میں قطعاً کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ تو تم کہا کرتے تھے کہ ہم نہیں جانتے کہ یہ انقلاب کیا ہے۔ ہم اسے محض ایک واہمہ سمجھتے ہیں۔ ہم اس پر یقین کرنے کے لئے بالکل تیار نہیں۔

لیکن اس وقت ان کے اعمال کے نتائج محسوس و مشہود پیکروں میں ان کے سامنے ہوں گے، ہجوم بلا کی طرح انہیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے۔

وَ بَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَ حَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ (۴۵/۳۳)

اُس وقت اُن کی بدعملیوں کے نتائج کھل کر ان کے سامنے آجائیں گے اور جن باتوں کی وہ ہنسی اڑایا کرتے تھے، وہ انہیں ہر طرف سے گھیر لیں گی۔

جب فیصلہ کی گھڑی آپہنچتی ہے تو اس وقت بے بسی اور بے چارگی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ سیلاب کو دیکھتے ہیں کہ اُمنڈے چلا آرہا ہے لیکن اسے روکنے کی طاقت نہیں، مدد کے لئے چلاتے ہیں لیکن کوئی مددگار نہیں۔

فَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ وَ هُمْ يَنْظُرُوْنَ ۝ فَمَا اسْتَطَاعُوْا مِنْ قِيَامٍ وَّ مَا كَانُوْا مُنْتَصِرِيْنَ ۝ (۵۱/۴۴-۴۵)

تو (دیکھو) انہوں نے اپنے پروردگار کے حکم سے سرکشی کی رہا آخر کڑک نے انہیں آپکڑا اور وہ دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ پھر نہ تو وہ اٹھ کر کھڑے ہی ہوسکے اور نہ ہی اپنی مدافعت کرسکے۔

بے بسی ہی نہیں بلکہ بدبختی، ایسی بدبختی کہ اپنے گھروں کو خود اپنے ہاتھوں سے اجاڑتے ہیں تاکہ بستیاں ویرانوں میں تبدیل ہوجائیں (۵۹/۲)۔

اس طرح یہ حکومت و سطوت اور شوکت و ثروت کی مالک قوم ذلت و خواری کے عذاب میں مبتلا ہو کر تپِ دق کے مریض کی طرح ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دیتی ہے۔ لیکن چونکہ یہ ہلاکت خود اپنے ہی ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہے اس لئے اس پر کسی کی آنکھ نمناک نہیں ہوتی۔

فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَ الْاَرْضُ وَ مَا كَانُوْا مُنْظَرِيْنَ ۝ (۴۴/۲۹)

چنانچہ نہ تو ان (کے اس دردناک انجام) پر آسمان و زمین کی آنکھ روئی اور نہ ہی انہیں (کوئی) مہلت نصیب ہوئی۔

اور جب کوئی قوم اس طرح تباہ ہوجاتی ہے تو پھر دوبارہ نہیں اُبھر سکتی۔

وَ حَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَآ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ۝ (۲۱/۹۵)

اور اس آبادی کے لئے جسے ہم نے (ان کے اعمال کے نتیجہ میں یوں) تباہ کر دیا ہو، یہ حتمی فیصلہ ہوتا ہے کہ وہ (دوبارہ) نہیں لوٹیں گے (یعنی حیاتِ تازہ حاصل نہیں کر سکیں گے) (PHYSICALLY)

ہلاکت کے معنی

آگے بڑھنے سے پیشتر ایک نکتہ کو اچھی طرح سمجھ لینا ضروری ہے۔ قرآنِ کریم میں قوموں کی تباہی و بربادی کے لئے ہلاکت اور ان کی سرفرازی و کامرانی کے لئے حیات کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ ہلاکت کے یہ معنی نہیں کہ وہ قوم طبیعی طور پر اس دنیا سے مٹ جاتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک قوم کی قوم صفحۂ ارض سے مٹ جائے۔ لیکن ہلاکت کے معنی بہت وسیع ہیں۔ قرآنِ کریم کی رُو سے قوموں کی ہلاکت کے یہ معنی ہیں کہ وہ حکومت وسطوت، عزت اور اقبال کی بلندیوں سے گر کر نکبت اور زوال کے جہنم میں جا پہنچیں۔ اس قوم کے افراد جیتے ہیں، سانس لیتے ہیں، چلتے پھرتے ہیں لیکن ان کی حیاتِ اجتماعیہ (ملی زندگی) مٹ چکی ہوتی ہے، خواہ تعداد کے اعتبار سے وہ کروڑوں ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ ہے قوموں کی ہلاکت۔ سو جہاں جہاں قوموں کی ہلاکت کا ذکر آتا ہے، اس مفہوم کو ہمیشہ سامنے رکھئے اور پھر یہ بھی دیکھئے کہ اس آئینے میں آپ کو اپنے متعلق کیا دکھائی دیتا ہے۔

جرائم کی فہرست

یہ جرائم جن کا لازمی نتیجہ ہلاکت اور تباہی تھا، کیا تھے؟ یوں تو ان کی فہرست بڑی لمبی چوڑی مرتب ہو سکتی ہے، لیکن جس طرح نیکی سے مراد قانونِ خداوندی کی اطاعت ہے، اسی طرح بُرائی سے مفہوم اس قانون کی خلاف ورزی ہے۔ اس لئے ان جرائم کی نوعیتیں کتنی ہی مختلف ہوں، حقیقت سب جگہ ایک ہی تھی، یعنی قوانینِ الٰہیّہ سے رُوگردانی۔ کفر، شرک، تکذیب، گناہ، جرم، ظلم، فسق، فساد، سب اسی شجرِ ملعونہ کی شاخیں ہیں (ان کا باریک فرق اپنے اپنے مقام پر سامنے آئے گا)۔ بنیادی طور پر اسے کفر سے تعبیر کیا گیا ہے، یعنی سرے سے اس حقیقت ہی سے انکار کہ انسانی زندگی کے لئے غیر متبدل قوانینِ خداوندی کی ضرورت ہے (۵ ـ ۴۴/۶ ؛ ۸ـ۹۵/۹)۔ کہیں اسے تکذیب کہہ کر پکارا گیا ہے۔ تکذیب کی دو اہم شکلیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ جب ان سے کہا جائے کہ تمہاری غلط روش کا نتیجہ تباہی ہے تو وہ اسے سچ سمجھنے سے انکار کر دیں۔ اس ذہنیت کا نتیجہ تباہی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے (۲۲/۲۴ ؛ ۲۶ ـ ۳۵/۲۵)۔

وہ اس دعوت کی تکذیب اس لئے کرتے تھے کہ یہ جدید مسلک ان کی اس روش کے خلاف تھا جو ان کے آباء واجداد سے متوارث چلی آرہی تھی (۲/۳۸-۹)۔ یہ اسلاف پرستی ہے اور اسلاف پرستی میں ہوتا یہ ہے کہ انسان حق و باطل کی تمیز کھو بیٹھتا ہے۔ یعنی جس چیز کے متعلق متوارث عقیدہ چلا آتا ہے کہ وہ حق ہے اسے بلاسند و دلیل حق سمجھ لیا جاتا ہے۔ اندھی تقلید کی اس فضا میں بقول (HUME) "اعمال اس لئے مقبول نہیں ہوتے کہ وہ نیک ہیں بلکہ انہیں نیک اس لئے کہا جاتا ہے کہ انہیں مقبولیتِ عامہ کی سند حاصل ہے"۔ اسی لئے قرآن کریم نے کہا ہے کہ یہ لوگ حق کی تکذیب[1] بلا علم کرتے ہیں۔

بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَ لَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ ○ (۱۰/۳۹)

نہیں، یہ بات نہیں ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ جس بات پر، یہ اپنے علم سے احاطہ نہ کر سکے اور جس بات کا نتیجہ ابھی پیش نہیں آیا اس کے جھٹلانے پر آمادہ ہو گئے۔ ٹھیک اسی طرح ان لوگوں نے بھی جھٹلایا تھا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں۔ تو دیکھو ظلم کرنے والوں کا کیسا کچھ انجام ہو چکا ہے۔

تکذیب کی دوسری شکل یہ ہے کہ زبان سے تو قوانینِ خداوندی کا اقرار کیا جائے لیکن زندگی ان کے خلاف گزاری جائے۔ اس سلسلہ میں سورت الماعون کو بنگاہِ تفکر دیکھئے۔ بات نکھر کر سامنے آجائے گی (۱۰۷/۱-۷)۔ کسی حقیقت کا محض زبان سے اقرار انسان کو تباہی سے نہیں بچا سکتا۔ تباہی سے بچاتا ہے اسی عمل کا نتیجہ جو اس حقیقت کے مطابق کیا جائے۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن کریم نے "اٰمَنُوْا" کے ساتھ "عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" کو لازمی قرار دیا ہے۔

تکذیب کے ساتھ استہزاء، مخالفت میں بدترین دنائت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ جو قوم اس قسم کے اوچھے ہتھیاروں پر اُتر آئے وہ تباہی سے کس طرح محفوظ رہ سکتی ہے۔

---

[1] تکذیب کے سلسلہ میں حسبِ ذیل آیات بھی ملاحظہ فرمائیے۔ (۲۵/۳۹؛ ۴-۵/۴۰؛ ۱۲/۵۰؛ ۱۸/۶۷؛ ۴/۶۹)۔

استہزاء وَ مَا يَأْتِيهِمْ مِنْ نَبِيٍّ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ ○ فَأَهْلَكْنَا أَشَدَّ مِنْهُمْ بَطْشًا وَ مَضَىٰ مَثَلُ الْأَوَّلِينَ ○ (۴۳/۸-۷)

اور (دیکھو) ان کے پاس کوئی نبی نہیں آتا تھا مگر یہ کہ وہ لوگ اس کا مذاق اڑایا کرتے تھے (نتیجہ وہی ہوا یعنی ہلاکت)۔ لہٰذا یہ قوم مخالف کیا چیز ہے؟ ہم نے ان سے زیادہ قوت و سطوت والوں تک کو برباد کر ڈالا ہے۔ اور پہلے لوگوں کی مثال گذر چکی ہے (جو عبرت حاصل کرنے کے لئے کافی ہے)۔

ظلم قوانینِ الٰہیہ سے انکار اور تکذیب اور ان کی جگہ انسانوں کے خود ساختہ قوانین کی ترویج و تنفیذ کا لازمی نتیجہ ظلم تھا۔ نتیجہ کیا؟ انسانوں کا خود ساختہ نظام بذاتِ خود ظلم اور فساد ہے جس کا نتیجہ ہے ہلاکت۔

وَ كَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَّ أَنْشَأْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا آخَرِينَ ○ فَلَمَّا أَحَسُّوا بَأْسَنَا إِذَا هُمْ مِنْهَا يَرْكُضُونَ ○ لَا تَرْكُضُوا وَارْجِعُوا إِلَىٰ مَا أُتْرِفْتُمْ فِيهِ وَ مَسَاكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْأَلُونَ ○ قَالُوا يَا وَيْلَنَا إِنَّا كُنَّا ظَالِمِينَ ○ فَمَا زَالَتْ تِلْكَ دَعْوَاهُمْ حَتَّىٰ جَعَلْنَاهُمْ حَصِيدًا خَامِدِينَ ○ (۲۱/۱۱ — ۱۵)

اور کتنی ہی بستیاں جو ظلم و شرارت میں غرق تھیں ہم نے پامال کر ڈالیں اور ان کے بعد دوسرے گروہوں کو اٹھا کھڑا کیا! جب ہمارا عذاب انہوں نے محسوس کیا تو اچانک بستیوں سے بھاگ اٹھے۔ لیکن ہمارے قانونِ مکافات نے انہیں آواز دی کہ اب بھاگتے کہاں ہو؟ اپنے اسی عیش و عشرت میں لوٹو (جس نے تمہیں اس قدر سرشار کر رکھا تھا)۔

بستیوں کے باشندوں نے پکارا "افسوس ہم پر! بلاشبہ ہم ظلم کرنے والے تھے" تو (دیکھو) وہ برابر یہی پکارا کئے یہاں تک کہ ہم نے (انہیں ہلاک) کر دیا کٹے ہوئے کھیت کی طرح، بجھے ہوئے انگاروں کی طرح!

ظلم و سرکشی "ظلم" بڑا جامع لفظ اور قرآنِ کریم کی ایک اہم اصطلاح ہے۔ اس سے مراد صرف "ناانصافی" نہیں۔ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی شے کا اس مقام پر نہ ہونا جس مقام

پر اسے ہونا چاہیئے۔ اس اجمال کے اندر، ظلم کی تمام تفاصیل سمٹ کر آجاتی ہیں۔ قرآنِ کریم نے بے شمار مقامات پر اس کی وضاحت کی ہے کہ قوموں کی تباہی کی بنیادی وجہ ظلم ہوتا ہے۔ چونکہ اس مقام پر ان تمام آیات کو سامنے لانے کی گنجائش نہیں، اس لئے ہم چند ایک اہم آیات کو سامنے لانے پر اکتفا کرتے ہیں۔ مثلاً قومِ نوحؑ کے سلسلہ میں کہا ہے۔

وَ قَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا هُمْ اَظْلَمَ وَ اَطْغٰىؕ
وَ الْمُؤْتَفِكَةَ اَهْوٰىۙ فَغَشّٰىهَا مَا غَشّٰىۚ (۵۲—۵۴/۵۳)

اور (کیا انہیں معلوم نہیں کہ) قومِ نوح کو بھی اب سے (بہت) پہلے خدا ہی نے تباہ کیا تھا؟ بلاشبہ وہ تو بہت ہی زیادہ ظالم اور بہت ہی سرکش لوگ تھے۔ اور (پھر) اوندھی کی ہوئی بستیوں کو (ایک تنکے کی طرح اٹھا کر پھینک دیا اور (اتنا ہی نہیں) پھر ان پر جو کچھ مسلّط ہوا سو مسلّط ہوا۔

اور ظلم اور سرکشی پیدا اس وقت ہوتی ہے جب سامانِ رزق کی فراوانی ہو۔

وَ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۭ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا......وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰٓى اِلَّا وَ اَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ (۵۸—۵۹/۲۸)

اور (غور تو کرو) ہم نے کس قدر بستیاں برباد کر دی ہیں (جن کی آبادیاں) اپنی (سامانِ معیشت کی فراوانی) پر اترایا کرتی تھیں۔ چنانچہ یہ ہیں ان کے مکانات جو بجز معدودے چند، ان کے بعد سے (آجتک) آباد ہی نہیں ہو سکے۔ اور (بالآخر ہم ہی ان کے وارث ہوئے (یعنی ہمارا اقتدار ہی ان پر غالب آکر رہا) اور (اے پیغمبرِ اسلام!) تیرا پروردگار ان بستیوں کو اس وقت تک برباد کرنے والا نہیں تھا جب تک ان کے کسی مرکزی مقام پر کوئی رسول نہ بھیجدیتا جو اُن کے سامنے ہمارے قوانین پیش کر دیتا (یوں اتمامِ حجت ہو جاتا) اور (یاد رکھو) ہم (یونہی) آبادیوں کو برباد کرنے والے نہیں ہیں مگر یہ کہ ان کے باشندے ہی ظالم ہوں (اور اعمال سے اس بربادی کے فیصلہ کو اپنے اوپر لازم کرلیں)۔

اس سے یہ مطلب نہیں کہ مال و دولت کی فراوانی اور فارغ البالی قابلِ نفرت چیز ہیں، کیونکہ اُن سے ظلم و سرکشی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ مال و دولت تو خدا کی نعمتیں ہیں۔ اس لئے نعمت، قابلِ مذمت

کس طرح ہوسکتی ہے ؟ قابلِ مذمت ہے یہ روش کہ مال و دولت اور قوت و حشمت کو قوانینِ الٰہیہ کے تابع نہ رکھا جائے بلکہ انہیں اپنی خواہشات کے مطابق صرف کیا جائے جس کا نتیجہ خدا فراموشی اور اور خود فریبی ہو۔ اس جذبہ کی ابتدا اس خیالِ باطل سے ہوتی ہے کہ انسان یہ سمجھ لے کہ مجھے جو کچھ ملا ہے اپنی تدبیر و ہنر سے ملا ہے۔

وَ بَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا وَ حَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ○...... وَالَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْ هٰٓؤُلَآءِ سَيُصِيْبُهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا وَ مَا هُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ○ (۴۸ - ۳۹/۵۱)

اور (دیکھو) ان کے اعمال کی خرابیاں اُن پر (اچھی طرح) واضح ہوجائیں گی اور جن باتوں کا وہ مذاق اڑاتے رہے تھے وہ ان پر مسلّط ہوجائیں گی۔ جب کسی آدمی کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ ہمیں پکارتا ہے۔ پھر جب ہم اپنی طرف سے اُسے کوئی نعمت عطا کرتے ہیں تو کہتا ہے" اس کے سوا اور کیا ہے کہ مجھے اپنے علم و بصیرت کی وجہ سے یہ نعمت مل گئی ہے۔" (اے خود فریب انسان! یاد رکھ، ایسا نہیں ہے) ایسا سمجھنا فتنہ ہے۔ لیکن اکثر آدمی اس حقیقت کو جانتے نہیں۔ اسی قسم کی ذہنیت ان لوگوں کی بھی تھی جو ان سے پہلے ہو چکے ہیں۔ مگر جو کچھ وہ کرتے رہے تھے وہ ان کے کچھ بھی کام نہ آیا۔ چنانچہ ان کے اعمال کے تخریبی نتائج انہیں پہنچ کر رہے۔ اور (اے افرادِ نسلِ انسانی! یاد رکھو) ان (موجودہ) لوگوں میں سے جو لوگ ظلم (و سرکشی) کی راہ اختیار کر رہے ہیں انہیں بھی ان کے اعمال کے نتائج پہنچ کر رہیں گے۔ اور وہ (کسی طرح بھی خدا اور اس کے قوانین کو) ہرانے والے اور عاجز کر دینے والے نہیں ہیں!

جب انسان یہ سمجھ لیتا ہے کہ دولت و ثروت تنہا میری کاریگری کا نتیجہ ہے تو اس دولت پر نازاں ہو کر جور و استبداد پر اُتر آتا ہے۔ سورۂ انعام میں ہے۔

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ ○ (۶/۴۲)

(اے رسول!) یہ کچھ تمہارے ساتھ ہی مخصوص نہیں۔ شروع سے ایسا ہوتا چلا آیا ہے۔ تم سے

پہلے بھی ہم، دیگر اقوام کی طرف، اپنا پیغامبر بھیجتے رہے ہیں۔ انہوں نے ہمارے قوانین کی خلاف ورزی کی تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ عام مصیبتوں اور تکلیفوں میں مبتلا ہو گئے۔ یہ ابتدائی تنذیر ہوتی ہے تاکہ لوگ محتاج ہو جائیں اور اپنی اصلاح کر کے، قانونِ خداوندی کے سامنے جھک جائیں۔

یہ خدا کی طرف سے پہلی تنذیر WARNING ہوتی ہے تاکہ اس سے عبرت حاصل کریں۔ لیکن وہ اس سے عبرت حاصل نہیں کرتے۔

فَلَوْ لَآ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا وَ لٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (۶/۴۳)۔

لیکن اس تنذیر سے عبرت حاصل کرنے کے بجائے ان کے دل اور زیادہ سخت ہو جاتے۔ اس لئے کہ ان کی مفاد پرستوں کے جذبات ان کے کاروبار کو ان کی نگاہوں میں بڑا خوشنما بنا کر دکھاتے اور ان سے کہتے کہ جس کام میں اس قدر جلد اور آسانی سے مفاد حاصل ہو رہے ہیں، انہیں چھوڑ دینا کہاں کی عقلمندی ہے؟

اور جس تعلیم کی انہیں یاد دلائی جاتی ہے اسے بھلا دیتے ہیں اور اپنی خوشحالی اور عیش پسندی میں بدمست ہو جاتے ہیں تو پھر قانونِ مکافات کی محکم گرفت آ پکڑتی ہے جس سے اس قوم کی جڑیں کٹ جاتی ہیں۔

فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ؕ حَتّٰٓى اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ۝ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ؕ وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (۶/۴۴-۴۵)

انہیں یہ مفادِ عاجلہ حاصل اس لئے ہوتے کہ ہمارا قانونِ مکافات، عمل اور اس کے نتیجہ کے ظہور میں، مہلت کا وقفہ رکھتا ہے اس لئے انسان کی غلط روش سے یہ نہیں ہوتا کہ وہ فوراً تباہ ہو جائے۔ چنانچہ وہ لوگ خدا کے قانون کو پسِ پشت ڈال دیتے لیکن اس کے باوجود ان پر سامانِ زیست کے دروازے کھلے رہتے (۱۶/۱۱۲)۔ وہ اسی طرح قوت اور دولت کے نشہ میں بدمست ہوتے چلے جاتے اور اس کے ساتھ ہی، اُن کی غلط روش کے تباہ کُن اثرات بھی آہستہ آہستہ جمع ہوتے رہتے تا آنکہ ان کے ظہور کا وقت آ جاتا۔ تو وہ قوم، اپنی توقعات کے یکسر خلاف، گرفت میں آ جاتی اور اُن پر ایسا زوال آتا کہ ان کی باز آفرینی کی کوئی صورت باقی نہ رہتی۔

اس طرح اس قوم کی جڑ کٹ جاتی جو دوسروں کے حقوق کو غصب کر کے انسانیت پر ظلم اور زیادتی کرتی تھی۔ جب اِن کی تباہی سے نظامِ ربوبیت کی راہ میں حائل ہونے والے موانع دور ہو جاتے، تو وہ نظام، دنیا کے لئے وجہ ہزار حمد و ستائش بن جاتا۔ اس طرح یہ تخریبی مرحلہ تعمیری منزل کا پیش خیمہ بن جاتا۔ یہی ہمارا قانون ہے۔ یہاں ہر تعمیر سے پہلے تخریب ہوتی ہے۔ حق کے نظام کے متمکن ہونے کے لئے باطل کے نظام کی شکست و ریخت ضروری ہے۔ جب تک ظالم کی جڑ نہ کٹے، مظلوم کی کھیتی ہری نہیں ہوتی۔

سورۂ اعراف میں اسی حقیقت کو تصریفِ آیات سے یوں دہرایا گیا ہے۔

وَ مَآ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّبِیٍّ اِلَّآ اَخَذْنَآ اَهْلَهَا بِالْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ یَضَّرَّعُوْنَ ○ (۷/۹۴)

(یہ محض چند واقعات ہیں جنہیں اس مقام پر سامنے لایا گیا ہے۔ ورنہ تمام اقوامِ سابقہ کی تاریخی یادداشتیں اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ) ہم نے جب بھی کسی بستی کی طرف کوئی نبی بھیجا، تو اس کے اربابِ دولت و ثروت نے اس کی مخالفت کی ۳۴/۳۴؛ ۴۳/۲۳۔ جب تک ان کی غلط روش، اس درجہ تک نہ پہنچی کہ وہ ان کی آخری تباہی کا موجب بن جائے) ان پر ہلکی ہلکی مصیبتیں اور مشکلیں آئیں۔ مقصود اس سے یہ تھا کہ وہ اپنی غلط روش کا نتیجہ دیکھ کر، قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتنا چھوڑ دیں اور ان کے سامنے جھک جائیں۔ یہ مصیبتیں اور مشکلیں خود ان کے غلط نظام کی پیدا کردہ ہوتی تھیں۔

اس کے بعد فرمایا کہ یہ لوگ قوانینِ الٰہیہ پر ایمان لے آتے اور تقویٰ شعار بن جاتے تو ان پر زمین و آسمان سے برکات کے دروازے کھول دیئے جاتے۔

وَ لَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰۤی اٰمَنُوْا وَ اتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَیْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ وَ لٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ ○ (۷/۹۶)

اگر یہ لوگ ہمارے قانون کی صداقت پر یقین رکھتے اور (اس کی اتباع سے) زندگی کی تباہیوں سے محفوظ رہنے کی فکر کرتے، تو ہم ان پر، زمین اور آسمان کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے

(۵/۶۶ ؛ ۷/۴۰) ۔ لیکن انہوں نے اسے جھٹلایا تو ان کے اعمال کے نتائج نے انہیں آن پکڑا۔

غور کیجئے ۔ ایک رزق کی فراوانی وہ تھی جس نے خدا بھلا دیا اور ایک فراوانی یہ ہے جسے قرآن نے زمین و آسمان کی برکات قرار دیا ہے ۔ لیکن یہ فراوانی ایمان و تقوٰے سے ملتی ہے ۔ قوانین الٰہیہ کی تکذیب و انکار کا نتیجہ تو بہرکیف ہلاکت ہے، ایسی ہلاکت جس سے بچنے کی کوئی صورت نہیں ۔

اَفَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰٓی اَنْ یَّاْتِیَهُمْ بَاْسُنَا بَیَاتًا وَّ هُمْ نَآىِٕمُوْنَؕ

اَوَ اَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰٓی اَنْ یَّاْتِیَهُمْ بَاْسُنَا ضُحًى وَّ هُمْ یَلْعَبُوْنَ ۝

اَفَاَمِنُوْا مَكْرَ اللّٰهِۚ فَلَا یَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ۝ (۷/۹۹-۹۷)

(یہ ہیں وہ حقائق جو تاریخی شہادتوں سے ثابت ہیں) تو کیا اس کے بعد بھی (یہ تمہارے مخاطب) جو مختلف بستیوں میں رہتے ہیں، اس سے نڈر ہو چکے ہیں کہ ہمارا عذاب ان پر رات کے وقت آنے جب وہ سو رہے ہوں ۔

کیا یہ اس سے بالکل بےخوف ہو رہے ہیں کہ ہمارا عذاب ان پر چاشت کے وقت آ جائے جب وہ بے خبر کھیل کود میں مشغول ہوں ۔

کیا یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ انہیں خدا کی تدبیروں کی طرف سے امان مل چکی ہے؟ یاد رکھو! اپنے آپ کو اس قسم کی خود فریبی میں وہی قوم رکھ سکتی ہے جس نے تباہ اور برباد ہونا ہو۔

سورۂ اعراف کی تین اگلی آیات پر بھی ساتھ کے ساتھ ہی غور کرتے جائیے کہ ان میں بھی اسی حقیقت کی تبئین ہے ۔ فرمایا ۔

اَوَ لَمْ یَهْدِ لِلَّذِیْنَ یَرِثُوْنَ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ اَهْلِهَاۤ.........

وَ اِنْ وَّجَدْنَاۤ اَكْثَرَهُمْ لَفٰسِقِیْنَ ۝ (۷/۱۰۲-۱۰۰)

یہ لوگ، جو پہلی قوموں کی تباہی کے بعد، ان کے ملک اور دولت کے وارث ہوئے ہیں کیا ان پر یہ بات اب بھی واضح نہیں ہوئی کہ ہمارا قانون، ان کے جرائم کی بنا پر، انہیں مصیبتوں میں مبتلا کر سکتا ہے ۔

لیکن یہ جو اس قدر واضح دلائل و شہادات کے باوجود، ان باتوں پر کان نہیں دھرتے، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلاف کی اندھی تقلید اور مفاد پرستیوں کے جذبات نے انکے سمجھے سوچنے

کی صلاحیتوں کو سلب کر دیا ہے۔

بہر حال یہ ہیں وہ چند اقوامِ سابقہ جن کے حالات ہم نے تم سے بیان کئے ہیں۔ ان کے رسول ان کی طرف واضح دلائل و احکام لے کر آتے۔ وہ لوگ بجائے اس کے کہ جو کچھ ان سے کہا جاتا اس پر غور و فکر کرتے، بلا سوچے سمجھے اسے جھٹلا دیتے ۔۔ کبھی اس بنا پر کہ اس سے پہلے ان کے آباء و اجداد اُسے جھٹلا چکے تھے اور کبھی یوں کہ ایک دفعہ جو بات یونہی مُنہ سے نکل گئی اس پر جم کر بیٹھ گئے ۔۔ حقیقت سے انکار کرنے والوں کے دلوں پر یوں مہریں لگا کرتی ہیں۔ اسلاف کی اندھی تقلید اور اپنی بات کی پچ انسان سے سمجھنے سوچنے کی صلاحیت سلب کر لیا کرتی ہے۔

ان اقوامِ سابقہ میں سے اکثر کی یہی حالت رہی کہ وہ قوانینِ خداوندی کے وفا شعار نہ رہے۔ انہوں نے خدا سے جو عہد کیا تھا اس پر قائم نہ رہے۔ وہ صحیح راستے کو چھوڑ کر غلط راہوں پر چلنے لگ گئے۔

یہ وہ قومیں تھیں جنہیں ہر قسم کی فراغت حاصل تھی لیکن ان لوگوں نے خدا کی ان نعمتوں کا غلط استعمال شروع کر دیا اور تباہ ہو گئے (۵-۶/۶)۔ قصۂ قارون کے ضمن میں کہا:

اِنَّ قَارُوْنَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰى فَبَغٰى عَلَيْهِمْ ...... اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ۝ (۷۶-۷۷/۲۸)

اس کی زندہ شہادت قارون کی سرگذشت ہے۔ وہ قومِ موسیٰؑ ہی کا ایک فرد تھا لیکن اپنی دولت کے بل بوتے پر، خود اپنی قوم کے افراد پر بڑی زیادتی کرتا تھا۔ (ہر سرمایہ دار کی طرح، ان کا خون چوستا تھا) چنانچہ اس طرح اس کے پاس اتنی دولت جمع ہو گئی کہ اس کے خزانوں کو ایک طاقتور جماعت بھی بمشکل اٹھا سکتی تھی (یا اس کی حفاظت کے لئے ایک مضبوط، زور آور جماعت کی ضرورت تھی)۔

(اس دولت کے نشہ نے اسے بدمست کر دیا تھا) چنانچہ اس کی قوم (کے باہوش طبقہ) نے اس سے کہا کہ تم اس مال و دولت پر اس قدر اتراؤ نہیں۔ اس کا نتیجہ خراب ہو گا۔ یہ روش قانونِ خداوندی کی رُو سے پسندیدہ نہیں۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ تم مال و دولت کو تیاگ کر تارک الدنیا بن جاؤ۔ ہرگز نہیں۔ ہم کہتے یہ ہیں کہ تم اس سے بھی فائدہ اٹھاؤ' لیکن اسے نہ بھولو کہ زندگی صرف اسی دنیا کی زندگی نہیں جس میں انسان کا منتہائے نگاہ مال و دولت کا جمع کرنا ہے اور بس۔ زندگی اس کے بعد بھی ہے۔ اس مال و دولت سے تم اپنی اُس زندگی کو بھی خوشگوار بناؤ اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ جس طرح خدا نے تمہاری ہر کمی کو پورا کر کے تمہاری زندگی کو حسین بنا دیا ہے' اسی طرح تم دوسروں کی کمی کو پورا کر کے ... ... ان کی زندگی کو بھی حسین بنا دو اور معاشرہ میں ناہمواریاں مت پیدا کرو ـــ تاکہ تم امیر سے امیر تر بنتے جاؤ اور دوسرے لوگ غریب سے غریب تر ہوتے چلے جائیں۔ اسی کو فساد کہتے ہیں اور فساد پیدا کرنے والوں کو خدا کبھی پسند نہیں کرتا ـــ اور یہ ظاہر ہے کہ جو روش' قانونِ خداوندی کی رُو سے پسندیدہ نہیں' اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

لیکن وہ نشۂ دولت میں بدمست تھا جیسے ہر سرمایہ دار CAPITALIST ہوتا ہے۔ اس نے ان باتوں کو نگاہ کے تبسم سے سُنا اور لب کی ہنسی سے ٹھکرا دیا' یہ کہتے ہوئے کہ (معاذاللہ) کہاں کا خدا اور کون سا اس کا فضل! میں نے جو کچھ حاصل کیا ہے اپنی تدابیر سے کیا ہے۔ اس لئے جس طرح میرا جی چاہے اسے صرف کروں۔

قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰی عِلْمٍ عِنْدِیْ ؕ اَوَ لَمْ يَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّ اَكْثَرُ جَمْعًا ؕ وَ لَا يُسْـَٔلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ۝ (۲۸/۷۸)

قارون بولا' یہ تو میں نے اپنی ہنر مندی کی بنا پر حاصل کیا ہے؟ کیا خوب! اس نے اتنا بھی نہ جانا کہ اس سے پہلے خدا ان نسلوں (تک) کو تباہ کر چکا ہے جو قوت کے اعتبار سے اس سے زیادہ مضبوط اور جمعیت کے اعتبار سے اُس سے زیادہ تعداد میں تھیں؟ اس قسم کے غلط کار لوگوں سے (ان کھلی ہوئی) غلط کاریوں کے متعلق سوال کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہوا کرتی۔

سمجھنے بوجھنے والے

اور پھر طرفہ تماشہ یہ کہ یہ ہلاک ہونے والے' سب کچھ سمجھتے بوجھتے' دیکھتے بھالتے تھے۔ علم و ہنر کے مدعی' ایجادات و انکشافات میں سب سے آگے' تہذیب و تمدن کے اجارہ دار' دانش و بینش میں اپنے ہم عصروں پر فوقیت رکھنے والے۔ لیکن باایں ہمہ اپنے

ہاتھوں سے اپنی ہلاکت کے سامان فراہم کرنے پر مُصر، سب کچھ سوچتے سمجھتے، تباہی کے جہنم کی طرف کشاں کشاں جا رہے تھے اس لئے کہ ــــ عقل کو تابع فرمانِ نظر کر نہ سکے ــــ قرآنِ کریم نے اس حقیقت کو ایک لفظ کے اندر اس حُسن و خوبی سے مرکوز کر دیا ہے کہ بصیرت اس پر وجد کرتی ہے۔ فرمایا۔

وَ عَادًا وَّ ثَمُوْدَا وَ قَدْ تَّبَيَّنَ لَكُمْ مِّنْ مَّسٰكِنِهِمْ وقفه وَ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَ كَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ ۙ (۲۹/۳۸)

اور ہم نے عاد اور ثمود کو تباہ کر دیا اور (یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں) ان کے مکانات کے کھنڈر خود اس کے شاہد ہیں۔ اور بات یہ تھی کہ مفاد پرستی کے جذبات نے ان کے لئے ان کے اعمال کو مزین بنا رکھا تھا۔ چنانچہ اُنہیں راہ (حق) سے روک دیا۔ اور (یہ لوگ اندھے نہیں تھے) سب کچھ دیکھنے بھالنے والے تھے۔

اس "مستبصرین" کی تشریح دوسری جگہ ان الفاظ میں فرما دی۔

وَ لَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَاۤ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ وَ جَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّ اَبْصَارًا وَّ اَفْـِٕدَةً ۖ فَمَاۤ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَ لَاۤ اَبْصَارُهُمْ وَ لَاۤ اَفْـِٕدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ ۙ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ حَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۠ (۴۶/۲۶)

اور حقیقت یہ ہے کہ ہم نے انہیں ان امور میں اس قدر قوت دے رکھی تھی جس قدر قوت تمہیں بھی نہیں دی اور انہیں سمع اور بصر اور قلب (سب ہی کچھ) عطا کر رکھے تھے۔ مگر ان کے کان اور آنکھیں اور دل ان کے کچھ بھی کام نہ آئے اس لئے کہ وہ قوانینِ خداوندی کا انکار کیا کرتے تھے اور پھر نتیجہ یہ ہوا کہ (انہیں انہی باتوں نے آ کر گھیر لیا جن کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے۔

یونہی آگے نہ بڑھ جائیے۔ اس آیۂ جلیلہ کے مفہوم پر غور کیجئے اور اتنا غور کیجئے کہ یہ آپ کے قلب کی گہرائیوں میں اُتر جائے۔ اس لئے کہ آج جو کچھ یورپ کے لالہ زاروں میں ہو رہا ہے وہ اسی حقیقتِ کبریٰ کی تفسیر ہے۔ بصارت و سماعت، دانش و بینش، علم و ہنر، سب کچھ موجود ہے، لیکن چونکہ قوانینِ خداوندی سے انکار و جُحُود ہے اس لئے عقل و تدبر کی فسوں کاریاں بے بس ہو کر ٹھٹھر گئی ہیں اور جن حقائقِ ابدی کی ہنسی اڑائی جاتی

تھی وہ پھانسی کا پھندا بن کر پورے یورپ (اور اس کے ساتھ اس کے ملحقین) کے گلے میں پڑا ہے جس سے نجات کی کوئی صورت نہیں۔ وَ حَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ٥ اس لئے کہ قوانین خداوندی کی خلاف ورزی سے سر کی آنکھیں اندھی نہیں ہوا کرتیں، دل کی آنکھوں کی روشنی کم ہوا کرتی ہے۔ فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَ لٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِىْ فِى الصُّدُوْرِ (۲۲/۴۶)۔ یاد رکھئے! عقل و دانش عالمِ آفاق کے انکشافات و اختراعات میں ضرور رہنمائی کرتی ہے لیکن انسانی ہیئتِ اجتماعیہ میں، جہاں انسانوں کے حقوق و مفاد کا باہمی تصادم و تزاحم ہو، تنہا عقل کبھی صحیح راستہ نہیں دکھا سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ باوجود مستبصرین ہونے کے، انسانی حیاتِ اجتماعیہ کے معاملہ میں اندھے کے اندھے رہ جاتے ہیں۔

عیوب عام ہو جائیں

اور یہ حالت اس وقت ہوتی ہے جب کسی سوسائٹی میں عیوب اس درجہ عام ہو جائیں کہ عیب، عیب ہی نہ سمجھا جائے۔ سب ایک ہی رنگ میں رنگے جائیں اور قوم کو فتنہ و فساد سے کوئی روکنے والا نہ ہو یعنی ان کی زندگی کی پوری عمارت غیر صالح بنیادوں پر استوار ہو جائے اور فکر و نظر کے تمام گوشے اسی عمارت کے مختلف شعبے بنتے چلے جائیں۔

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِى الْاَرْضِ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ ۚ وَ اتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَاۤ اُتْرِفُوْا فِيْهِ وَ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ٥ (۱۱/۱۱۶)

پھر (دیکھو) ایسا کیوں نہیں ہوا کہ جو لوگ تم سے پہلے گزر چکے ہیں، ان میں اہلِ خیر باقی رہے ہوتے اور لوگوں کو شر و فساد کرنے سے روکتے؟ ایسا نہیں ہوا بہت تھوڑے لوگ صحیح راستے پر رہے اور انہیں ہم نے محفوظ رکھا۔ ظلم کرنے والے تو اسی راہ پر چلے جس میں انہوں نے (اپنی نفس پرستیوں کی) آسودگی پائی تھی اور وہ سب (احکامِ حق کے) مجرم تھے۔

یہ وقت ایسا ہوتا ہے کہ ان لوگوں میں بچنے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی۔ اس لئے تباہ ہو جاتے ہیں۔

وَ مَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّ اَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ٥ (۱۱/۱۱۷)

اور (یاد رکھو) ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ تمہارا پروردگار آبادیوں کو ناحق ہلاک کر دے اور اس کے باشندوں میں باقی رہنے کی صلاحیت ہو۔

اکابر مجرمین سورۂ انعام میں کہا گیا ہے کہ

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا ؕ وَ مَا يَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ وَ مَا يَشْعُرُوْنَ ۝ (۶/۱۲۳)

اور (دیکھو جس طرح آج مکہ کے رئیس دعوتِ حق کی مخالفت میں سرگرم ہیں) اسی طرح ہر بستی میں اس کے بدکردار آدمیوں کے سردار پیدا ہوتے رہے جو وہاں مکر و فریب کے جال پھیلاتے تھے۔ اور فی الحقیقت وہ مکر و فریب نہیں کرتے تھے مگر اپنے ہی ساتھ (کیونکہ وہ حق کو تو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے اپنے ہاتھوں اپنا ہی نقصان کرتے تھے) لیکن اس کا شعور نہیں رکھتے تھے۔

اس آیتِ جلیلہ کے مفہوم پر پھر غور کیجئے۔ اکابر مجرمین، یعنی قومی تدبیر و سیاست کے ارکین و معتمدین، عمائدِ سلطنت و حکومت، اربابِ سطوت و حکومت، نظامِ حکومت کے واضعین، سب مل کر بیٹھتے ہیں اور دوسری قوموں کی ہلاکت و بربادی کے لئے خفیہ تدابیر سوچتے ہیں (لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا) (مکر کے معنی خفیہ تدبیر کے ہیں) چپکے سوچتے ہیں۔ اندر ہی اندر دوسروں کی ہلاکت کے منصوبے باندھتے اور تیار کرتے رہتے ہیں۔ لیکن جس وقت ادھر یہ کچھ ہو رہا ہوتا ہے عین اسی وقت دوسری قوم کے اربابِ حل عقد بھی اسی قسم کے منصوبوں میں منہمک ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کی خفیہ تدابیر، جو ان کے نزدیک بزعمِ خویش دوسروں کی ہلاکت کا ذریعہ بننے والی ہوتی ہیں، درحقیقت خود انہی کی ہلاکت کا سامان لئے ہوتی ہیں۔ وَ مَا يَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ لیکن ان بدنصیبوں کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوتی ہے اور نہیں جانتے کہ ہم خودکشی کی کن جانکاہ تدبیروں میں مصروف ہیں۔ وَ مَا يَشْعُرُوْنَ۔ چنانچہ یہ سب کچھ اندر ہی اندر ہوتا رہتا ہے۔ حتّٰی کہ یہی قومیں آپس میں اس انداز سے متصادم ہو جاتی ہیں کہ ساری دُنیا ان زلزلوں کے دھماکے سے کپکپا اٹھتی ہیں۔

وَ كَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًاۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ (۶/۱۲۹)

اور (دیکھو) اس طرح ہم بعض ظالموں کو بعض ظالموں پر مسلط کر دیتے ہیں ان کے اپنے اعمال کی وجہ سے۔

عبرت آموزی جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، ان واقعات و کوائف کی طرف توجہ اس لئے منعطف کرائی جاتی ہے کہ ان سے عبرت حاصل کی جائے، یعنی وہ فائدہ اٹھایا جائے جو

تاریخِ اُمم کی تدوین و تحفظ سے مقصود ہے۔ ہر آنے والی قوم یہ سمجھ لے کہ فلاں قوم نے فلاں روشِ زندگی اختیار کی تو ان کا یہ انجام ہوا اور اگر اسی قسم کی روشِ زندگی ہم اختیار کریں گے تو ہمارا بھی یہی حال ہوگا۔ نزولِ قرآن کریم کے وقت بنی اسرائیل کی قوم جیتی جاگتی سامنے موجود تھی۔ یہ وہ قوم تھی جس کی عظمت و شوکت کی وارث، امتِ محمدیہ ہونے والی تھی۔ اس لئے جماعتِ مومنین سے کہا گیا کہ بنی اسرائیل سے پوچھو کہ خدا کی نعمتوں کی ناسپاس گزاری کرنے والی قوم کا انجام کیا ہوا کرتا ہے؟

سَلْ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ کَمْ اٰتَیْنٰهُمْ مِّنْ اٰیَةٍۭ بَیِّنَةٍ ؕ وَ مَنْ یُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ○ (۲/۲۱۱)

(اے پیغمبر!) چاہیئے کہ یہ لوگ پچھلی امتوں کی سرگذشتوں سے عبرت پکڑیں۔ ان سے کہو کہ بنی اسرائیل سے پوچھو، ہم نے انہیں (علم و بصیرت کی) کتنی روشن نشانیاں دیں اور کس طرح فلاح و سعادت کی تمام راہیں ان پر کھول دیں؟ لیکن اس پر بھی وہ راہِ ہدایت پر قائم نہ رہے (اور نعمتِ الٰہی کی قدر شناسی نہ کی) اور جو کوئی خدا کی نعمت پا کر پھر اسے (محرومی و شقاوت سے) بدل ڈالے تو یاد رکھو! خدا (کا قانونِ مکافات) بھی سزا دینے میں بہت سخت ہے۔

یہ قوم تو سامنے موجود تھی اس لئے ان کی پریشان حالی اور تباہی و بربادی محسوس شکل میں چلتی پھرتی نظر آ رہی تھی، لیکن ان سے بیشتر اور متعدد اقوام ایسی گذر چکی تھیں جن کی صرف داستانیں باقی تھیں۔ اس لئے ان کے حالات بیان کر دیئے تاکہ ان سے عبرت حاصل کی جائے۔ اس عبرت آموزی کے لئے سب سے پہلے عرب کے ان کفار سے تخاطب کیا گیا جو اپنی قوت و سطوت کے نشہ میں قوانینِ الٰہیہ کی اطاعت سے سرکشی برتتے تھے۔ ان سے کہا گیا کہ ذرا اقوامِ گذشتہ کے حالات پر نگاہ ڈالو اور سوچو کہ کیا تم ان سے بھی زیادہ قوت و حشمت کے مالک ہو۔ جب قوانینِ خداوندی سے انکار و عدوان سے ان کا انجام ہلاکت اور تباہی ہوا تو کیا تمہارا بھی وہی انجام نہ ہوگا۔

اَهُمْ خَیْرٌ اَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ ۙ وَّ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ اَهْلَكْنٰهُمْ ۫ اِنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِیْنَ ○ (۴۴/۳۷)

(اے پیروانِ دعوتِ اسلامی! غور تو کرو) کیا یہ (یعنی منکرینِ دعوت) بہتر حالت میں ہیں یا

قومِ تبع اور وہ قومیں جو ان سے بھی پہلے گزر چکی ہیں، بہتر حالت میں تھیں؟ (مگر تمہیں خوب معلوم ہے کہ ہم نے ان کی قوت کی ذرا پروا نہیں کی) ہم نے انہیں ہلاک کر دیا۔ (کیونکہ) بلاشبہ وہ (ہمارے قوانین کے اعتبار سے) مجرم لوگ تھے[1]۔

سورۂ محمد میں ہے۔

وَ كَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ هِيَ اَشَدُّ قُوَّةً مِّنْ قَرْيَتِكَ الَّتِيْٓ اَخْرَجَتْكَ ۚ اَهْلَكْنٰهُمْ فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ ۝ (۴۷/۱۳)

(اے پیغمبرِ اسلام!) کتنی ہی آبادیاں تھیں جو قوت (شوکت) کے اعتبار سے تمہاری اس آبادی (والوں) سے زیادہ مضبوط تھیں جنہوں نے تمہیں باہر نکال دیا ہے (مگر جب ہمارا قانونِ مکافات حرکت میں آیا تو ان کی قوت کچھ بھی کام نہ آئی۔ نتیجہ یہی ہوا کہ) ہم نے (جب) ان کو ہلاک کر دیا تو ان کا کوئی مددگار بھی نکل کر نہ آسکا (اور ایک نہ ایک دن یہی ان لوگوں کا بھی انجام ہو کر رہنا ہے)۔

اور یہ اس لئے کہ

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ كَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ

---

[1] اس آیت سے متصل اور آیات پر مزید غور کیجئے اور دیکھئے کہ ان میں مکافاتِ عمل کے عالمگیر قانون کا فلسفہ کس خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے۔

وَ مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ۝ مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (۴۴/۳۸-۳۹)

اور (یاد رکھو) ہم نے آسمان و زمین کو اور ان تمام چیزوں کو جو آسمان و زمین میں ہیں، کھیل کود کے خیال سے پیدا نہیں کیا۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ ہم نے انہیں حق کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ لیکن (افسوس کہ) اکثر لوگ (اس حقیقت کو) جانتے ہی نہیں۔

یعنی تمام کائنات بالحق پیدا کی گئی ہے، محض کھیل تفریح کے لئے پیدا نہیں کی گئی۔ یہ سب کچھ ایک عظیم الشان مقصد کے حصول کی خاطر ہو رہا ہے اور کوئی مقصد حاصل نہیں ہو سکتا جب تک تمام اعمال اپنے نتائج ٹھیک ٹھیک مرتب نہ کریں۔

وَ اتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ ٥ (۴۷/۱۴)

(خیال تو کرو) کیا وہ شخص جو اپنے پروردگار کی طرف سے ایک واضح دلیل پر چل رہا ہو اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جس کے پاس (دلیل و برہان تو کچھ نہیں، البتہ) اس کی بدعملیاں اس کی نگاہ میں خوبیاں بن کر دکھائی دیں اور یہ لوگ صرف خواہشات (نفسانی) کی پیروی کرتے ہیں؟ (ظاہر ہے کہ دونوں کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔

جو کچھ عرب کے مستبد اور سرکش کہتے تھے وہی کچھ ان سے پہلے لوگ کہا کرتے تھے۔

فَاَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوْا فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ وَ قَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً ؕ اَوَ لَمْ یَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِیْ خَلَقَهُمْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً ؕ وَ كَانُوْا بِاٰیٰتِنَا یَجْحَدُوْنَ ٥ (۴۱/۱۵)

پس (دیکھو) عاد نے (خدا کی) زمین میں بلاوجہ غرور و تکبر کیا اور کہنے لگے "ہم سے بڑھ کر قوت میں زیادہ مضبوط کون ہو سکتا ہے؟" اور (اس انا و لاغیری کا نعرہ لگانے سے پہلے) کیا انہوں نے (اتنا بھی) نہ دیکھا کہ جس خدا نے انہیں پیدا کیا ہے وہ ان سے بھی بڑھ کر قوت کے اعتبار سے زیادہ مضبوط ہے! (سب کچھ جانتے ہوئے بھی) وہ لوگ (ضد اور عناد کے ساتھ) ہمارے قوانین کا انکار کرنے کے عادی ہو گئے تھے!

عاد اور ثمود تو کیا، فرعون جیسے استکبار و فرعونیت کے مجسموں کو قانونِ مجازات کی محکم گرفت نے نہ چھوڑا۔

وَ لَقَدْ جَآءَ اٰلَ فِرْعَوْنَ النُّذُرُ .... اِنَّ الْمُجْرِمِیْنَ فِیْ ضَلٰلٍ وَّ سُعُرٍ ٥ (۴۱ — ۵۴/۴۷)

اور (دیکھو) قومِ فرعون کے پاس بھی انکار و بدعملی کے نتائج سے آگاہ کرنے والے آ چکے تھے (مگر انہوں نے ہمارے قوانین کو (یکے بعد دیگرے) جھٹلا دیا۔ پھر (انجام یہی ہوا کہ) ہم نے انہیں ایک غالب قدرت والے کی طرح پکڑ لیا۔ (تو اب بتلاؤ کہ) کیا تمہارے انکار کرنے والے ان انکار کرنے والوں سے بہتر ہیں یا (خدا کی طرف سے) صحیفوں میں تمہارے لئے کوئی برأت (لکھ دی گئی) ہے۔ یا وہ کہتے ہیں کہ ہم ایک دوسرے کی مدد کرنے والی جمعیت ہیں؟ (شاید انہیں معلوم نہیں کہ) بہت جلد ان کی اس جمعیت کو شکست دیدی جائے گی اور وہ سب پیٹھ موڑ جائیں گے۔

اس انقلاب کا دن ان کے وعدہ کا دن ہے (اور شاید تمہیں معلوم نہیں) کہ انقلاب کا دن بہت ہی خوفناک اور بہت ہی تلخ دن ہوگا۔ بے شک مجرم لوگ ہیں ہی ہلاکت اور مصیبت میں۔

سورۃ مزمل میں ہے۔

اِنَّآ اَرۡسَلۡنَآ اِلَیۡکُمۡ رَسُوۡلًا ۬ۙ شَاہِدًا عَلَیۡکُمۡ کَمَاۤ اَرۡسَلۡنَاۤ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ رَسُوۡلًا ؕ...... فَمَنۡ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰی رَبِّہٖ سَبِیۡلًا ﴿۱۵-۱۹/۷۳﴾

(اے مخاطبینِ دعوتِ اسلامی!) بلاشبہ ہم نے تمہاری طرف بھی ایک رسول بھیج دیا ہے جو تم پر نگران ہے (بالکل اسی طرح) جیسے ہم نے فرعون کی طرف رسول بھیجا تھا۔ پس فرعون نے اس رسول کی نافرمانی کی تو ہم نے بھی اسے سخت گرفت کے ساتھ پکڑ لیا تو اگر تم انکار کر دگے تو اس دن (کی گرفت) سے کس طرح بچ سکتے ہو جس کی ہولناکی بچوں کو بوڑھا کردے گی۔ آسمان اس پر پھٹ پڑنے والا ہوگا اور خدا کا یہ وعدہ پورا ہو کر رہے گا۔

(یاد رکھو) بلاشبہ یہ تو ایک (فراموش کردہ حقیقت کی) یاددہانی ہے۔ سو جو چاہے اپنے پروردگار کی طرف راستہ اختیار کرلے (اور جو نہ چاہے نہ اختیار کرے)۔

آخری آیت کی حکمتِ بالغہ پر غور کیجئے۔ کیسے واضح الفاظ میں بیان کر دیا کہ قرآن تو فقط قانونِ مکافاتِ عمل اور اس کے اٹل اور محکم نتائج و عواقب کی یاددہانی ہے۔ سو جس کا جی چاہے اس سے عبرت حاصل کرے اپنے اللہ کے قانون کا اتباع کرے اور یوں زندگی کی سیدھی راہ پر ہولے، ورنہ اس کے لئے ہلاکت منتظر کھڑی ہے فرعون کی سرکشی اور فتنہ سامانی کا انجام تمام پس آئندگان کے لئے عبرت و موعظت کی زندہ داستان ہے۔

فَلَمَّاۤ اٰسَفُوۡنَا انۡتَقَمۡنَا مِنۡہُمۡ فَاَغۡرَقۡنٰہُمۡ اَجۡمَعِیۡنَ ﴿ۙ﴾ فَجَعَلۡنٰہُمۡ سَلَفًا وَّ مَثَلًا لِّلۡاٰخِرِیۡنَ ﴿۵۵-۵۶/۴۳﴾

سو جب انہوں نے ہمارے قوانین کی خلاف ورزی کی تو ہم نے ان سے انتقام لیا چنانچہ ان سب کو غرق کر دیا اور اس طرح ہم نے انہیں بعد میں آنے والوں کے لئے نمونہ اور مثال بنا دیا۔

پھر جو قوم ان اقوامِ گذشتہ کے احوال و عواقب سے عبرت حاصل نہیں کرتی وہ درحقیقت خدا کے قانونِ مکافات کی تکذیب کرتی ہے اور نہیں سمجھتی کہ اس قانون کی ہمہ گیری انہیں چاروں طرف سے محیط ہے۔

ہَلۡ اَتٰىکَ حَدِیۡثُ الۡجُنُوۡدِ ﴿ۙ﴾ فِرۡعَوۡنَ وَ ثَمُوۡدَ ﴿ؕ﴾ بَلِ الَّذِیۡنَ

كَفَرُوْا فِيْ تَكْذِيْبٍ ۙ وَّ اللّٰهُ مِنْ وَّرَآئِهِمْ مُّحِيْطٌ ۚ (۸۵/۲۰-۱۷)

(اے پیغمبرِ اسلام!) کیا تم تک فرعون اور ثمود کے لشکروں کی باتیں پہنچی ہیں؟ اصل بات یہ ہے کہ جن لوگوں نے سرکشوں کا راستہ اختیار کیا ہے وہ (سچائی کو) جھٹلانے ہی میں لگے رہتے ہیں اور اللہ (کا قانونِ مکافات) انہیں ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے (جس سے بچ کر وہ کہیں نکل نہیں سکتے)۔

یہ قانون ایسے محفوظ مقام (علم الٰہیہ) میں رکھا گیا ہے جہاں کسی کی دسترس نہیں ہو سکتی کہ اس کے نتائج و اثرات میں کسی قسم کا ردو بدل کر سکے۔

بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ۙ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ۧ (۸۵/۲۲-۲۱)

اصل بات یہ ہے کہ وہ سچائی (جسے یہ لوگ جھٹلانے میں لگے رہتے ہیں) بڑی شان والا قرآن ہے جو محفوظ تختی میں ہے۔

ان لوگوں سے کہا کہ دور مت جاؤ۔ خود اپنے گرد و پیش کی اُجڑی ہوئی بستیوں کی طرف دیکھو اور غور کرو کہ ان کا انجام کیا ہوا۔

وَ لَقَدْ اَهْلَكْنَا مَا حَوْلَكُمْ مِّنَ الْقُرٰى وَ صَرَّفْنَا الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ○ (۴۶/۲۷)

اور (اے مخاطبینِ دعوتِ اسلامی!) ہم نے تمہارے آس پاس اور ارد گرد کی بہت سی بستیوں کو برباد کر دیا اور ہم نے اپنے قوانین کو بار بار دہرایا کہ ممکن ہے (یہ لوگ) لوٹ آئیں (اور اپنی بدعملیوں سے باز آجائیں)۔

ان میں وہ قومیں بھی شامل ہیں جو اپنی مرکزیت کھو بیٹھنے کے بعد از یں سو راندہ و ازاں سو درماندہ — دربدر خاک بسر، ماری ماری پھر رہی ہیں اور زمین کے کسی گوشے پر انہیں تمکن حاصل نہیں۔ کیا تم چاہتے ہو کہ تمہارا بھی یہی مآل ہو؟

وَ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَشَدُّ مِنْهُمْ بَطْشًا فَنَقَّبُوْا فِي الْبِلَادِ ؕ هَلْ مِنْ مَّحِيْصٍ ○ (۵۰/۳۶)

اور (اے مخاطبینِ دعوتِ اسلامی!) ان (منکرینِ دعوت) سے پہلے ہم نے کتنی ہی نسلیں برباد کر دی ہیں جو ان سے زیادہ طاقت و قوت میں مضبوط تھیں۔ چنانچہ انہوں نے تمام شہروں کو چھان مارا مگر جب

ہمارا قانونِ مکافات حرکت میں آیا) تو کیا (ان کے لئے) کوئی بھی بھاگنے کی جگہ تھی؟

حیرت ہے کہ تم ان واقعات کو اپنے کانوں سے سنتے اور ان تباہ حال اقوام کے پس ماندگان کی عبرت انگیز حالت کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہو لیکن پھر بھی اپنی روش میں اصلاح نہیں کرتے۔

تِلْكَ الْقُرٰى نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآىِٕهَا ۚ وَ لَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانُوْا لِیُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا مِنْ قَبْلُ ؕ كَذٰلِكَ یَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الْكٰفِرِیْنَ ۝ وَ مَا وَجَدْنَا لِاَكْثَرِهِمْ مِّنْ عَهْدٍ ۚ وَ اِنْ وَّجَدْنَاۤ اَكْثَرَهُمْ لَفٰسِقِیْنَ ۝ (۷/۱۰۱—۱۰۲)

(اے پیغمبر!) یہ ہیں (دنیا کی پرانی) آبادیاں جن کے حالات ہم تمہیں سناتے ہیں۔ ان سب میں ان کے پیغمبر (سچائی کی) روشن دلیلوں کے ساتھ آئے، مگر ان کے بسنے والے ایسے نہ تھے کہ جو بات پہلے جھٹلا چکے تھے اُسے (سچائی کی نشانیاں دیکھ کر) مان لیں۔ سو دیکھو! اس طرح خدا ان لوگوں کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے جو (ہٹ دھرمی سے) انکار کرتے ہیں۔

اور ان میں سے اکثروں کو ہم نے ایسا پایا کہ اپنے عہد پر قائم نہ تھے اور اکثروں کو ایسا ہی پایا کہ یک قلم نافرمان تھے!

تم اس لئے عبرت حاصل نہیں کرتے کہ تم قانونِ مکافاتِ عمل پر (جس کا منتہیٰ حیاتِ اخروی پر ایمان ہے) یقین نہیں رکھتے۔

وَ لَقَدْ اَتَوْا عَلَى الْقَرْیَةِ الَّتِیْۤ اُمْطِرَتْ مَطَرَ السَّوْءِ ؕ اَفَلَمْ یَكُوْنُوْا یَرَوْنَهَا ۚ بَلْ كَانُوْا لَا یَرْجُوْنَ نُشُوْرًا ۝ (۲۵/۴۰)

اور یہ حقیقت ہے کہ وہ لوگ (بارہا) اس آبادی پر گزر چکے ہیں جس پر (پتھروں وغیرہ کی) بُری طرح بارش برسائی جا چکی ہے۔ (مگر ان لوگوں نے کوئی عبرت حاصل نہ کی) تو کیا ان لوگوں نے اس آبادی کو دیکھا ہی نہیں (اور آنکھیں بند کر کے ہمیشہ وہاں سے گزر گئے)؟ نہیں! بات دراصل یہ ہے کہ انہیں دوبارہ زندہ ہونے (اور اعمال کی جواب دہی) کی کوئی امید ہی نہیں ہے۔

لیکن نصیحت تو وہ حاصل کرے جو ان تاریخی امثال و نظائر کو بہ نگاہِ بصیرت دیکھے، بگوشِ ہوش سنے اور پھر انہیں قلب کی گہرائیوں میں اتار کر ان پر غور و فکر کرے۔ ورنہ اگر انہیں اساطیر الاوّلین (پہلے لوگوں کے قصّے کہانیاں)

سمجھ کر سن لیا اور پڑھ لیا تو ظاہر ہے کہ اس "داستان گوئی" سے کیا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے؟

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِمَنْ کَانَ لَہٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَی السَّمْعَ وَ هُوَ شَهِیْدٌ ۝ (۵۰/۳۷)۔

بلاشبہ اس میں اُن ہی لوگوں کے لئے نصیحت ہے جن کے پاس (صداقت آشنا) دل ہو یا یہ کہ وہ (بات کی طرف) کان بھی لگائیں اور خود (اپنے ہوش و حواس کے ساتھ) موجود بھی رہیں (یہ نہیں کہ کان تو یہاں ہیں اور دھیان کہیں اور)۔

یہ نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ انسان پاداشِ عمل سے خوف نہ کھائے۔ جو جلنے کی تکلیف سے نہیں ڈرتا اس کے سامنے جلے ہوئے لوگوں کی دردوکرب کی اندوہناک داستانیں ہزار دہرائیے، اس کے دل پر اس سے کیا اثر ہو سکتا ہے؟ اس لئے فرمایا۔

وَ تَرَکْنَا فِیْهَآ اٰیَةً لِّلَّذِیْنَ یَخَافُوْنَ الْعَذَابَ الْاَلِیْمَ ۝ (۵۱/۳۷)

اور ہم نے اس میں ان لوگوں کے لئے جو دردناک عذاب سے ڈرتے ہوں ایک نشانی چھوڑ دی۔

لہٰذا تاریخی حقائق کیسی ہی عظیم الشان حکمتِ بالغہ پر منتج ہوں، قانونِ مکافات کی داروگیر سے اعراض برتنے والی قوم پر اس کا کچھ اثر نہیں ہو سکتا۔

وَ لَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنَ الْاَنْۢبَآءِ مَا فِیْهِ مُزْدَجَرٌ ۝ حِکْمَةٌۢ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ ۝ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ یَوْمَ یَدْعُ الدَّاعِ اِلٰی شَیْءٍ نُّکُرٍ ۝ خُشَّعًا اَبْصَارُهُمْ یَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ کَاَنَّهُمْ جَرَادٌ مُّنْتَشِرٌ ۝ (۵۴/۷—۴)

اور ان کے پاس وہ وہ خبریں آ چکی ہیں جن میں دھمکیاں اور حکمتِ بالغہ (سب کچھ موجود تھیں) مگر (نتائجِ اعمال سے) ڈرانے والے کچھ کام نہ آ سکے۔ سو (اے پیغمبر!) تم ان کی پروا نہ کرو اور اس دن کا انتظار کرو، جس دن بلانے والا سخت چیز کی طرف بلائے گا، آنکھیں (شرم و ندامت سے) جھکی ہوئی ہوں گی۔ (اپنی) خواب گاہوں سے وہ اس طرح نکل رہے ہوں گے جیسے پراگندہ اور منتشر ٹڈیاں۔

اس لئے قرآن اسی کے لئے باعثِ نصیحت و وجہِ اصلاح ہو سکتا ہے جو اس سے نصیحت حاصل کرنے کا متمنی

ہو۔ سورۂ قمر کی جو آیاتِ جلیلہ اوپر گذر چکی ہیں ان کے بعد مختلف اقوام و ملل گذشتہ کے کوائف زندگی، ان کے فساد انگیز اعمالِ حیات اور ان اعمال کے تباہ کن نتائج و عواقب کا بیان ہے ان میں سے ہر قوم کے عبرت انگیز انجام کے بعد اس حقیقت کو دہرایا گیا ہے کہ

وَ لَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝ (۵۴/۱۷)

اور یہ واقعہ ہے کہ ہم نے نصیحت حاصل کرنے کے لئے قرآن کو آسان کر دیا ہے۔ تو کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے؟

قرآنِ کریم کھول کر ان آیات کو بہ نگاہِ تدبر دیکھئے۔ حکمت و موعظت کے نئے نئے باب کھلتے نظر آئیں گے۔

اب تک تاریخی نظائر پر غور و تدبر کے دو طریقے ہمارے سامنے آئے ہیں۔ ایک یہ کہ کسی مٹی ہوئی قوم کے پریشان حال افراد کی حالتِ زار و زبوں پر غور کر کے سوچا جائے کہ یہ چلتے پھرتے جنازے کس شاندار ماضی کے افسانے ہیں؟ اور دوسرے یہ کہ امم سابقہ کے عروج و زوال کی داستانیں جو زبان زدِ خلائق ہوں یا تاریخ کے صفحات میں محفوظ، مرکزِ نگاہ بنائی جائیں۔ لیکن تاریخی حقائق کی نقاب کشائی اور ان سے عبرت آموزی کا ایک اور طریق بھی ہے جسے اثری انکشافات

اثری انکشافات

ARCHAEOLOGICAL DISCOVERIES کہا جاتا ہے۔ دنیا نے یہی سمجھا ہے کہ یہ عظیم المرتبت علمی کارنامہ عصرِ حاضر ہی کی ایجاد ہے لیکن جس کی نگاہیں قرآن پر ہیں وہ جانتا ہے کہ اس کی اوّلیت کا سہرا بھی اسی جامع علوم و حِکَم کے سر ہے۔ قرآن کے اوراق کو الٹئے اور دیکھئے کہ اس نے کس کس انداز سے کہا ہے کہ ان لوگوں سے کہو کہ جاؤ، زمین میں چلو پھرو اور جن اقوامِ گذشتہ کے افسانے تمہارے کانوں تک پہنچے ہیں ان کی اجڑی ہوئی بستیوں میں پہنچو اور ان کی مٹی ہوئی عظمت اور چھنی ہوئی سطوت کے کھنڈرات پر غور کرو اور دیکھو کہ ان کی بکھری ہوئی پرانی ٹھیکریوں پر عبرت و موعظت کی کتنی اثر انگیز اور دل دوز داستانیں منقوش ہیں۔ ان نقوش کو دیکھو اور ان کے آئینے میں ماضی کے واقعات اور سوانح کا مطالعہ کرو۔

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ ۙ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ۝ هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَ هُدًى وَّ مَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ (۱۳۷—۳/۱۳۸)

اور دیکھو تم سے پہلے بھی دنیا میں (قوموں کی حیات و ممات اور عروج و زوال کے) دستور و قوانین کارفرما رہ چکے ہیں (اور وہ تمہارے لئے معطل نہیں ہو جائیں گے) پس دنیا کی سیر کرو اور دیکھو کہ جو لوگ احکامِ حق کو جھٹلانے والے تھے ان کا انجام کیا ہوا اور پاداشِ عمل میں کیسے نتائج پیش آئے؟ یہ لوگوں (کے فہم و بصیرت) کے لئے ایک بیان ہے اور ان لوگوں کے لئے جو متقی ہیں ہدایت و موعظت ہے!

اس سے ایک ہی آیت بعد فرمایا کہ وَ تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ج تم مداولتِ ایام پر غور کرو اور دیکھو کہ تاریخ کس طرح اپنے آپ کو دہراتی ہے؟ اقوام و ملل کے عروج و زوال کا قانون کس طرح عالمگیر اور جزرس ہے؟ سورۂ یوسف میں ہے۔

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ قف عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِيْ ط وَ سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَ مَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ (۱۲/۱۰۸)

(اے پیغمبر!) تم کہہ دو کہ میری راہ تو یہ ہے میں جو تمہیں اللہ کی طرف بلاتا ہوں تو علیٰ وجہ البصیرت بلاتا ہوں اور (اس راہ میں) جن لوگوں نے میرے پیچھے قدم اٹھایا ہے وہ بھی (اسی طرح) بلاتے ہیں۔ اللہ بلند و بالا ہے۔ میں شرک کرنے والوں میں نہیں ہوں!

دعوت الی اللہ علیٰ وجہ البصیرت۔ اس کے بعد فرمایا۔

وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى ط اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَ لَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اتَّقَوْا ط اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ (۱۲/۱۰۹)؛ (نیز ۱۶/۳۶)

(اور اے پیغمبر!) ہم نے تم سے پہلے کسی رسول کو نہیں بھیجا ہے مگر اس طرح کہ وہ باشندگانِ شہر ہی میں سے ایک آدمی تھا اور ہم نے اس پر وحی اتاری تھی۔ پھر کیا یہ لوگ (جو تمہارے اعلانِ رسالت پر متعجب ہو رہے ہیں) زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے کہ ان لوگوں کا انجام کیسا کچھ ہو چکا ہے جو پہلے گذر چکے ہیں؟ اور جو لوگ قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرتے ہیں تو یقیناً آخرت کا گھر ان کے لئے کہیں بہتر ہے۔ پھر (اے گروہِ مخاطب!) کیا تم سمجھتے بوجھتے نہیں؟

تم نے قوم عاد و ثمود کے تذکرے سُنے، ان کے مٹنے کی داستانیں تمہارے کانوں تک پہنچیں۔ اٹھو اور دیکھو۔

فَتِلْكَ بُيُوتُهُمْ خَاوِيَةً بِمَا ظَلَمُوا ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ○ (۲۷/۵۲)

چنانچہ یہ ان کے مکانات ہیں جو اوندھے پڑے ہیں۔ (کیوں؟) اس وجہ سے کہ اُنہوں نے ظلم اور ناانصافی کا راستہ اختیار کر لیا تھا۔ بلاشبہ اس (صورتِ حال) میں ان لوگوں کے لئے (بڑی) نشانی ہے جو (ذرا بھی) علم (وشعور) رکھتے ہیں۔

ان اُجڑے ہوئے دیار سے ان شوریدہ بخت اقوام کی تباہی پر غور کرو۔ ان مساکن سے ساکنین کی حالت کا اندازہ لگاؤ۔ ان کے کھنڈرات سے ان کی عمارات کی رفعت و شوکت پر قیاس کرو (۳۷-۲۹/۳۸)۔ تم صبح و شام آنکھیں بند کر کے ان کھنڈرات سے گذر جاتے ہو اور نہیں سوچتے کہ ان کے اندر ماضی کے کتنے کتنے بڑے قدآور آئینے مدفون ہیں جن میں حال کے خدوخال نمایاں طور پر دکھائی دے سکتے ہیں۔ ان پر سے گزرتے ہوئے اندھوں کی طرح مت گذر جاؤ۔ آنکھیں کھول کر چلو اور ان ٹھیکریوں میں آنے والے دور کی عبرت آموز تصویریں دیکھو۔

وَإِنَّكُمْ لَتَمُرُّونَ عَلَيْهِم مُّصْبِحِينَ ۙ وَبِاللَّيْلِ ۗ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ○ (۳۷/۱۳۷-۱۳۸)

اور بلاشبہ تم لوگ اُن (برباد شدہ اقوام کی آبادیوں) پر صبح کو اور راتوں کو گذرتے رہتے ہو۔ تو کیا تم (پھر بھی) کچھ سمجھتے نہیں؟

اور یہ اس لئے کہ تمہاری آنکھوں میں دیکھنے کی، تمہارے کانوں میں سننے کی اور تمہارے دلوں میں سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ سورۂ حج میں پہلے یہ کہا گیا ہے کہ

فَكَأَيِّن مِّن قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَقَصْرٍ مَّشِيدٍ ○ (۲۲/۴۵)

پھر دیکھو، کتنی ہی بستیاں ہیں کہ ہم نے انہیں ہلاک کر دیا اور وہ ظلم کرنے والی تھیں۔ وہ ایسی اُجڑیں کہ اپنی چھتوں پر گر کر رہ گئیں۔ کنویں ناکارہ ہو گئے۔ سربفلک محل کھنڈر بن گئے۔

اس کے بعد اس سے اگلی آیت کو دیکھئے اور دل کی آنکھوں سے دیکھئے۔ فرمایا۔

اَفَلَمۡ یَسِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَتَکُوۡنَ لَہُمۡ قُلُوۡبٌ یَّعۡقِلُوۡنَ بِہَاۤ اَوۡ اٰذَانٌ یَّسۡمَعُوۡنَ بِہَا ۚ فَاِنَّہَا لَا تَعۡمَی الۡاَبۡصَارُ وَ لٰکِنۡ تَعۡمَی الۡقُلُوۡبُ الَّتِیۡ فِی الصُّدُوۡرِ ۝ (۲۲/۴۶)

کیا یہ لوگ ملکوں میں چلے پھرے نہیں کہ عبرت حاصل کرتے؟ ان کے پاس دل ہوتے تو سمجھتے، کان ہوتے تو سنتے اور پاتے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی اندھے پن میں پڑتا ہے، تو آنکھیں اندھی نہیں ہوجایا کرتیں (جو سروں میں ہیں)، دل اندھے ہوجاتے ہیں جو سینوں کے اندر پوشیدہ ہیں!

اس عدیم النظیر ٹکڑے کو جلی حروف میں لکھ کر سامنے آویزاں کر لیجئے کہ اِنَّہَا لَا تَعۡمَی الۡاَبۡصَارُ وَ لٰکِنۡ تَعۡمَی الۡقُلُوۡبُ الَّتِیۡ فِی الصُّدُوۡرِ ۝

غور کیجئے! ان اثری انکشافات کی تاکید کس قوم سے کی گئی تھی اور اس پر عمل کس نے کیا؟ آج یورپ کے علمائے اثریات نے مدت العمر کی محنتِ شاقہ اور مسلسل سعی و عمل سے انہی زمین دوز کھنڈرات سے اقوامِ سابقہ کے تہذیب و تمدن اور عروج و زوال کی حتی الامکان تاریخ مرتب کر لی ہے۔ اور ایک ہم ہیں کہ خود اپنے کھنڈرات کے آئینے میں اپنی حالت نہیں دیکھتے۔ لیکن یورپ نے یہ تمام سعی و کاوش محض علمی تحقیقات کی غرض سے ہی کی اور ان سے وہ صحیح تاریخی فائدہ نہ اٹھایا جس کی طرف قرآن کریم کی حکمتِ بالغہ راہ نمائی کرتی ہے۔ اگر یہ تمام کدو کاوش قرآنی روشنی میں کی جاتی تو مغرب ان تمام علمی ذخیروں کے بعد اس طرح ہلاکت میں نہ گرتا۔ قرآن کریم کی رُو سے ان تمام اثری انکشافات اور تاریخی تحقیقات کا منتہیٰ یہ ہے کہ ان سے قوانینِ خداوندی پر چلنے کی دلیل حاصل کی جائے نہ کہ انہیں محض علمی تفنن کا ذریعہ بنالیا جائے۔ سورۂ سجدہ میں فرمایا۔

اثری تحقیقات سے غرض؟

اَوَ لَمۡ یَہۡدِ لَہُمۡ کَمۡ اَہۡلَکۡنَا مِنۡ قَبۡلِہِمۡ مِّنَ الۡقُرُوۡنِ یَمۡشُوۡنَ فِیۡ مَسٰکِنِہِمۡ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ ؕ اَفَلَا یَسۡمَعُوۡنَ ۝ (۳۲/۲۶)

کیا اس کتاب نے ان پر یہ بات واضح نہیں کر دی تھی کہ ہم نے ان سے پہلے کتنی ہی نسلیں برباد کر دی ہیں جن کے مکانوں کے درمیان وہ چلتے پھرتے ہیں۔ (اگر نظرِ غور سے دیکھا جائے تو) بلاشبہ اس میں بڑی ہی نشانیاں تھیں۔ تو کیا وہ لوگ (ان واقعات کو) سنتے ہی نہیں۔

ان کھنڈرات کی ٹھیکریاں بھی اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں جو قانونِ فطرت کی شکل میں ہر جگہ جاری وساری ہے۔
اس لئے اس سے اگلی آیت میں فرمایا۔

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا نَسُوقُ الْمَاءَ إِلَى الْأَرْضِ الْجُرُزِ فَنُخْرِجُ بِهِ زَرْعًا تَأْكُلُ مِنْهُ أَنْعَامُهُمْ وَأَنفُسُهُمْ ۖ أَفَلَا يُبْصِرُونَ ۝ (۳۲/۲۷)

کیا انہوں نے (اتنا بھی) نہیں دیکھا کہ ہم ہی ہیں جو پانی کو خالی (اور خشک) زمین کی طرف لے جاتے ہیں اور اس سے کھیتیاں اگا دیتے ہیں جس سے ان کے چوپائے بھی کھاتے ہیں اور وہ خود بھی کھاتے ہیں. کیا وہ (اتنا بھی) نہیں دیکھتے ؟

جو شخص اپنا کھیت پانی کے نشیب کی طرف بنائے گا اس کی زمین میں پیداوار کی صلاحیت ہوگی. وہ فطرت کی گہرباریوں سے بہرہ یاب ہوگا. جو ایسا نہ کرے گا پانی کی زرریزی اس کے کسی کام نہ آئے گی خواہ علمی اعتبار سے اسے قانونِ زراعت کی تمام جزئیات تک پر بھی عبور کیوں نہ ہو. جو شخص سیاحتِ ارضی اور اثری انکشافات سے اس نتیجہ تک نہیں پہنچتا کہ قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی کا انجام کیا ہوتا ہے اس کے سر کی آنکھیں کھلی لیکن دل کی آنکھیں اندھی رہتی ہیں. سورۂ نمل میں ہے۔ (۲۷/۶۹)

قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِينَ ۝

(اے پیغمبرِ اسلام! ان لوگوں سے) کہہ دو کہ ذرا زمین میں چلیں پھریں اور دیکھیں کہ مجرموں کا انجام کیسا کچھ ہو چکا ہے!

اور اس سے ذرا آگے چل کر فرمایا کہ

إِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتَىٰ وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَاءَ إِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِينَ ۝ وَمَا أَنتَ بِهَادِي الْعُمْيِ عَن ضَلَالَتِهِمْ ۖ إِن تُسْمِعُ إِلَّا مَن يُؤْمِنُ بِآيَاتِنَا فَهُم مُّسْلِمُونَ ۝ (۸۰-۲۷/۸۱)

(اے پیغمبرِ اسلام!) یہ حقیقت ہے کہ تم مردوں کو (اپنی باتیں) نہیں سنا سکتے اور نہ ہی اپنی پکار بہروں کو سنا سکتے ہو (خصوصاً) جبکہ وہ پیٹھ موڑ کر چل دیں اور نہ ہی تم اندھوں کو ان کی گمراہی سے ہٹا کر صحیح راستے کی طرف لا سکتے ہو. تم (اچھی طرح سمجھ لو کہ) ان لوگوں کے سوا جو ہماری آیتوں پر یقین رکھتے ہیں تم کسی کو (اپنی پکار) سنا ہی نہیں سکتے. چنانچہ وہی لوگ ہیں جو

(ہماری) اطاعت (اور تابعداری) کرنے والے ہیں!

سِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ غور فرمایا آپ نے کہ علمی کاوشوں سے صحیح طور پر کون متمتع ہو سکتا ہے؟ وہی جو قانونِ مکافاتِ عمل پر ایمان رکھتا ہے۔ جو قوانینِ فطرت پر اس انداز سے غور نہیں کرتا اسے اس کا علم ہلاکت سے نہیں بچا سکتا۔ سِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ کو تو مبدا و معاد کی دلیلِ راہ بن جانا چاہیئے۔

قُلۡ سِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَانۡظُرُوۡا کَیۡفَ بَدَاَ الۡخَلۡقَ ثُمَّ اللّٰہُ یُنۡشِئُ النَّشۡاَۃَ الۡاٰخِرَۃَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۲۹/۲۰﴾

(اے پیغمبرِ اسلام!) کہہ دو کہ زمین میں گھومو پھرو پھر دیکھو کہ خدا نے اپنی مخلوق کو ابتداءً کس طرح پیدا کیا ہے (اور خدا کی خلاقیت یہیں ختم نہیں ہو گی)۔ پھر (اس کے بعد) خدا کے قانون کے مطابق نشاۃِ ثانیہ ہو گی۔ بلاشبہ خدا ہر چیز پر قادر ہے!

اور اس سے اللہ کے اس قانونِ مشیّت کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیئے جس کے ماتحت قوموں کے اعمال کی جزا و سزا مرتب ہوتی ہے (۲۹/۲۱)۔ اس قانون کی ہمہ گیری سے کائنات کے کسی گوشے میں چھپ کر بھی انسان بچ نہیں سکتا۔

وَ مَاۤ اَنۡتُمۡ بِمُعۡجِزِیۡنَ فِی الۡاَرۡضِ وَ لَا فِی السَّمَآءِ ۫ وَ مَا لَکُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ مِنۡ وَّلِیٍّ وَّ لَا نَصِیۡرٍ ﴿۲۹/۲۲﴾

اور (اس حقیقت کو بھی اچھی طرح ذہن نشین کر لو کہ) تم خدا کو نہ زمین میں عاجز کر سکتے ہو نہ آسمان میں۔ اور خدا کے سوا کوئی قوت بھی تمہاری دوست اور مددگار نہیں بن سکتی!

سورۂ روم میں فرمایا،

اَوَ لَمۡ یَسِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ .... وَ کَانُوۡا بِھَا یَسۡتَہۡزِءُوۡنَ ﴿۳۰/۹-۱۰﴾

اگر یہ لوگ اپنی ذات اور کائنات کے نظام پر غور کرنا نہیں چاہتے تو کم از کم تاریخی نوشتوں ہی کو دیکھیں کہ وہ انہیں کس نتیجہ پر پہنچاتے ہیں؟ اس مقصد کے لئے اگر یہ لوگ آنکھیں کھول کر دنیا میں چلیں پھریں تو انہیں نظر آ جائے گا کہ جن قوموں نے ان سے پہلے انہی جیسی روش اختیار کی تھی ان کا انجام کیا ہوا تھا۔ وہ قومیں قوت و شوکت میں ان سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھیں (۳۰/۲۱)۔ انہوں نے زمین کے سینے کو چیر کر اس میں چھپے ہوئے خزانوں (زرعی اور معدنی پیداوار) کو باہر نکالا،

ملکوں کو آباد کیا۔ اور ان کی آبادیاں ان مخاطبین کی آبادیوں سے کہیں زیادہ تھیں۔ ان کے رسول ان کے پاس خدا کے واضح قوانین لے کر آئے۔ (قبل اس کے کہ یہ بتایا جائے کہ....... اس کے بعد کیا ہوا' اس حقیقت کو اچھی طرح یاد رکھو کہ) ایسا کبھی نہیں ہوا کہ خدا نے کسی قوم کو یونہی ظلم اور زیادتی سے تباہ کر دیا ہو۔ قومیں خود اپنے اوپر آپ ظلم کرتی ہیں اور تباہ ہو جاتی ہیں (۳۵/۴۴)۔

ہاں تو خدا کے رسول ان کے پاس آئے۔ لیکن انہوں نے انہیں جھٹلایا، ان کا تمسخر اڑایا اور اپنی اسی روش پر قائم رہے جس سے معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا ہوتی تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ لوگ جنہوں نے اس قسم کی ناہمواریاں پیدا کرنے والا نظام قائم کر رکھا تھا' ان کی اپنی زندگی میں ناہمواریاں پیدا ہو گئیں' ان کا توازن بگڑ گیا (اور وہ تباہ و برباد ہو کر رہ گئے)۔

تاریخ و اثر کے حقائق پر غور کرو اور سوچو کہ کس طرح وہی عالمگیر اور محکم قانون انسان کی حیاتِ اجتماعیہ کو گھیرے ہوئے ہے۔ اور اس کے بعد سوچو کہ مبداء و معاد کا قانون حق ہے یا نہیں (۱۱-۳۰/۱۲)۔ یعنی یہ قانونِ مشیت ہے

مبداء و معاد

کہ ہر شے کی تخلیق (ابتداء) ایک خاص مقصد کے ماتحت ہوتی ہے اور اس مقصد کے حصول کی خاطر وہ ایک خاص نظام اور قاعدہ کے مطابق مختلف مراحل طے کرتی آگے بڑھتی ہے حتٰی کہ اس مقام تک پہنچ جاتی ہے جو اس کے لئے منزل قرار دیا گیا ہے۔ یہی حالت انسان کی ہے۔ لہٰذا عالمِ انفس و آفاق کے مشاہدات و تجارب ہوں یا انسان کی عمرانی و اجتماعی زندگی (تاریخ) کے امثال و نظائر، ان سب پر غور و فکر کو ایک ہی حقیقت کی طرف منجر ہونا چاہیئے۔ اور وہ مبداء و معاد کی حقیقت ہے۔ وہ قانونِ مکافاتِ عمل کی ہمہ گیری کی واقعیت ہے اور اسی کا نام ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت ہے۔

اگر بایں نرسیدی تمام بولہبی است

پھر جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، قوانینِ الٰہیہ سے سرکشی قوت کے گھمنڈ پر کی جاتی ہے۔ اس لئے اس حقیقت کی طرف خاص طور پر توجہ مرتکز کرائی گئی کہ سیاحتِ ارضی اور اثری تحقیقات سے یہ دیکھو کہ امم گذشتہ

علم و قوت کا غلط استعمال

قوت و ثروت میں کچھ کم نہ تھیں (۲۲-۲۱/۴۰)۔ قوت و سطوت میں ہی کم نہ تھیں بلکہ علم و دانش میں بھی۔ اسی لئے وہ اپنے علم و عقل

پر اس قدر نازاں تھے کہ انہوں نے قوانینِ الٰہیہ کی پروا نہ کی اور یہ نہ سمجھے کہ علم بھی وہی نافع ہوتا ہے جس کا ماحصل تابعِ قوانینِ خداوندی رہے۔ ورنہ اگر علم و عقل انسان کی اپنی خواہشات کے تابع رہیں تو دنیا کو بدترین جہنم بنا دیتے ہیں۔ یقین نہ ہو تو پوچھو یورپ کے مدبرین سے کہ ان پر کیا گزر رہی ہے؟[1] (دیکھئے آیات ۸۳-۴۰/۸۲؛ ۸۵-۴/۸۴؛ ۱۱-۴۷/۱۰؛ ۴۴-۳۰/۴۲)۔

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَانُوْٓا اَكْثَرَ مِنْهُمْ وَاَشَدَّ قُوَّةً وَّاٰثَارًا فِي الْاَرْضِ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ فَلَمَّا جَاۗءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ (۸۳-۴۰/۸۲)۔

(اے پیغمبرِ اسلام!) تو کیا یہ لوگ زمین میں گھومے پھرے نہیں کہ دیکھ لیتے کہ ان لوگوں کا انجام کیسا کچھ ہو چکا ہے جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں۔ وہ لوگ زمین میں طاقت اور دیگر استحکامات کے لحاظ سے ان سے بہت زیادہ مضبوط تھے۔ مگر جو کچھ (قوت و شوکت اور سطوت و حکومت کے اعتبار سے) انہوں نے حاصل کر رکھا تھا، وہ ان کے کچھ بھی کام نہ آسکا۔ چنانچہ جب ان کے پاس اُن کے رسول واضح دلائل لے کر آئے، تو (ان کی دعوت پر انہوں نے مطلق کان نہ لگائے، بلکہ) جو کچھ (ناقص اور شیطانی) علم ان کے پاس تھا اسی پر اکڑنے اور اترانے لگے (اور آخرکار) جس چیز کا (یعنی خدا کے قانونِ مکافات کا) وہ مذاق اڑایا کرتے تھے وہ اُن پر مسلّط ہو کر رہا۔

جب انہیں عذابِ الٰہی گھیر لیتا ہے تو اس وقت کسی قدر جھکتے ہیں اور ایک جدید نظامِ عالم NEW WORLD ORDER کی سوجھتی ہے۔ لیکن اعمال کے ظہورِ نتائج کے وقت اس قسم کی اصلاحات کا خیال نفع مند نہیں ہو سکتا۔

فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ ۝ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا ۭ

---

[1] اس کے لئے "انسان نے کیا سوچا" دیکھئے۔

سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِیْ قَدْ خَلَتْ فِیْ عِبَادِهٖ ۚ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ ۝

(۴۰/۸۴—۸۵)

پھر جب وہ عذاب دیکھ لیتے ہیں تو پکارتے ہیں کہ ہم خدائے یکتا ویگانہ پر ایمان لے آئے اور ان (معبودانِ باطل) کا انکار کر دیا جنہیں ہم خدا کے ساتھ شریک کرنے والے تھے۔ مگر (اب) جبکہ وہ ہمارا عذاب دیکھ چکے ان کا یہ ایمان انہیں نفع نہیں دے سکتا۔ یہی خدا کا طریقہ (اور قانون) ہے جو اس کے بندوں میں ہمیشہ سے چلا آ رہا ہے اور اس حد پر پہنچ کر یہ انکار کرنے والے ہمیشہ خسارہ ہی میں رہتے ہیں۔

اُس وقت تباہی لازمی ہے۔

جُوئے رَواں پھر یہ بھی یاد رکھئے کہ یہ ہلاکت اور بربادی اسی دنیا کی زندگی تک ختم نہیں ہو جاتی۔ زندگی ایک جوئے رواں ہے۔ موت سے اس کا خاتمہ نہیں ہو جاتا بلکہ زندگی اس سے اگلی منزل میں قدم رکھتی ہے۔ اس لئے جس قوم پر اس زندگی میں ذلت و رسوائی کا ہلاکت آمیز عذاب مسلط ہو جائے وہ اس سے اگلی زندگی میں بھی ذلیل و خوار ہوگی۔ بلکہ وہاں کی ذلت و رسوائی اس سے بھی زیادہ درد انگیز ہوگی اس لئے کہ وہاں اعمال کے نتائج زیادہ محسوس شکل میں سامنے آجائیں گے۔

كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَاَتٰهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝ فَاَذَاقَهُمُ اللّٰهُ الْخِزْيَ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝ (۳۹/۲۶—۲۵)

جو لوگ ان سے پہلے گزر چکے ہیں انہوں نے بھی (سچائی کو) جھٹلایا تھا۔ چنانچہ (نتیجہ میں) ان پر ایسی جگہ سے عذاب آ گیا جہاں سے انہیں خیال بھی نہیں تھا۔ پس خدا نے انہیں دنیا کی زندگی میں (بھی) رسوائی (کے عذاب) کا مزہ چکھایا۔ اور آخرت کا عذاب تو بلاشبہ اس سے بہت بڑا ہوگا۔ کاش وہ (اس حقیقت کو) سمجھتے ہوں۔

حیاتِ اُخروی وہ آخرت کی زندگی جس میں تمام قومیں اپنے اپنے اعمالِ حیات کو ساتھ لئے نتائج کی منتظر ہوں گی جن کے اعمال نے ان میں ارتقائی منازل طے کر کے بلند و بالا زندگی بسر کرنے کی صلاحیت پیدا کر دی ہوگی وہ سفرِ زندگی کے اگلے درجہ میں پہنچا دیئے جائیں گے۔

فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَیُدْخِلُهُمْ رَبُّهُمْ فِیْ رَحْمَتِهٖ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْمُبِیْنُ ○ (۴۵/۳۰)

جو لوگ ایمان لے آئے اور نیک کام کئے تو ان کا پروردگار انہیں اپنی رحمت میں داخل فرما لے گا اور یہی کھلی ہوئی کامیابی ہے!

اور جنہوں نے قوانینِ الٰہیہ سے انکار و استکبار کی روش اختیار کی ہو گی وہ مجرمین کی صف میں ہوں گے۔

وَ اَمَّا الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ۫ اَفَلَمْ تَكُنْ اٰیٰتِیْ تُتْلٰى عَلَیْكُمْ فَاسْتَكْبَرْتُمْ وَ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّجْرِمِیْنَ ○ (۴۵/۳۱)

لیکن جن لوگوں نے انکار کی راہ اختیار کی ہوگی (ان سے جواب طلب کیا جائے گا اور کہا جائیگا) کیا تمہارے سامنے میرے قوانین پیش نہیں کئے گئے تھے، مگر تم نے (ان کے ساتھ) غرور اور تکبر کا برتاؤ کیا اور تم تھے ہی مجرم قوم (کے افراد)۔

اس وقت ہر ایک کی آنکھیں دیکھ لیں گی کہ کس طرح اللہ کی جبروت و کبریائی، اس کے قوانین کی ہمہ گیری، تمام کائنات پر چھائی ہوئی ہے۔

وَ لَهُ الْكِبْرِیَآءُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۪ وَ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ○ (۴۵/۳۷)۔

اور (یاد رکھو) آسمانوں اور زمین میں اسی کے لئے کبریائی ہے اور وہ بڑا ہی غالب اور حکمت والا ہے۔

تدبّر فی القرآن سے دُور نگہی

ہم نے یہ دیکھ لیا ہے کہ جس طرح عالم طبیعی PHYSICAL WORLD میں اٹل قوانینِ فطرت نافذ العمل ہیں اسی طرح انسانی حیاتِ اجتماعیہ کے متعلق بھی قوانینِ الٰہیہ جاری و ساری ہیں اور زندگی کا کوئی گوشہ اور کارگہ حیات کا کوئی شعبہ ان قوانین کی حدودِ ریاست سے باہر نہیں۔ قرآنِ کریم انہی احکام کا مکمل اور آخری ضابطہ ہے۔ قوانینِ فطرت پر گہری نگاہ رکھنے والا بیج سے پھل کا پتا دے سکتا ہے۔ وہ سیاروں کی رفتار دیکھ کر سو سال پہلے بتا سکتا ہے کہ سورج کو گہن کب اور کس وقت لگے گا۔ ایک حکیمِ حاذق، مریض کی نبض کو چھو کر اور بعض اوقات فقط اس کے

چہرے پر نگاہ ڈال کر اس کے مرض کے مآل و انجام کے متعلق صاف صاف بتا دیتا ہے. یہ سب اس لئے کہ فطرت کے قوانین اٹل ہیں. اٹل قوانین کے نتائج کے متعلق پہلے سے بتایا جا سکتا ہے. اس میں "علمِ غیب" کا کوئی دخل نہیں ہوتا ہے. اس کے لئے ان قوانین کے متعلق گہری نگاہ کی ضرورت ہے اور بس. یہی کیفیت انسانی حیاتِ اجتماعیہ کے قوانین کی ہے. جس شخص کی نگاہ ان قوانین پر ہو وہ کسی قوم کی موجودہ روش سے بتا سکتا ہے کہ اس قوم کا انجام کیا ہوگا. اور چونکہ یہ قوانین قرآن کے اندر منضبط ہیں، اس لئے جس دیدہ ور کی نگاہیں قرآنی حقائق کی گہرائیوں تک اُتر چکی ہوں اس میں ایسی فراست پیدا ہو جاتی ہے جس سے اس کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ

گلے را دیدہ احوالِ چمن گفت

اسی فراست کا نتیجہ ہے کہ دہ عین اس وقت جبکہ ساری دنیا کسی نظامِ تہذیب و تمدن کی تعریف و ستائش میں قصیدہ خواں ہو. اس کی چمک دمک سے بڑے بڑے دیدہ وروں کی نگاہوں میں خیرگی پیدا ہو رہی ہو عظیم الشان دانایانِ روزگار اسے تمام انسانی مصائب و نوائب کے لئے مسیحا تصور کر رہے ہوں. چھوٹے بڑے اس نسخۂ کیمیا کی برکات کے معترف ہوں. دنیا بھر کی قومیں اس تہذیبِ نو کی نقالی میں فخر و سعادت محسوس کر رہی ہوں. غرضیکہ انسان یہ سمجھ رہا ہو کہ اس نے اس فردوسِ گم گشتہ کو پا لیا جس کی تلاش میں اس نے ساری عمر دشت پیمائیوں اور صحرا نوردیوں میں گذاری تھی. وہ مردِ مومن جس کی نگاہوں میں بصیرتِ قرآنی کی روشنی جلوہ بار ہو، پورے حتم و یقین کے ساتھ پکار اٹھتا ہے اور اس تہذیبِ جدید کے جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری سے فریب کھانے والوں سے للکار کر کہہ دیتا ہے کہ

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

اس میں کسی کشف و کرامت کا دخل نہیں. یہ علمِ غیب نہیں. یہ الہام نہیں. یہ نتیجہ ہے قرآنی حقائق پر غور و تدبّر کا، قرآنی معارف پر ایمان و ایقان کا. جس طرح ایک طبیبِ حاذق کی نگہ ژرف بیں بھانپ لیتی ہے کہ فلاں شخص کے چہرہ کی سُرخی، خونِ صالح کا نتیجہ ہے یا سنکھیا کا اثر، اسی طرح ایک حکیمِ مومن کی دیدہ وری دیکھ لیتی ہے کہ فلاں قوم کے نظامِ تمدن کی چمک دمک، ہیرے کی تابناکی ہے یا کانچ کی نگاہ فریبی. قرآن ہی نور عطا کرتا ہے جس سے انسان حق و باطل میں تمیز کر لیتا ہے اور معرکہ حیات میں بلا خوف و خطر بڑھے چلا جاتا ہے.

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ وَ يَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۙ (۵۷/۲۸)

اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! خدا کا تقویٰ حاصل کرو اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ۔ خدا تمہیں اپنی رحمت سے دوہرا حصّہ دے گا اور تمہارے لئے ایک نور پیدا کر دے گا جس (کی روشنی) میں تم دنیا میں دیدہ وروں کی طرح چل سکو گے۔ وہ تمہیں تمام خطرات سے محفوظ رکھیگا۔ وہ غفور و رحیم ہے۔

خود تخریبی

آگے بڑھنے سے بیشتر تہذیبِ حاضرہ کی خودکشی کے متذکرہ صدر "خواب" پر ایک بار پھر نگاہ ڈالئے اور اس کے بعد دیکھئے کہ آج لالہ زارانِ مغرب میں اس خواب کی تعبیر کس طرح تڑپتی پھڑکتی انسانیت کی صورت میں محسوس و مشہود دکھائی دے رہی ہے۔ دیکھئے اور غور کیجئے کہ اس تہذیبِ نَو کا قصرِ مشید کس طرح خود اپنے بوجھ سے نیچے گرا ہے اور اس گرنے میں کس طرح اس کی اینٹ سے اینٹ بج رہی ہے۔ یہ تخریب و انہدام کسی خارجی اسباب و ذرائع سے ظہور پذیر نہیں ہو رہا بلکہ اس حقیقتِ ثابتہ کی گواہی دے رہا ہے کہ اس کی تعمیر میں خود تخریب مضمر تھی۔ اور صرف ایک تہذیبِ حاضرہ ہی پر کیا موقوف ہے، ہر وہ تہذیب جس کی بنیادیں غیر فطری خطوط پر تھیں، اس کا یہی انجام ہوا۔ تاریخِ انسانی پر نگاہ ڈالئے تو وہ اسی تعمیر و تخریب کی مسلسل داستاں نظر آئے گی۔ قرآنِ کریم نے اس عظیم الشان حقیقت کو ایک نہایت لطیف استعارہ کی صورت میں بیان فرمایا ہے جہاں ارشاد ہوا ہے کہ

وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِيْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا ؕ (۱۶/۹۲)

اور دیکھو تمہاری مثال اس عورت کی سی نہ ہو جائے جس نے بڑی محنت سے سوت کاتا اور خود ہی اسے توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

ایک عجیب حقیقت

قرآنِ کریم کی اس چھوٹی سی مثال کو سامنے رکھئے اور پھر تاریخ کے اوراق پر غور کر کے دیکھئے کہ عبرت و موعظت کی کتنی داستانیں ہیں جو اس کے اندر لپٹی ہوئی ہیں اور انسانی نامرادیوں اور ناکامیوں کے کتنے وقائع و حوادث ہیں جو اس میں پوشیدہ ہیں۔ ہر دور

رہا ہے۔

کیا یہ انسانیت کا خاتمہ ہے؟

تو سوال یہ ہے کہ کیا اب نوعِ انسانی کا خاتمہ ہونے والا ہے یا اس درد و کرب کے بعد دنیا کو ایک نئی زندگی (النشاۃِ ثانیہ) ملنے والی ہے! کیا یہ کشت و خون اور سلب و نہب سکراتِ موت کی ہچکیاں ہیں یا ایک عملِ جراحی ہے جس سے فاسد مادوں کے استیصال کے بعد انسانیت کی رگوں میں صالح خون دوڑایا جائے گا؟ اس سوال کا جواب دنیا اپنی اپنی عقل سے کچھ ہی دے، لیکن جس کی نگاہ قرآن پر ہے وہ پورے حتم و یقین کے ساتھ کہہ دے گا کہ یہ انسانیت کا خاتمہ نہیں بلکہ ایک اور قدم اٹھ رہا ہے اس منزل کی طرف جو تمدنِ انسانیت کی معراج ہے۔ قرآن کا اعلان ہے کہ خدائی نظام کو دنیا میں بھیجا اس لئے گیا ہے کہ وہ تمام انسانی نظامہائے زندگی پر غالب آ کر رہے (لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ[۹/۱]) سو جب تک اس نظامِ خداوندی کا غلبہ نہیں ہوگا کتابِ کائنات کا یہ باب ختم نہیں ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کائنات اور اس کے مادی ارتقاء کی آخری کڑی (انسان) اس لئے نہیں بنائی گئی کہ انسانیت تجربہ کرتے کرتے ختم ہی ہو جائے۔ ہر تجربہ انسان کو اپنے بنائے نظام کی خرابیوں سے آگاہ کر کے اس سے اعلیٰ نظام کی طرف دعوت دیتا ہے۔ اور انسانیت کی تکمیل ہو نہیں سکتی جب تک وہ اعلیٰ و ارفع نظامِ انسانی زندگی پر مسلط نہیں ہو جاتا۔ اس نظام کے تابع انسانیت وہ ارتقائی منازل طے کرے گی جس کے بعد وہ اس دنیا کی زندگی سے اگلی زندگی (حیاتِ اُخروی) کما حقہٗ بسر کرنے کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کرے گی۔ اس وقت یہ باب الٹ دیا جائے گا، اس سے پہلے نہیں۔ قرآن کریم نے اپنے مخصوص انداز میں اس حقیقتِ کبریٰ کی طرف اشارہ کیا ہے جب فرمایا۔

وَالْعَصْرِ ۙ إِنَّ الْإِنسَانَ لَفِي خُسْرٍ ۙ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ[۱۰۳]

زمانہ اس پر شاہد ہے کہ انسان یقیناً ناکام رہنے والا ہے، مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے اعمالِ صالح کئے اور وہ ایک دوسرے کو حق اور استقامت کی تلقین کرتے رہے ہیں۔

زمانہ شاہد ہے کہ انسان نے جو نظام بھی خود وضع کیا اس کا انجام ناکامیوں اور نامرادیوں کے تلخ تجارب کے سوا کچھ نہ ہوا۔ تو سوال پیدا ہوا کہ کامیابی اور کامرانی کی کوئی صورت بھی ہے؟ جواب ملا کہ یقیناً ہے اور وہ صورت یہ ہے کہ وہ نظامِ زندگی نافذ ہو جس کی بنیادیں ایمان پر مستحکم ہوں اور جس کی تعمیر اعمالِ صالحہ اور حق و استقامت

کی باہمی تلفیق کے اجزاء پر مشتمل ہو. یہاں پہنچ کر انسان کی ناکامیاں کامیابیوں میں اور نامرادیاں بہرہ مندیوں میں بدل جائیں گی یہ نظام قائم ہو کر رہے گا۔ اس لئے کہ قرآن کو دنیا میں اسی غرض کے لئے محفوظ رکھا گیا ہے اس نظام کے علیٰ وجہ البصیرت تمام نظامہائے انسانی پر غالب آنے کے لئے تجرباتی طریق یہ ہے کہ انسان ایک ایک نظام کو اپنے ہاتھوں سے بنائے اور خود ہی ڈھائے۔ دن بھر سوت کاتے اور شام کو خود ہی بکھیر دے. جب انسان خود آزما کر دیکھ لے گا کہ فی الواقع (اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ) تنہا عقلِ انسانی ناکامیوں کی طرف ہی لے جانے والی ہے تو اس وقت وہ اِلَّا کی طرف آئے گا. جیسا کہ ہم "ابلیس و آدم" میں وحی کے عنوان میں بہ تفصیل لکھ چکے ہیں، انسانیت آگ اور خون کا بپتسمہ لے کر ہر بار بہ رنگ نو اُبھرتی ہے اور دیکھنے والی آنکھیں دیکھتی ہیں کہ اس اُبھار کا رُخ ان قوانینِ خداوندی کی طرف ہوتا ہے جو قرآنِ کریم کی دفتین میں محفوظ ہیں اور جو تکمیلِ شرفِ انسانیت کے لئے واحد اور مکمل ضابطہ حیات ہیں. آج بھی دنیا اس ورطۂ لَا سے اِلَّا کی طرف آنے کے لئے مضطرب و بے قرار ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ یہ سعادت کس جماعت کے حصہ میں آتی ہے کہ وہ دنیا کو اس جہنم سے کھینچ کر نجات و سعادت کی طرف لے جائے۔ پہلے خود اِلَّا کا پیکر بنے اور اس کے بعد ساری دنیا کو اس قالب میں ڈھال لے۔

آوازۂ حق اٹھتا ہے کب اور کدھر سے
مسکیں دلکم ماندہ دریں کشمکش اندر

اُمم سابقہ کے تجربات و کیفیات کا عبرت آموز منظر دیکھتے دیکھتے ہم خود اپنے احوال و ظروف میں گم ہو گئے لیکن چونکہ ان کی تفاصیل کا ابھی وقت نہیں اس لئے ہم رُکتے ہیں تاکہ اتنی مسافت سے جو نقوش ہمارے آئینۂ قلب پر مرتسم ہوئے ہیں وہ اچھی طرح ثبت ہو جائیں تو پھر آگے بڑھیں. بہر حال یہ تھیں اُمم سابقہ کی وہ وادیاں جن سے وہ کاروانِ رشد و ہدایت گزرا جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ ان اُمم و اقوام سے ہمارا اتنا ہی واسطہ ہے کہ ان کے احوال و کوائف سے ہم عبرت حاصل کریں اور دیکھیں کہ جنہوں نے اپنی روشِ زندگی آسمانی نظام کے تابع رکھی ان کا انجام کس قدر حسین و شاداب تھا اور جنہوں نے قوانینِ انسانی کو خضرِ راہ بنایا ان پر ہلاکت و تباہی کا رسوا کن عذاب کس طرح مسلط ہوا. ہمارا ان سے اتنا ہی واسطہ ہے. ورنہ نہ تو مٹنے والی قوموں کے اعمال کا وبال ہم پر پڑ سکتا ہے اور نہ ہمارے اسلاف کا دورِ عروج و سطوت ہمارے لئے

وجہ سرفرازی ہو سکتا ہے۔ انہیں جو کچھ ملا ان کے اعمال کی بدولت ملا۔ ہمیں جو کچھ ملے گا ہمارے اعمال کی بدولت ملے گا۔

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۖ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُم مَّا كَسَبْتُمْ ۖ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۲/۱۴۱﴾

یاد رکھو! یہ ایک قوم تھی جو اپنے وقت پر دنیا سے چلی گئی۔ اس کے لئے وہ تھا جو اس نے اپنے عمل سے کمایا۔ تمہارے لئے وہ ہوگا جو تم اپنے عمل سے کماؤ گے۔ تم سے کچھ اس کی پوچھ گچھ نہیں ہوگی کہ ان کے اعمال کیسے تھے۔

حضراتِ انبیائے کرامؑ کا تذکارِ جلیلہ جس کی ابتدا حضرت نوحؑ سے ہوئی تھی، جوئے نور، برقِ طور، اور زیرِ نظر مجلہ میں حضرت عیسیٰؑ تک پہنچ گیا۔ اب اس کے بعد اس ذاتِ گرامی کا اُسوۂ حسنہ وجۂ تازگی نظر ہوگا جس پر اس سلسلۂ (نبوت) کا اختتام ہوگا۔ اس کے لئے اس سلسلہ کی اگلی کڑی (معراجِ انسانیت) ملاحظہ فرمائیے۔ اس سے اس آسمانی دعوت کی مکمل تاریخ آپ کے سامنے آجائے گی۔

والسلام

عبد الجبار